آغا ناصر

گمشدہ لوگ

آغا ناصر

سنگِ میل پبلی کیشنز ○ لاہور

امّی کے نام جن کی یاد

کسی طرح دل سے فراموش نہیں ہوتی
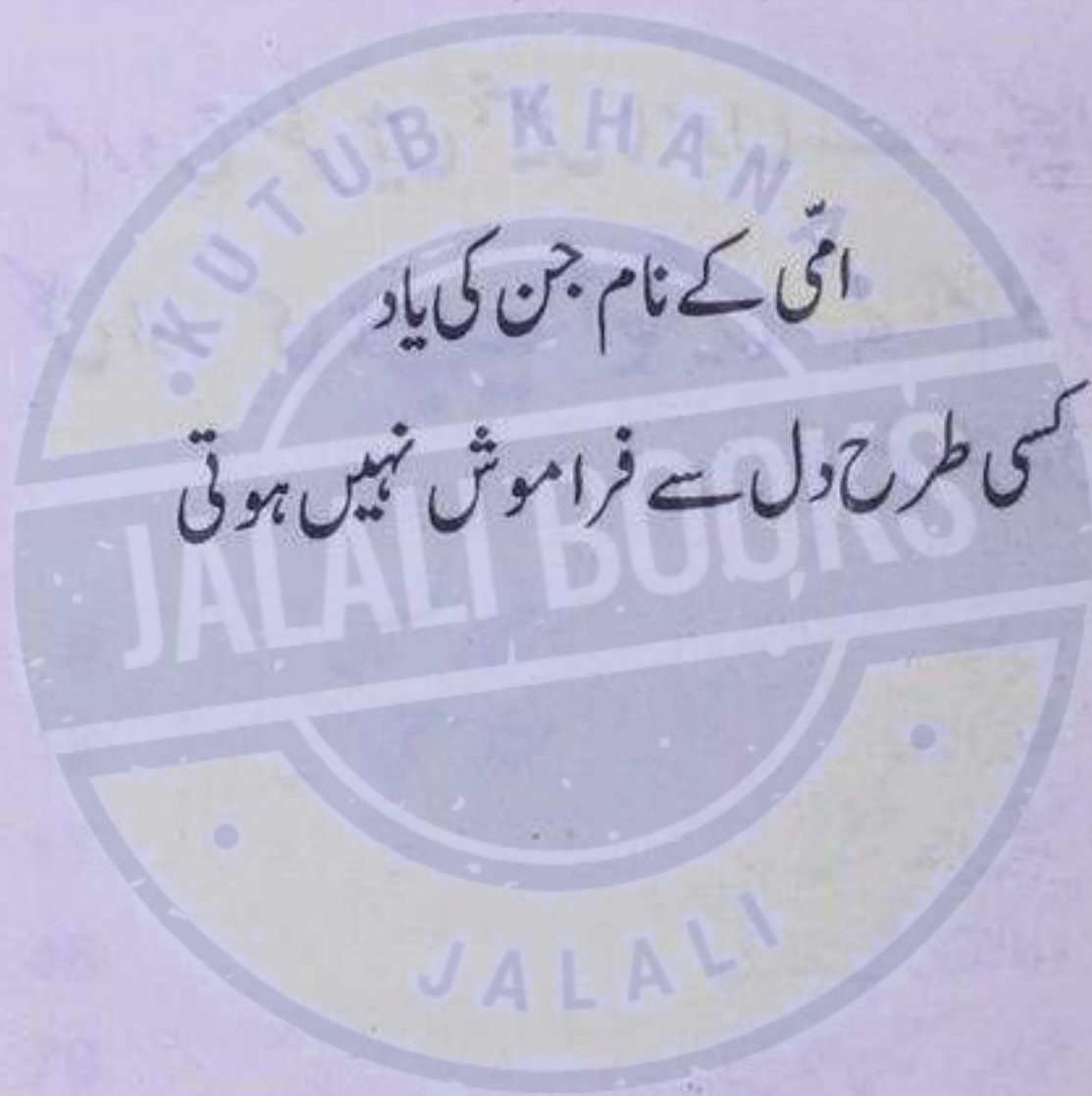
ہم روحِ سفر ہیں ہمیں ناموں سے نہ پہچان
کل اور کسی نام سے آجائیں گے ہم لوگ

(رضی اختر شوق)

ترتیب

۱	دیباچہ	انتظار حسین	9
۲	ٹھنڈا میٹھا	ممتاز مفتی	12
۳	فیض احمد فیض		17
۴	ذوالفقار علی بخاری		46
۵	خواجہ معین الدین		79
۶	صاد قین		96
۷	مصلح الدین		117
۸	سلیم احمد		139
۹	ریاض فرشوری		160
۱۰	اطہر علی		185
۱۱	غفاری بیگم		210

وہ جو ہم تم میں نہیں

موت برحق ہے۔ جو اس دنیا میں آتا ہے ایک دن اسے واپس بھی جانا ہے۔ شیکسپیئر نے دنیا کو ایک اسٹیج سے تشبیہ دی تھی جس پر انسان بحیثیت اداکار اپنے اپنے کردار ادا کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ موت اور زندگی ایسے موضوعات ہیں جو صدیوں سے شاعروں' ادیبوں' ڈرامہ نگاروں' فلسفیوں' سائنس دانوں' دینی رہنماؤں اور دانشوروں کی فکر کا محور ہیں۔ ان موضوعات پر ہر دور' ہر ملک' ہر زبان میں لاتعداد کتابیں لکھی گئیں۔ شاعروں نے اپنے لفظوں سے' اور گلوکاروں نے اپنی آواز سے زندگی اور موت کے ان گنت گیت سنائے۔ عظیم ڈرامہ نگاروں اور کہانی نویسوں نے نت نئی داستانیں اور قصے لکھے اور مذہبی پیشواؤں اور فلسفیوں نے موت وحیات کے موضوع پر مختلف نظریات اور توجیحات پیش کیں۔ مگر ان ساری کاوشوں' ساری تحقیقات' سارے تجربات کے باوجود کسی ایک منزل یا ایک نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے۔ ہم تو مختار صدیقی کی زبان میں صرف اتنا جانتے ہیں

وہ جو ہم تم میں نہیں خاک میں پنہاں ہوں گے

دنیا میں ہر روز جانے کتنی زندگیاں وجود پاتی ہیں اور نہ جانے کتنے زندہ لوگ موت سے ہم آغوش ہو جاتے ہیں۔ ان میں بچے بھی ہوتے ہیں' بوڑھے بھی' عورتیں بھی' مرد بھی' امیر بھی' غریب بھی' ظالم بھی' مظلوم بھی' عالم بھی' جاہل بھی' نامور بھی اور گمنام بھی۔ مگر وہ جو کچھ بھی ہوتے ہیں صرف اس دنیا کے حوالے سے ہوتے ہیں۔ جب سانس کی ڈوری ٹوٹتی ہے تو دنیا سے یہ سارے رشتے بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔ بوڑھا بچہ' مرد عورت' ظالم مظلوم' امیر غریب' عالم جاہل اور نامور گمنام سارے فرق مٹ جاتے ہیں۔ صرف یادیں رہ جاتی ہیں وہ بھی بہت عارضی وقت کے لیے۔ جانے والے جو خلا چھوڑ جاتے ہیں وقت اسے دیر بدیر پر کر دیتا ہے۔

دائم آباد رہے گی دنیا　　　ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہو گا

بس اس زندگی اور اس دنیا میں انسان کی صرف اتنی ہی اہمیت ہے۔ وہ بھی جنہیں مقبولیت اور شہرت حاصل رہی اور وہ بھی جن کے لیے مجید امجد نے کہا۔

میں روز ادھر سے گزرتا ہوں کون دیکھتا ہے
میں جب ادھر سے نہ گزروں گا کون دیکھے گا

یہ سب کچھ اسی طرح ہے۔ چاہنے کے باوجود انسان کچھ نہیں کر سکتا۔ زیست و مرگ کے اسی فلسفہ کو شاعر نے کیسے آسان لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔

لائی حیات' آئی قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

لیکن میرے نزدیک بات صرف یوں نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اوپر جو کچھ کہا گیا وہی سچ ہے اور ایسے ہی ہوتا آیا ہے ایسے ہی ہوتا رہے گا۔ مگر زندگی میں ملنے اور بچھڑنے والے سارے لوگوں کو ایک جیسا سمجھنا بھی اتنا صحیح نہیں ہے۔

انسان مر جاتے ہیں اور ہمیشہ کے لیے بچھڑ جاتے ہیں لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے لیے دل یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوتا' یوں لگتا ہے کہ وہ ہم سے دائمی طور پر جدا نہیں ہوئے۔ بس زندگی کی بھیڑ میں کہیں کھو گئے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں ایسے لوگوں کی اپنی شخصیت اتنی جاندار ہوتی ہے یا اس شخص کی محبت جو ایسا سمجھ رہا ہے۔

بہر حال جو بھی ہو میری زندگی میں چند ایسے ساتھی' دوست اور بزرگ ہیں جو لگتا ہے دنیا کے جھمیلوں میں کہیں گم ہو گئے ہیں۔ یہ گمشدہ لوگ ہی اس کتاب کی تحریروں کا موضوع ہیں۔ ان تحریروں کو ادب کی کس صنف میں شامل کیا جانا چاہیے اس کا فیصلہ میں قارئین پر چھوڑتا ہوں۔ یہ شخصی خاکے ہیں یا فکائیہ مضامین ہیں۔ یا کچھ اور میرے نزدیک تو یہ تحریریں صرف میرے احساسات اور تاثرات کے اظہار کا ذریعہ ہیں ایسے گمشدہ لوگوں کے بارے میں جو زندگی میں میرے محبوب رہے۔

آغا ناصر

اسلام آباد۔ دسمبر 1999ء

دیباچہ

ادیب اور آرٹسٹ کا ترقی کرنا کوئی خوش آئند بات نہیں ہے۔ دوسرے بے شک ترقی کریں مگر ادیب ہو یا آرٹسٹ' اس کے ساتھ دقت یہ ہے کہ پیشہ میں اس کی ہر ترقی اور دنیا میں اس کی ہر کامیابی اس کی تنزلی کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ آغا ناصر اس کی ایک مثال ہے۔ خیر میں نے تو انہیں پہلی بار اس وقت دیکھا اور جانا جب وہ پی ٹی وی کے ابتدائی دور میں ڈرامہ پروڈیوسر کے طور پر نمایاں ہوئے تھے۔ وہیں سے میں ان کا قائل ہوا مگر اس سے پہلے وہ کئی زقندیں لگا چکے تھے۔ افسانہ نگاری کی حیثیت سے شروع ہوئے تھے۔ پھر ڈرامے سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ سو ڈرامے لکھے۔ بس اسی زور پر ریڈیو پاکستان میں انہیں ملازمت مل گئی مگر ملازمت ملتے ہی ان کا یہ زور ختم ہو گیا۔ افسانہ تو گیا ہی تھا' ڈرامہ نگاری بھی پس منظر میں چلی گئی۔ اب وہ ڈرامہ پروڈیوسر کی حیثیت سے نام پیدا کر رہے تھے۔ اس زور پر انہوں نے یہاں سے بھی زقند لگائی اور ٹی وی میں آ گئے۔ ٹی وی میں ان کا یہ ہنر خوب چمکا۔ اپنے فن میں بہت ماہر نظر آتے تھے لیکن پھر ان کی ترقی ہو گئی۔ اس ترقی کا کیا مطلب تھا۔ یہی کہ ڈرامہ نگاری ڈرامہ پروڈیوسری دونوں کو سلام۔ کرسی پر افسر بن کے بیٹھ گئے اور ٹی وی کے انتظامی معاملات سے نپٹنے لگے۔ یعنی ایک سطح پر ترقی' دوسری سطح پر تنزلی۔

پھر ایک لمبے عرصے تک ہم آغا ناصر کو ٹی وی کے ایک افسر اعلیٰ کے طور پر دیکھتے اور جانتے رہے مگر اب پچھلے تھوڑے عرصے سے انہوں نے پھر ایک پھریری لی۔ جیسے افسری کرتے کرتے جی بھر گیا ہو۔ کتنے زمانے بعد پھر انہوں نے قلم سنبھال لیا مگر اب کے وہ کسی اور ہی راہ پر چل پڑے۔ ابتدائے عمر سے اب تک جن لوگوں کو دیکھا' برتا اور جانا' انہیں بیان کرنا شروع کر دیا۔ مگر کمال بیان ہے' اب تو مجھے یہ لگ رہا ہے کہ ان کی ڈرامہ نگاری' ڈرامہ پروڈسری سب اپنی جگہ مگر ان کا اصلی جوہر اب یہاں آ کر ظاہر ہوا ہے۔ شخصیت کو بیان

کرنے کا عجب ڈھب نکالا ہے۔ بیان سیدھے سچے انداز میں شروع ہوتا ہے۔ کچھ باہمی تعلقات کا واقعاتی انداز میں ذکر' کچھ روزمرہ کی باتیں' کچھ دفتری ذکر اذکار مگر اسی عمل میں رفتہ رفتہ ایسا سماں بندھ جاتا ہے کہ آدمی جیتا جاگتا سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ذرا ذوالفقار علی بخاری کا تذکرہ پڑھئے۔ کیا نقشہ باندھا ہے کہ آدمی کے ساتھ زمانہ بھی کھنچا چلا آیا ہے۔ پاکستان کے ابتدائی ایام۔ نئے سرے سے آباد ہوتا کراچی شہر۔ اس کے بیچ ریڈیو اسٹیشن' عدم سے وجود میں آتا ہوا ایک ادارہ اور اس کے بیچ ایک شخص ذوالفقار علی بخاری جو اپنی ذات میں ایک ادارہ نظر آتا ہے۔ اس کا طنطنہ' اس کا ٹھسا عروج اور پھر زوال۔ اس تذکرہ کو پڑھئے اور پورے آدمی کو جان لیجئے بلکہ آنکھوں سے دیکھ لیجئے۔

بیان کے اس ہنر نے اس تذکرے میں جان ڈال دی ہے۔ یوں یہاں سب وہ شخصیات بیان ہوئیں ہیں جو اللہ کو پیاری ہو چکی ہیں مگر ان تذکروں میں جگہ پا کر دوبارہ زندہ ہوتی نظر آتی ہیں۔ کیا جیتے جاگتے لوگ تھے اور کتنے نرالے تھے۔ گئے تو ایک پورے عہد کو اپنے ساتھ لے گئے اور اب آغا ناصر نے انہیں اپنے حافظہ کی مدد سے اور قلم کے جادو سے واپس بلایا ہے تو وہ پورا زمانہ بھی زندہ ہوتا نظر آتا ہے۔ آغا ناصر کا بیان کا طریقہ ہی یہ ہے کہ آدمی کو اپنے ارد گرد کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اس ارد گرد کو بیان کرتے ہوئے انہوں نے دو چیزوں کو بھی اگرچہ ضمنی طور پر بیان کیا مگر اس طرح بیان کیا کہ وہ بھی اس تذکرے کے دو اہم کردار نظر آتے ہیں۔ ایک شروع زمانے کا کراچی ریڈیو اسٹیشن اور دوسرے اسی زمانے کا شہر کراچی اور ہر چند کہ انہوں نے ایک لمبا وقت پاکستان ٹیلی ویژن کے ساتھ بسر کیا اور ترقی کے مراحل اسی ادارے میں رہ کر طے کیے ہیں مگر لگتا یہ ہے کہ جس ادارے نے ان کے دل و دماغ میں جگہ بنائی' وہ کراچی ریڈیو اسٹیشن ہے۔ ویسے اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ پاکستان ٹی وی تو وجود میں آتے ہی کمرشلزم کی راہ پر چل پڑا۔ وہ ادیبوں' دانشوروں کا مرجع کیسے بنتا اور وہ گہما گہمی جو آغا ناصر کو کراچی ریڈیو اسٹیشن پر نظر آئی تھی اور جس نے انہیں رجھایا تھا' وہ یہاں کیسے نظر آتی۔

اور ہاں شخصیات کے اس جھرمٹ میں ایک بالکل الگ قسم کی شخصیت نظر آتی ہے۔ غفاری بیگم' آغا ناصر کی والدہ۔ یہ شخصیت ایک الگ طرح کی تہذیب لے کر نمودار ہوتی ہے۔ سو یہاں بیان بھی الگ ذائقہ رکھتا ہے۔

اردو میں جو خاکے لکھے گئے ہیں، ان میں کچھ مائیں بھی نظر آتی ہیں۔ ان مشہور ماؤں میں ایک قدرت اللہ شہاب کی ماں جی ہیں۔ ان مشہور ماؤں میں اب ایک اور ماں جی کا اضافہ ہو گیا، اس ماں کا بیان بھی کچھ کم دلاویز نہیں اور مادرانہ شفقت یہاں بھی کم اثر انگیز نہیں۔

آغا ناصر نے انہیں تذکروں میں کہیں لکھا ہے کہ "میں نہیں جانتا ماضی کے ایام کے ڈھیر سے کون سے دن کا انتخاب کروں۔ کونسی بات سے آغاز کروں اور کونسی تصویر بناؤں۔" بہرحال انہوں نے ماضی کے ایام کے ڈھیر سے جن چند دنوں کا انتخاب کیا ہے اور جن چند چہروں کو چنا ہے اور جو چند تصویریں بنائی ہیں، وہ خوب ہیں۔ جس طرح بیان ہوئی ہیں، اس سے تو لگتا ہے کہ بس یہی چہرے اور یہی دن انتخاب کے مستحق تھے۔ شخصیت نگاری میں نظرِ انتخاب کی بھی تو اہمیت ہوتی ہے۔ زندگی میں آدمی کتنے لوگوں سے ملتا ہے، کتنے دوست، کتنے دشمن ہوتے ہیں۔ شخصیت نگار کے پاس ایک نظر ہوتی ہے جو اسے سمجھاتی ہے کہ کس شخصیت میں کتنے امکانات ہیں۔ کچھ دلاویزی شخصیت میں ہوتی ہے، کچھ اسے دلاویز بیان کرنے والے کا بیان بناتا ہے۔ یوں اچھے خاکے وجود میں آتے ہیں۔ میں نے انہیں اپنی رو میں خاکے کہہ دیا۔ آغا ناصر انہیں خاکے کہنے کے لیے تیار نظر نہیں آتے۔ "یہ شخصی خاکے ہیں یا فکاہیہ مضامین ہیں یا کچھ اور۔ میرے نزدیک تو یہ تحریریں صرف میرے احساسات اور تاثرات کے اظہار کا ذریعہ ہیں۔ ایسے گمشدہ لوگوں کے بارے میں جو میرے محبوب رہے۔"

خانہ بندی میں کیا رکھا ہے۔ ہمیں آم کھانے سے مطلب ہونا چاہیے نہ کہ پیڑ گننے سے۔ آم میٹھے ہونے چاہئیں اور تحریر خوب ہونی چاہیے، سو وہ ہے۔ گمشدہ لوگوں کو کیا خوب بیان کیا ہے کہ حاضر و ناظر کر دیا ہے۔ قاری کو یہاں اور کیا چاہیے۔ اس کے بعد آپ ان تحریروں کو جس نام سے بھی پکارنا چاہیں، پکاریں۔ بہرحال ان تحریروں کے ساتھ آغا ناصر اردو کے ممتاز شخصیت نگاروں کی صف میں شامل ہو گئے ہیں۔

انتظار حسین

ٹھنڈا میٹھا

ممتاز مفتی

کھانے پینے کے زاویے سے دیکھا جائے تو شخصیتیں تین قسم کی ہوتی ہیں۔ مرچیلی، میٹھی اور بے سوادی۔

مرچیلی ڈنک مارتی ہے۔ سوئی کی طرح چبھ جاتی ہے۔ نمائشی لشکارے مارتی ہے، توجہ طلب ہوتی ہے۔ میری اور دیکھو، میری بات سنو۔

میٹھی Passive ہوتی ہے۔ کرنے کا نہیں، سہنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ اندر جذبات کی بھیڑ لگی ہوتی ہے، زبان پر تالہ لگا ہوتا ہے۔ غصہ بھڑک کر نہیں آتا۔ بھٹیاری اندر چڑ چڑ دانے بھونتی رہتی ہے۔ چمک نہیں مارتی۔ مٹی کے دیئے کی طرح روشنی دیتی ہے۔ مدھم مدھم۔

بدقسمتی سے آغا ناصر کی شخصیت ٹھنڈی میٹھی ہے اور صاحبو! آج کل ٹھنڈی میٹھی کو کون پوچھتا ہے۔ ٹھنڈی میٹھی سے تو لوگ بیاہ کرنے سے بھی منکر ہیں۔ آج کل تو ڈنک چلتا ہے۔ ڈنک نہ ہو تو کم از کم بھڑ جیسی بھوں بھوں تو ہو۔

نقل ہے کہ مسجد میں وعظ ہو رہی تھی۔ مولوی صاحب تلقین کر رہے تھے کہ لوگو ڈنک نہ مارو، کاٹو نہیں۔ اتفاق سے مسجد میں ایک سانپ بھی موجود تھا۔ اس نے سچے دل سے کاٹنے سے توبہ کر لی۔ کچھ دنوں کے بعد مولوی صاحب جنگل میں جا رہے تھے، انہوں نے دیکھا کہ ایک چمکدار ریشمی رسی سر راہ پڑی ہے۔ قریب گئے تو دیکھا کہ رسی نہیں سانپ ہے۔

"ارے یہ حال تیرا کیسے ہوا؟" مولوی صاحب نے سانپ سے پوچھا۔

سانپ بولا۔ ”حضور کا وعظ سنا تھا۔ آپ نے فرمایا تھا کہ کاٹنا چھوڑ دو۔ سو میں نے چھوڑ دیا۔ اب لوگ مجھے رسی سمجھتے ہیں' بچے ٹھڈے مارتے ہیں' فٹ بال کھیلتے ہیں۔“

مولوی بولا۔ ”میں نے تو تجھے کاٹنے سے منع کیا تھا۔ یہ تو نہیں کہا تھا کہ پھنکارنا بھی چھوڑ دے۔“

آغا ناصر کی شخصیت میں نہ ڈنک ہے نہ پھنکار۔

شاید دبے ہوئے غصہ کی چڑچڑ ہو لیکن اس کی تصدیق تو صرف بیگم کر سکتی ہے اور ان کی بیگم تو بھید رکھنا جانتی ہیں' کھولنا نہیں۔

آغا ناصر سے میری پہلی ملاقات ہی گڑبڑ گھوٹالہ ہو گئی۔

میرے ایک دوست ہیں محمد عمر' ان کی طبیعت میں شدت کا یہ عالم ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر بات چیخ کر کہنے سے کام چل جاتا ہے تو دھیمی آواز میں کہنے کا فائدہ۔

عمر نے ایک دن مجھے فون کیا' کہنے لگے ”یار میرے گھر آجا۔ ابھی ابھی۔ فوراً۔“

میں نے پوچھا ”کس خوشی میں؟“

بولا ”میں تجھے اپنے ایک عزیز دوست سے ملانا چاہتا ہوں۔“

عمر کے گھر پہنچا تو دیکھا کہ ایک صاحب بیٹھے ہیں۔ چوڑا چکلا گورا چٹا چہرہ' آنکھ دیکھنے والی نہیں بلکہ دکھنے والی اور جاذب' نگاہ پی جانے والی اور چٹے سفید چہرے پر لہریں لیتی ہوئی سرخی' جھینپ کی سرخی۔

آغا ناصر نے بات کی تو مٹھاس کی اک پھوار اڑی۔ بھیگ ہی بھیگ۔ پھر ایک عجیب سی بات دیکھنے میں آئی۔

صاحبو! آپ سے کہہ دوں تو کیا حرج ہے کہ میں تہذیب سے خوفزدہ ہوں۔ خود کو میں کی بجائے ہم کہنے والوں سے ڈرتا ہوں۔ میری دانست میں آج کے دور کی سب سے بڑی مشکل ”میں“ ہے۔ جس کو دیکھو وہ گردن اکڑا کر میں میں کرتا پھرتا ہے۔ جو لوگ میں میں مزید ٹیں بھر کر خود کو ہم کہتے ہیں' ان سے ڈر لگنا قدرتی امر ہے لیکن آغا ناصر کی بات نرالی تھی۔ وہ خود کو ہم تو کہہ رہے تھے لیکن اس ہم کی ٹیں نہیں تھی۔ الٹا ان کا ہم تو میں سے بھی کمزور تھا لیکن یہ سب باتیں اس نیک آدمی پر عاید ہوتی ہیں جسے احساس ہو کہ میں نیک آدمی ہوں۔ قصور احساس کا ہے نیکی کا نہیں۔ آج کل تو نیکی چھپا کر رکھنے کی چیز ہوتی ہے' ظاہر نہ

ہونے پائے۔

یادِ حق دل میں رہے انداز رندانہ رہے

آغا ناصر کو پتہ ہی نہیں کہ وہ نیک آدمی ہے لیکن دقت یہ ہے کہ نیک آدمی دکھتا ہے، بھید کھل جاتا ہے۔

بنیادی طور پر آغا ایک تخلیق کار ہے، ادیب ہے۔ اس نے اپنے کیریئر کے آغاز ہی میں تحریر و تصنیف کے شغل کو اپنا لیا تھا۔ اس کی تحریروں میں جان تھی۔ لگتا تھا کہ پہنچنے والوں میں سے ہے۔ پھر بدقسمتی سے اس کی آنکھ بی بی ٹیلی ویژن سے لڑ گئی۔ بس کباڑا ہو گیا۔

"شوبز" والے جانتے ہیں کہ ٹیلی ویژن ایک محبوبہ ہے، جگت محبوبہ۔ اس کے دو رخ ہیں۔ باہر سے دیکھو تو گلیمر ہی گلیمر۔ اندر مشقت ہی مشقت۔ ایسی مشقت جو تخلیق کی صلاحیتیں سلب کر لیتی ہے۔

بے شک ٹیلی ویژن شہرت دیتی ہے لیکن صرف باہر کے لوگوں کو اندر بلیک آؤٹ ہی رہتا ہے۔

ٹیلی ویژن چلانے کے لیے ذہن اور سوچ والے افراد کو چنا جاتا ہے۔ پھر حکم ہوتا ہے کہ خبردار اپنی عقل کو کام میں نہ لانا۔ جی حضوریے بن کر کام کرنا۔

دراصل ہم سمجھتے ہیں کہ ٹی وی اظہار کا میڈیا ہے۔ بہت کم لوگ اس بھید سے واقف ہیں کہ ٹیلی ویژن دودھ دینے والی بھینس ہے اور جو بھی لاٹھی والا آتا ہے، اسے ہانک کر لے جاتا ہے۔ پھر یہ کہ ٹیلی ویژن ایک ایسا ادارہ ہے جس پر ہر ایک کی نظر ہے۔ سیانے کہتے ہیں نظروں پر نہ چڑھو۔ دلوں سے اتر جاؤ گے۔ بھانت بھانت کی بولیاں سہنی پڑیں گی، سننی پڑیں گی۔ رہی شہرت کی بات تو جناب والا ٹی وی شہرت کی قندیل نہیں جلاتی، وہ بھانبڑ لگانا جانتی ہے۔ بھانبھڑ کی خصلت ہے بھڑ بھڑ جلتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے راکھ کا ڈھیر بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس شہرت تو مٹی کی ہانڈی میں دھیمی دھیمی آنچ پر پکتی ہے۔ سہج پکے سو میٹھا ہو۔ میرے چند ایک دوستوں نے ٹی وی پر بھانبڑ لگایا اور اب راکھ کے ڈھیر پر بیٹھے ماضی کی یاد میں آہیں بھر رہے ہیں۔

ٹیلی ویژن کا گلیمر آغا کو بہت مہنگا پڑا۔ ایک تو ان کی تخلیقی صلاحیتیں جہاں دھری تھیں، دھری رہیں زنگ آلود ہو گئیں۔ دوسرے انہیں قیام سے محروم کر دیا گیا۔ ساری عمر

ٹی وی کی گلی کے پھیرے لگاتے گزر گئی۔ آئے گئے' آئے گئے۔

آغا ناصر کو قریب سے دیکھنے کا موقع مجھے سلسلے کی وجہ سے ملا۔ سلسلہ بڑے افسروں کی ایک ادبی تنظیم تھی۔ قدرت اللہ شہاب مجھے سلسلے کی ایک محفل میں مہمان کی حیثیت سے لے کر گئے تھے۔ ادا جعفری نے پتہ نہیں کیوں مجھے رکنیت سے نواز دیا۔ یوں راج ہنسوں کی محفل میں ایک کوا جا بیٹھا۔

سلسلے میں جمیل نشتر تھے' مختار سعود تھے' مسعود مفتی تھے' نورالحسن جعفری تھے' آغا ناصر تھے' قدرت اللہ شہاب اور بیگمات تھیں۔ بڑے عہدیداروں اور اصحاب اقتدار کا جو ادب سے ناطہ ہے' اس کے بارے میں میں خوشگوار رائے نہیں رکھتا' معافی چاہتا ہوں۔ میری دانست میں ادب بڑے لوگوں کے لیے ایک بناوٹ سجاوٹ کی چیز ہے۔ جس طرح پاکستانی کلچر کو ڈرائنگ روم میں سجاتے ہیں' اسی طرح وہ اپنے شلفوں کو ادبی کتابوں سے ڈیکوریٹ کرتے ہیں۔

وہ ادب میں Participate نہیں کرتے صرف Apperciate کرتے ہیں اور اس Appreciation میں Participation کی جھلک واضح ہوتی ہے۔ اچھا۔ بہت اچھا۔ شاباشے۔ تالی بجاؤ۔

میرا خیال تھا کہ سلسلے میں ایسا ہی منظر دیکھنے میں آئے گا لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ سلسلے کے ارکان افسری کا چغہ اتار کر محفل میں آتے تھے۔ اس لیے قریب سے دیکھنے کے مواقع موجود تھے۔ صرف دیکھنے والی آنکھ کی شرط تھی۔

آغا کو قریب سے دیکھا تو پتہ چلا کہ اندر سراسر کامی ہے لیکن اس کامی نے اپنی تمام تر صلاحیتیں پروفیشن کے قدموں میں بھینٹ کر رکھی ہیں۔

اور قریب سے دیکھا تو پتہ چلا کہ ادبی صلاحیتیں زنگ آلود نہیں' صرف گرد آلود ہوئی ہیں۔

سلسلے میں تین سال کے دوران میں ارکان کے دباؤ اور واہ واہ کے زیر اثر آغا نے چار چھ ایسے افسانے تخلیق کیے کہ ایک منجھا ہوا کہانی کار سامنے آکھڑا ہوا۔

بے شک آغا میں ایک منجھا ہوا افسانہ نگار موجود ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ باہر آنے سے گھبراتا ہے' کتراتا ہے۔ اتنی یقین دہانیوں کے باوجود اسے ابھی تک یقین نہیں آیا کہ وہ

ایک منجھاہوا افسانہ نویس ہے۔

مجھے یقین تھا کہ اب کی بار آغا افسانوں کا مجموعہ پیش کریں گے لیکن ٹی وی کی لگن ادب کی طرف آنے بھی دے۔

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

کیا تماشا ہے کہ ہاتھ میں لڈو موجود ہے' پھر بھی کھانے پر مصر ہیں۔ جناب والا ادب میں خود اعتمادی سے متعلق آغا کی کیفیت ایسی ہی ہے جیسے مہاراج کی تھی۔

مہاراج کہیں جانے کے لیے محل سے باہر نکلے۔

دفعتاً انہیں خیال آیا کہ پگڑی تو سر پر رکھی ہی نہیں۔

خادموں کو حکم دیا کہ جاؤ محل سے ہماری پگڑی ڈھونڈ لاؤ۔

خادموں نے سارا محل چھان مارا' پگڑی نہ ملی۔

پھر اتفاقاً ایک خادم کی مہاراج کے سر پر نظر پڑی تو وہ بولا۔

"مہاراج پگڑی تو آپ کے سر پر ہے۔"

مہاراج بولے۔ "اچھا کیا کہ ہمیں بتا دیا ورنہ ہم ننگے سر ہی وہاں پہنچ جاتے۔"

تو جناب والا! آغا کو ایسے ساتھی کی ضرورت لاحق ہے جو اسے یاد دلاتا رہے کہ بھئی پگڑی تو تیرے سر پر ہے۔

فیض احمد فیض اور صادقین کے ساتھ
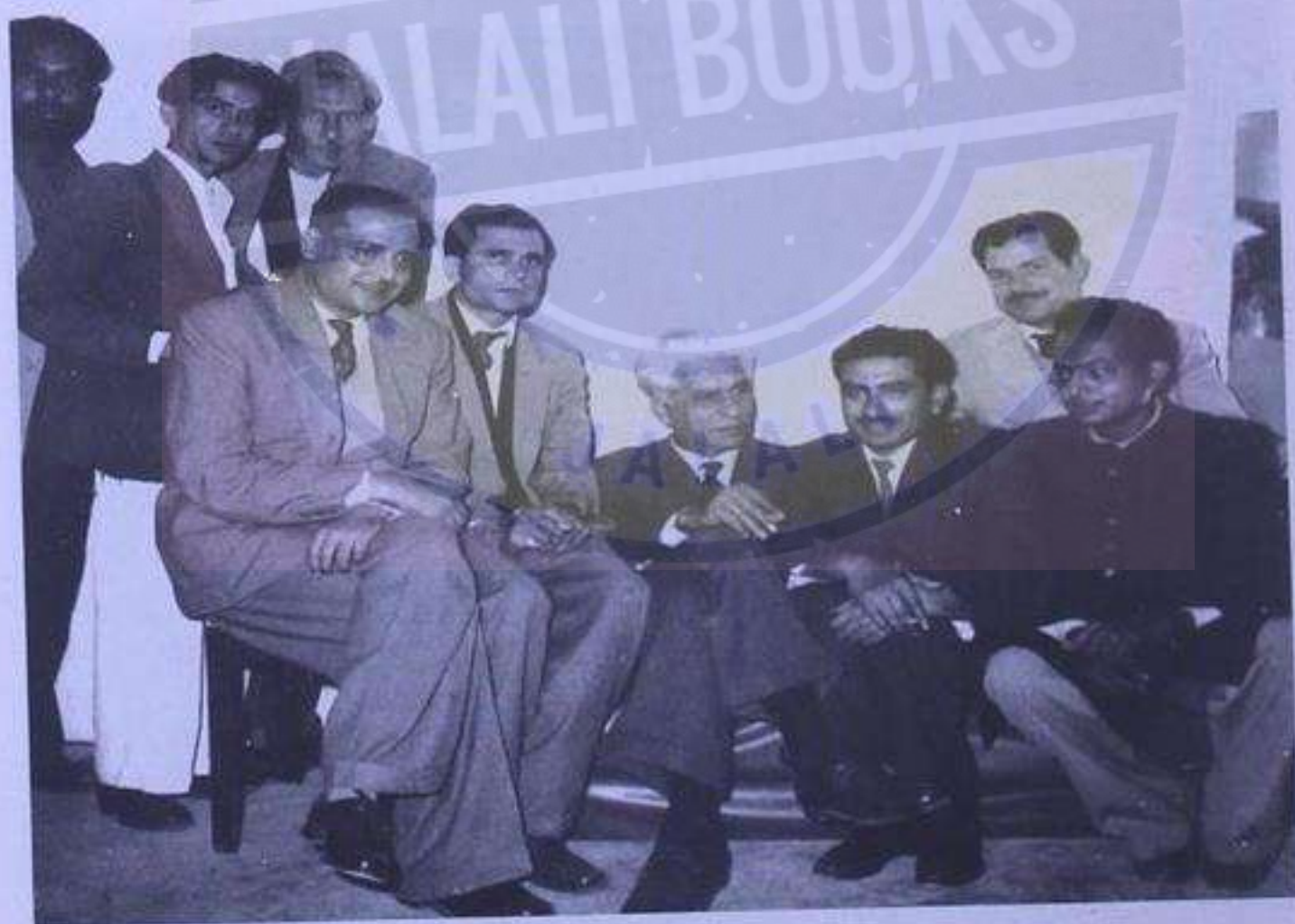
ذوالفقار علی بخاری کے ساتھ۔ تصویر میں خالد لطیف اور
سید ناصر جہاں بھی دائیں اور بائیں جانب بیٹھے ہیں۔

سلیم احمد کے ساتھ۔ بائیں جانب اسٹاف آرٹسٹ سید آل محمد بیٹھے ہیں۔
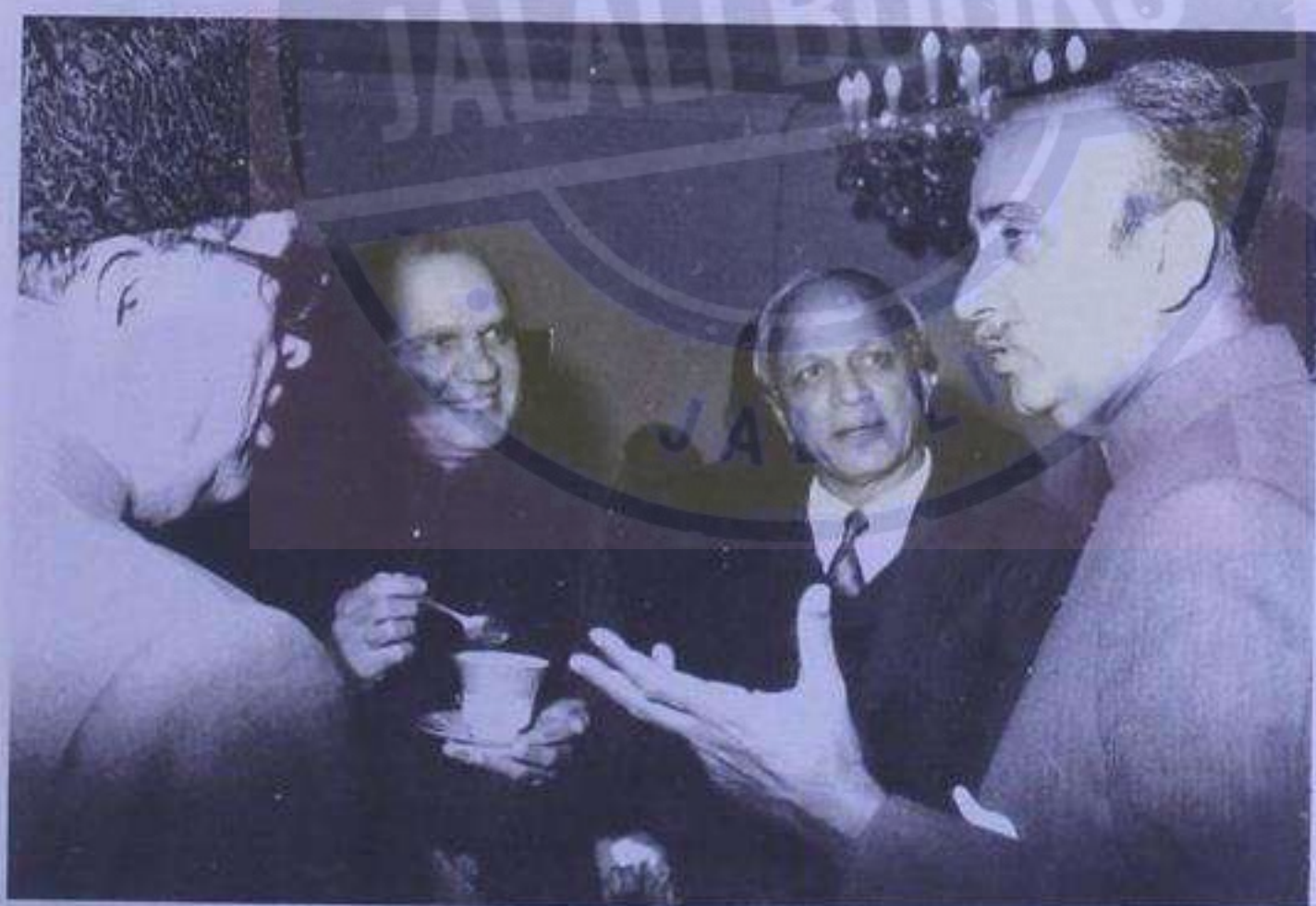
مصلح الدین کے ساتھ۔ اُس وقت کے وزیراعظم محمد خان جونیجو اور
وزیر اطلاعات قاضی عابد مجید بھی موجود ہیں۔

اطہر علی کے ساتھ۔ دائیں جانب سلیم شاہد اور بائیں جانب عظیم طارق ہیں

ریاض فرشوری کے ساتھ۔ بائیں جانب سی ڈی اے کے چیرمین اے ڈبلیو شیخ ہیں۔

اماں جی کے ساتھ ۔بڑی بیٹی ہُما، بیٹا بلال، چھوٹی بیٹی شمائیلہ
اور بیگم صفیہ ناصر بھی موجود ہیں۔

ممتاز مفتی کے ساتھ

فیض احمد فیض

دنیا میں ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں کہ جن کے نام سے ان کا ملک پہچانا جائے۔ پاکستان کی پچاس سالہ زندگی میں جن گنی چنی شخصیات کو یہ اعزاز حاصل ہوا' ان میں فیض احمد فیض کا نام بھی شامل ہے۔ فیض صاحب یقیناً اپنے ملک کی پہچان تھے اور عالمی سطح پر دانشوروں اور ادبی سماجی حلقوں میں پاکستان کے تعارف کے لیے ان کا نام کافی سمجھا جاتا تھا۔ فیض صاحب سے میری نیاز مندی اور محبت کا رشتہ تیس پینتیس برسوں پر پھیلا ہوا ہے۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ میں ان کے خاص مقربین میں سے تھا یا میں نے انہیں بہت قریب سے دیکھا...... البتہ یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ میرے دل میں ان کی جو محبت تھی' وہ زندگی میں کم لوگوں کے لیے تھی اور میں ان کی شاعری کا گرویدہ تھا۔

فیض صاحب کی شخصیت بڑی من موہنی تھی۔ وہ ایک سادہ لوح' خوش دل' منکسر المزاج اور نرم خو انسان تھے۔ ان کے سینے میں بڑا درد مند دل تھا اور انہیں اپنے سے زیادہ دوسروں کے دکھوں اور پریشانیوں کا خیال رہتا تھا۔ ان کی شخصیت کا لبھاؤ اور زندگی کا رچاؤ کچھ ایسا تھا کہ جس کو بھی ان سے قربت نصیب ہوئی' وہ یہی سمجھنے لگا کہ وہی فیض صاحب سے سب سے زیادہ قریب ہے۔ حالانکہ بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جن کے بارے میں خود فیض صاحب کا کہنا تھا کہ سال ہا سال کی قربت کے باوجود ان کے دل میں جگہ نہ پا سکے مگر مشکل یہ تھی کہ فیض صاحب اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کسی کے لیے بھی کرتے نہیں تھے اور ان کے سارے جاننے والے اسی خوش فہمی میں مبتلا رہتے تھے کہ وہ ان کی نظروں میں شاید سب سے زیادہ پسندیدہ شخص ہیں۔ ان کے بے حد پیار کے باوجود میں نے خود کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں اس فہرست میں شامل ہوں جنہیں وہ بہت عزیز سمجھتے تھے۔ اس بات کا یقین

تو مجھے ان کے مرنے کے بعد اُس وقت ہوا جب ان کے بہت سے قریبی دوستوں اور عزیزوں نے مجھے بتایا کہ میرے لیے ان کے دل میں بڑی محبت تھی...... اور یہی اعتماد تھا جس نے مجھے فیض پر قلم اٹھانے کی جسارت عطا کی۔

فیض صاحب کی شاعری سے تو میں بچپن سے واقف تھا۔ ہمارے خاندان میں علم و ادب کا اچھا خاصا ماحول تھا۔ والد صاحب کا تعلق شعبۂ تعلیم سے تھا۔ نانا جان گھر کے رئیس تھے اور عیش و عشرت کی زندگی کے ان سارے لوازمات سے آراستہ جو برطانوی ہند میں زمینداروں کا خاصہ تھے اور ان میں شاعری بھی شامل تھی۔ دراصل ہمارے خاندان میں شعر و شاعری کا چرچہ انہی کے سبب سے تھا اور نتیجتاً میرے تقریباً سارے ہی بھائی شعر و شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ منجھلے بھائی نے تو شمیم جاوید کے نام سے کراچی میں خاصی شہرت پائی اور ان کی شاعری کا مجموعہ "پیرہن گل" کے عنوان سے شائع ہوا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے خاندان کے لوگوں کو شعر و ادب سے بڑا شغف تھا میں نے بچپن ہی سے میر' غالب' سودا' ذوق' حسرت' حالی اور اقبال کے نام سنے اور مجھے علم تھا کہ ہمارے دور کے مشاہیر شعراء میں جوش' جگر' حسرت' حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی وغیرہ شامل ہیں۔

فیض صاحب سے پہلی ملاقات 1955ء میں ہوئی' جب وہ راولپنڈی سازش کیس کے سلسلے میں سزا کاٹنے کے بعد رہائی حاصل کر کے کراچی آئے۔ انہی دنوں ہم چند طالب علموں نے جو تازہ تازہ سندھ مسلم کالج سے بی اے کر کے کراچی یونیورسٹی میں آئے تھے' یونیورسٹی کلب کے نام سے ایک سوسائٹی قائم کی تھی جس کا پروگرام یہ تھا کہ زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی شخصیات کو بطور مہمان مدعو کیا جائے اور ان کے ساتھ شام منائی جائے۔ میں یونیورسٹی کلب کا پہلا سیکرٹری منتخب ہوا تھا اور اس کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی تقریب کے پہلے مہمان فیض احمد فیض تھے۔ ایمانداری کی بات ہے' اس وقت تک فیض صاحب میرے لیے اس دور کے ان بہت سے شاعروں میں سے ایک شاعر تھے جو مجھے پسند تھے۔ مثلاً ن۔ م راشد' میر اجی' مجاز اور ساحر وغیرہ۔ ابھی میرے دل میں ان کے لیے وہ مخصوص لگاؤ پیدا نہیں ہوا تھا جو بعد میں عشق کی حدود تک پہنچ گیا اور سچ پوچھیے تو اس لگاؤ اور محبت کا آغاز بھی اسی روز سے ہوا جب یونیورسٹی کلب کی اس تقریب میں ان سے پہلی ملاقات ہوئی۔ اس محفل میں شرکت کے لیے ہم نے حبیب جالب کو بھی بلا رکھا تھا جو خود تو

کسی تعلیمی درسگاہ سے وابستہ نہیں تھے مگر کراچی کے کالجوں اور یونیورسٹی کے ادبی سیاسی حلقوں میں گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ جالب کو اس لیے مدعو نہیں کیا تھا کہ وہ اپنے شعر سنائیں۔ دراصل وہ ان دنوں فیض صاحب کی نظمیں بڑے ہی خوبصورت ترنم سے سنایا کرتے تھے' لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ محفل کا آغاز جالب کے ترنم سے ہو۔ چنانچہ انہوں نے اس روز فیض کی مشہور نظم "پھر کوئی آیا دلِ زار نہیں کوئی نہیں" سنا کر سامعین کو مسحور کر دیا۔ فیض صاحب نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے اگرچہ باتیں تو بہت زیادہ نہیں کیں مگر شعر کافی سنائے۔ وہ اس محفل میں کچھ تنہا تنہا سے تھے۔ چونکہ ہم سب طالب علم جونیئر' کم عمر اور اجنبی صورت تھے۔ ان کا کوئی ہم عمر یا ہم رتبہ شخص موجود نہیں تھا۔ کچھ جونیئر قسم کے لیکچرار تھے مگر وہ بھی عمر اور صورت سے طالب علم ہی معلوم ہوتے تھے۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور سینئر پروفیسر زبوجوہ اس جلسے میں نہیں آئے تھے۔

تقریب کے اختتام پر چائے پر فیض صاحب سے باتیں ہوئیں۔ وہ اپنے جیل کے شب و روز کا حال مسکرا مسکرا کر اس طرح سناتے رہے جیسے کسی دلچسپ تفریحی سفر کا قصہ ہو۔ بہر حال یونیورسٹی کلب کی پہلی تقریب بڑی کامیاب رہی۔ جس کے لیے سبھی نے میری بڑی تعریف کی مگر اس شام میرا سب سے بڑا انعام فیض صاحب سے تعارف اور ان سے عقیدت مندی کا اظہار تھا۔ بعد میں جب زندگی نے مجھے ان کی قربت اور صحبت سے فیض یاب ہونے کا موقع دیا اور میں نے ان سے اس پہلی ملاقات کا ذکر کیا تو انہیں یہ بات بالکل یاد نہیں تھی۔ ان کا کہنا تھا "ٹھیک ہے مگر بھئی ایسے جلسے اور تقریبات تو بہت ہوتے تھے۔ ہم کس کس کو یاد رکھتے۔ دیکھونا' ہم طالب علموں میں بہت مقبول بھی تو تھے نا۔"

فیض صاحب کے بارے میں ان کی مخالف لابی کے لوگ عام طور پر ایک بات کا بڑا چرچا کرتے تھے اور وہ تھا ان پر غیر محبِّ وطن ہونے کا الزام۔ چند دانشور' شاعر اور صحافی تو ایسے تھے کہ جنہوں نے اپنا مشن ہی بنایا ہوا تھا کہ فیض صاحب کو ملک دشمن اور غیر محبِّ وطن ثابت کریں۔ وہ اپنی دلیلوں کے تانے بانے بننے کا آغاز راولپنڈی سازش کیس سے کرتے تھے کہ جب فیض صاحب کو آرمی کے بہت سے افسروں کے ساتھ گرفتار کیا گیا تھا۔ اس گروپ پر پاکستان میں کمیونسٹ انقلاب لانے کا الزام تھا اور کہا گیا تھا کہ ان کو روس کی اشتراکی حکومت کی پشت پناہی حاصل ہے۔ فیض صاحب کو دوسرے "سازشیوں" کے ساتھ مجرم

قرار دے کر قید کا حکم سنایا گیا اور اس طرح وہ برسوں پس زنداں رہے۔ یہ الگ بات کہ قید و بند کا یہ زمانہ ان کی شاعری کے لیے انتہائی بار آور اور مفید ثابت ہوا۔ ان کی بہت سی شاہکار نظمیں اسی دور کی تخلیق ہیں۔ ان کے جیل کی زندگی کے احوال و واقعات چند ایسے لوگوں نے قلم بند بھی کیے ہیں جو ان کے ساتھ تھے لیکن ان تحریروں کے علاوہ مجھے عینی شاہد کے طور پر ارباب نیاز محمد سے بھی بہت سے قصے کہانیاں سننے کا موقع ملا جو 1980ء میں مارشل لاء حکومت میں وزیر ثقافت مقرر ہوئے تھے۔ میں ان دنوں نیشنل فلم ڈویلپمنٹ کارپوریشن کا سربراہ تھا۔ ان کے وزیر بننے کے بعد چند ہی ملاقاتوں میں مجھے احساس ہو گیا کہ یہ اپنے ڈھب کے آدمی ہیں اور ان سے ہماری خوب نبھے گی اور ہوا بھی یہی۔ ارباب صاحب سے میرا تعلق سرکاری ربط و ضبط سے بڑھ کر ذاتی تعلقات کی نوعیت اختیار کر گیا۔ وہ مجھے پہلی ہی نظر میں بہت بھائے۔ یہ تو بعد کی بات ہے کہ مجھے معلوم ہوا' وہ بھی راولپنڈی سازش کیس میں پکڑے گئے تھے اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ جن میں فیض صاحب بھی شامل تھے' حیدر آباد کی جیل میں رہے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ مجھے تو شعر و شاعری سے کوئی رغبت نہیں تھی مگر فیض صاحب کی شخصیت ایسی دلاویز تھی کہ میں آپ ہی آپ ان کا گرویدہ ہوتا گیا اور پھر یہ رشتہ دوستی میں تبدیل ہو گیا۔ ان کو فیض صاحب کی شاعری سے صرف ایک نظم یاد تھی جس کے لیے ان کا دعویٰ تھا کہ وہ حیدر آباد جیل میں فیض صاحب نے ان کی تحریک پر ان کے لیے لکھی تھی۔ ارباب صاحب بڑے سچے اور کھرے پٹھان تھے۔ میری اور ان کی دوستی چین کے دورے کے زمانے میں بہت بڑھی کہ جب حکومت چین کی دعوت پر ایک ثقافتی وفد ارباب صاحب کی قیادت میں چین کے دورے پر گیا' اس وفد میں' میں بھی شامل تھا بلکہ وہ اس وفد کے لیڈر اور میں ڈپٹی لیڈر تھا۔ دس روز کے دوران مختلف تقاریب کے لیے ان کی تقریریں وغیرہ لکھنے کا کام بھی میں ہی کرتا تھا۔ اسی دورے کے دوران ہم شاید شنگھائی میں تھے تو ایک رات کسی سرکاری عشائیہ سے واپسی پر انہوں نے کافی پینے کے لیے مجھے اپنے کمرے میں مدعو کیا۔ بڑی لمبی گپ لگی اور اسی ملاقات میں' میں نے موقع غنیمت جان کر ان سے ایک بڑا کڑوا سوال کر ڈالا جو بڑی دیر سے میرے ذہن میں اٹکا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"ارباب صاحب آپ تو اس انقلاب کے حامیوں میں سے تھے کہ جو ملک میں اشتراکی نظام قائم کرنا چاہتا تھا اور آپ سازش کیس میں مجرم قرار دیئے گئے اور سزا کاٹی۔ پھر یہ کیسے

ممکن ہوا کہ آپ نے مارشل لاء کے دور میں وزارت قبول کرلی......؟" ارباب صاحب بہت موڈ میں تھے۔ پہلے تو خوب ہنسے' پھر بولے۔ "یار! میں کہاں کا اشتراکی تھا۔ مجھے تو نہ سیاست سے کوئی تعلق تھا' نہ انقلاب سے۔ میں تو ایک بڑا وفادار خالص فوجی تھا۔ جس کا ایمان اپنے افسر کا حکم ماننا ہے۔ میں جنرل اکبر کا سٹاف افسر تھا اور میرے فرائض میں یہ شامل تھا کہ افسر جو کہے وہی کرو لہٰذا جب جنرل اکبر کو گرفتار کیا گیا تو اس کے سٹاف افسر کو بھی قصوروار گردانا گیا ورنہ میرا تعلق ان باتوں سے بالکل نہیں تھا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ جب پوچھ گچھ ہوئی تو میں نے ایک ذمہ دار اور وفادار فوجی کی حیثیت سے صاف الفاظ میں یہ کہہ دیا کہ کرنل ارباب نیاز محمد نے ہر وہ حکم مانا جو اس کے جنرل نے دیا۔ اس یقین کے ساتھ کہ اس کا ہر حکم صحیح تھا اور یہ کہ آپ جو کچھ جنرل اکبر کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں' وہی میرے ساتھ کریں......" ارباب صاحب خاموش ہو گئے جیسے گزرے وقت کی تصویریں ان کے تخیل میں ابھر رہی ہوں۔ پھر آہستہ آہستہ بولے "مگر یار! حیدر آباد جیل میں فیض صاحب کی صحبت نے مجھے بھی پڑھا لکھا بنا دیا۔ میں کتابیں پڑھنے لگا۔ ادب' فلسفہ' سیاست اور ملکی حالات پر گفتگو کرنے لگا اور اشتراکیت کے فلسفے کا قائل ہو گیا یعنی مجھے سزا پہلے ہوئی اور جرم بعد میں سرزد کیا......" وہ ہنسنے لگے "اور یار! یہ وزارت کی کرسی پر براجمان ہونے کی بات تو بس یوں سمجھو کہ ذاتی تعلق سے ہے۔ جنرل ضیاء الحق اور میں فوج میں ساتھ تھے' لہٰذا جب انہوں نے مجھے کہا کہ وہ صوبہ سرحد سے کسی غیر متنازع' اچھی شہرت رکھنے والے اور عوام میں مقبول شخصیت کی تلاش میں ہیں جسے کابینہ میں وزیر بنایا جا سکے اور ان کے خیال میں' میں اس معیار پر پورا اترتا ہوں تو میں انکار نہ کر سکا۔ میں ان دنوں پشاور میونسپل کارپوریشن کا میئر تھا۔ میں نے میئر کی پوزیشن سے استعفیٰ دیا اور وزیر بن گیا۔ میں نے سوچا' اس سخت زمانے میں شاید اسی طرح ضرورت مندوں کے کچھ کام کر سکوں"

ارباب صاحب کی شخصیت اور کردار سے واقفیت کی بنا پر میں نے ان کی اس وضاحت کو تسلیم کر لیا اور ان سے پھر فیض صاحب کے جیل کے روز و شب پر گفتگو کرنے لگا۔ میں نے ان کی توجہ جب اس جانب مبذول کروائی کہ بہت سے لوگ فیض صاحب کو ملک دشمن قرار دیتے ہیں تو وہ بڑے جذباتی انداز میں کہنے لگے "میں نے اپنی زندگی میں کم لوگ دیکھے ہیں. جنہیں فیض سے زیادہ وطن کی محبت ہو۔ ان کا کہنا تھا کہ فیض صاحب خود یہ بات سن کر ہنسا

کرتے تھے اور سازش کیس کو غیر محب الوطنی قرار دینے والوں کے سلسلہ میں کہتے تھے کہ بھئ اگر اس بات کو صحیح مان لیں، تب بھی ہم نے ملک کے خلاف تو کوئی سازش نہیں کی۔ ہم پر تو حکومت کے خلاف سازش کا الزام تھا۔ ایک ایسی حکومت جو عوام میں اپنی مقبولیت کھو چکی تھی۔

اسی حب الوطنی کے سلسلے میں مجھے ایک اور قصہ یاد آتا ہے۔ یہ جنرل ضیاء الحق کی مارشل لاء کا نیا نیا زمانہ تھا۔ فیض صاحب ملک چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ انہیں دنوں ایک پاکستانی اخبار میں فیض صاحب کے بارے میں ایسی خبریں شائع ہوئیں جو ملک سے ان کی وفاداری کو مشکوک بناتی تھیں۔ ایک خبر تو یہ تھی کہ فیض صاحب کو (جو ان دنوں ہندوستان میں علامہ اقبال کی ولادت کی سو سالہ تقریبات کے سلسلے میں لیکچرز دینے آئے ہوئے تھے۔) علی گڑھ یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا جا رہا ہے اور دوسری یہ کہ اس بار فیض صاحب سرینگر میں اپنی شادی کی سالگرہ منانے جا رہے ہیں۔ یہ بات اس حوالے سے تھی کہ ایلس سے فیض صاحب کی شادی سرینگر میں ہوئی تھی اور شیخ عبداللہ نے ان کا نکاح پڑھایا تھا۔ چونکہ ان خبروں کی کوئی تردید نہیں ہوئی، لہٰذا فیض صاحب کے احباب اور نیاز مند جو ان کے کردار سے واقفیت رکھتے تھے۔ ان خبروں سے بڑے آزردہ خاطر ہوئے لیکن ظاہر ہے کہ مارشل لاء کے اس سخت دور میں کوئی کیا کر سکتا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ کچھ ہی عرصے بعد مجھے کسی سرکاری کام سے دہلی جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ان دنوں عبدالستار صاحب پاکستان کے سفیر تھے۔ عبدالستار صاحب وزارت خارجہ کے ان معدودے چند سینئر افسران میں سے ہیں کہ جو بڑی اعلیٰ اخلاقی اقدار کے مالک ہیں اور ہر ملنے والے کے ساتھ بڑی شفقت اور مروت کا رویہ رکھتے ہیں۔ میں دہلی میں قیام کے دوران ان سے ملنے گیا۔ بڑی دیر گفتگو ہوتی رہی، پھر جانے کس طرح فیض صاحب کا ذکر آ گیا۔ انہوں نے کہا فیض صاحب کافی عرصہ دہلی میں رہے اور ان کا قیام ستار صاحب ہی کے گھر تھا۔ یہ علم ہونے کے بعد کہ ہمارے سفیر صاحب بھی فیض صاحب سے تعلق خاطر رکھتے تھے، میں نے فیض صاحب کے بارے میں شائع ہونے والی ان دو خبروں کا ذکر کیا اور ستار صاحب سے دریافت کیا کہ کیا وہ علی گڑھ یونیورسٹی کی وائس چانسلری اور سرینگر میں شادی کی سالگرہ کے سلسلہ میں کچھ جانتے ہیں؟ ستار صاحب پہلے ہنسے، پھر سنجیدہ ہو کر کہنے لگے "ان دونوں الزامات کا تو

میں آنکھوں دیکھا گواہ ہوں۔ یہاں جب فیض صاحب اقبال پر لیکچر دینے اہل علم و دانش کی ایک محفل میں گئے تو وہاں حکومت ہند کے اعلیٰ افسران بھی تھے۔ اسی محفل میں کسی نے فیض صاحب کو یہ آفر کی کہ آپ علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بننے پر راضی ہوں تو بات چلائی جا سکتی ہے۔ فیض صاحب نے بلا کسی تامل کے جواب دیا۔ ''بھئی ہمارے اپنے ملک میں کیا کم یونیورسٹیاں ہیں۔ اگر وائس چانسلر ہی بننا ہے تو ان میں سے کسی کے وائس چانسلر بن جائیں گے۔''

سرینگر میں سالگرہ منانے کا قصہ یہ تھا کہ مقبوضہ کشمیر کے وزیر اعلیٰ نے ٹیلی فون پر انہیں دعوت دی کہ اس بار آپ اور ایلس کی ہندوستان میں موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم آپ کو سرینگر بلانا چاہتے ہیں' جہاں آپ اپنی شادی کی سالگرہ منائیں اور پرانی یادوں کو تازہ کریں۔ فیض صاحب یہ سن کر مسکرائے اور اپنے مخصوص انداز میں بولے ''بھئی یہ تو ٹھیک ہے مگر ہم وہاں آ کیسے سکتے ہیں؟ ہم تو کشمیر میں آپ کی حکومت کو مانتے ہی نہیں ہیں''

سچی بات تو یہ ہے کہ فیض صاحب کو لاہور سے اور پاکستان سے جتنی محبت تھی' وہ میں نے کم لوگوں میں دیکھی۔ اپنی طویل خود ساختہ جلاوطنی کے دوران کے جب وہ ''لوٹس'' کے ایڈیٹر تھے' میری لندن میں جب بھی ان سے ملاقات ہوئی' میں نے انہیں وطن کی محبت میں سرشار پایا۔ وہ نام لے لے کر ایک ایک دوست اور شناسا کے بارے میں پوچھتے تھے۔ وطن اور اپنے عزیز دوستوں کی دوری نے انہیں افسردہ کر دیا تھا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ جیل کی طرح جلاوطنی بھی ان کی شاعری کے لیے ایک بڑا باثمر زمانہ تھا۔ اس دور میں انہوں نے جیسی جیسی معرکتہ الآرا نظمیں اور جذبات سے معمور شعر لکھے' وہ اردو شاعری کا سرمایہ ہیں۔

مرے دل مرے مسافر
ہوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں
کہ سراغ پھر سے پائیں

کسی یار نامہ بر کا
ہر اک اجنبی سے پوچھیں
جو پتہ تھا اپنے گھر کا
سر کوئے ناشنایاں
ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا

اور دیار غیر میں کوئی عاشق کسی محبوبہ سے یوں مخاطب ہے......

گلشن یاد میں گر آج دم باد صبا
پھر سے چاہے کہ پرافشاں ہو تو ہو جانے دو
عمر رفتہ کے کسی طاق پہ بسرا ہوا درد
پھر سے چاہے کہ فروزاں ہو تو ہو جانے دو

اور پھر اسی نظم کا آخری بند......

گرد ایام کی تحریر کو دھونے کے لیے
تم سے گویا ہوں دم دید جو میری پلکیں
تم جو چاہو تو سنو اور جو نہ چاہو نہ سنو
اور جو حرف کریں مجھ سے گریزاں آنکھیں
تم جو چاہو تو کہو اور جو نہ چاہو نہ کہو

اور پھر یہ نظم جوان کی شاہکار شاعری کا حصہ ہے......

ٹھہر گئی آسماں کی ندیا
وہ جا لگی ہے افق کنارے
اداس رنگوں کی چاندنیا
اتر گئے ساحل زمیں پر
سبھی کھویا
تمام تارے

اور پھر چند اور مصرعوں کے بعد......

کسی کو کچھ بھی خبر نہیں ہے
کہ دن ڈھلے شہر سے نکل کر
کدھر کو جانے کا رخ کیا تھا
نہ کوئی جادہ نہ کوئی منزل
کسی مسافر کو
اب دماغ سفر نہیں ہے
یہ وقت زنجیر روز و شب کی
کہیں سے ٹوٹی ہوئی کڑی ہے
یہ ماتم وقت کی گھڑی ہے

ایک محب وطن حساس شاعر کی زندگی وطن سے دور کس طرح گزرتی ہے' یہ اشعار غم والم کی اسی کیفیت کا اظہار ہیں۔

وہ در کھلا میرے غم کدے کا
وہ آگئے میرے ملنے والے

اور اسی نظم کے آخری اشعار

یہ آئے سب میرے ملنے والے
کہ جن سے دن رات واسطہ ہے
یہ کون کب آیا کب گیا ہے
نگاہ و دل کو خبر کہاں ہے
خیال سوئے وطن رواں ہے
سمندروں کی ایال تھامے
ہزار وہم و گماں سنبھالے
کئی طرح کے سوال تھامے

- جلاوطنی کے آخر زمانے میں جب میں زہرہ نگاہ کے ہاں لندن میں ان سے ملا تو اس بار انہیں معمول سے زیادہ مضطرب پایا۔ وہ واپس پاکستان آنے کے لیے تڑپ رہے تھے۔

ان کے دوستوں کا مشورہ تھا کہ وہ ابھی واپس نہ جائیں مگر فیض صاحب طویل انتظار سے بیزار ہو چکے تھے۔

ہر اک شب ہر گھڑی گزرے قیامت یوں تو ہوتا ہے
مگر ہر صبح ہو روز جزا ایسے نہیں ہوتا

ان کی بے چینی دیکھ کر مجھے یقین سا ہو گیا تھا کہ اب فیض صاحب زیادہ عرصہ ملک سے باہر ٹکنے والے نہیں ہیں۔ برسوں پہلے ایک بار پہلے بھی ایسا ہو چکا تھا۔ 1958ء میں جب ایوب خان کا مارشل لاء لگا تو فیض صاحب ادیبوں کے کسی وفد کے ساتھ روس گئے ہوئے تھے۔ انہیں ان کے دوستوں نے مشورہ دیا کہ ملک میں مارشل لاء لگ چکا ہے' لہٰذا ان کے حق میں یہی بہتر ہے کہ وفد کے ساتھ وطن واپس نہ جائیں۔ مجید ملک صاحب نے جو فیض صاحب کے بہت قریبی بزرگ دوست تھے' انہیں پیغام بھجوایا کہ آپ ماسکو سے لندن چلے جائیں اور فی الوقت وہیں قیام کریں۔

فیض صاحب مشورے کے مطابق لندن چلے گئے مگر تھوڑے ہی عرصہ بعد ان کو پاکستان کی یاد ستانے لگی اور پھر ایک دن وہ دوستوں کے مشورے اور بگڑے ہوئے ملکی حالات کو یکسر نظر انداز کر کے اچانک واپس لوٹ آئے۔ سنا ہے جب کراچی میں وہ مجید ملک صاحب سے ملے اور انہوں نے پوچھا کہ میں نے تمہیں پیغام بھجوایا تھا کہ ابھی مت آؤ تو فیض صاحب نے ہنس کر جواب دیا۔ "پیغام مل گیا تھا مگر ہم تو آ گئے۔" ان کے دوستوں کا خدشہ جائز تھا۔ دو چار روز کے بعد انہیں لاہور میں ان کے گھر سے گرفتار کر لیا گیا اور ایک بار پھر زنداں کی زینت بنا دیا گیا۔

میرا خیال غلط نہیں تھا۔ اس ملاقات کے بعد بہت زیادہ عرصہ نہیں لگا کہ فیض صاحب وطن لوٹ آئے مگر وطن واپسی سے قبل ایک اور دلچسپ قصہ بھی ہوا جس سے میرا بھی ایک تعلق رہا۔ ہوا یوں کہ 1981ء کے مئی یا جون کی ایک دوپہر میں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ کراچی سے احمد مقصود حمیدی کا فون آیا جو ان دنوں غالباً صوبائی سیکرٹری اطلاعات تھے۔ احمد مقصود بڑے ٹھنڈے مزاج کے آدمی ہیں اور بڑی سے بڑی ہیجانی کیفیت میں بھی ان کا یہ Cool قائم رہتا ہے۔ انہوں نے اپنے مخصوص میٹھے اور نرم لہجے میں مجھے بتایا کہ آج صبح کراچی کے انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر ایک تماشہ ہو گیا۔ فیض صاحب کو جہاز میں سوار ہونے کی اجازت نہیں ملی اور اس وقت غلام رسول تالپور صاحب کے گھر میں ہیں۔ قصہ یوں ہوا کہ وہ یونیسکو کی

کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے بیروت سے ٹوکیو جا رہے تھے۔ جب جہاز کراچی کے ایئرپورٹ پر اترا تو فیض صاحب بھی دوسرے مسافروں کے ساتھ ٹرانزٹ لاؤنج میں آ گئے مگر کچھ دیر بعد جب یہ اعلان ہوا کہ فنی خرابی کے باعث جہاز کی پرواز میں چند گھنٹوں کی تاخیر ہو گی تو فیض صاحب نے سوچا کہ کراچی کے کچھ یار دوستوں سے ٹیلی فون پر بات کی جائے۔ انہوں نے فون تلاش کیا انہیں بتایا گیا کہ ٹرانزٹ لاؤنج میں ٹیلی فون نہیں ہے۔ فیض صاحب ہاتھ میں ٹیلی فون کی چھوٹی سی نوٹ بک لیے ٹرانزٹ لاؤنج سے باہر آ گئے اور اپنے کچھ قریبی دوستوں کو فون کیا کہ بھئی ہم کراچی کے ایئرپورٹ پر ہیں۔ ہماری فلائٹ میں تاخیر ہو گئی ہے' آ کر ہم سے مل لو۔ اس خبر سے احباب کی عید ہو گئی اور وہ برسوں کے بچھڑے اپنے محبوب فیض احمد فیض سے ملنے ایئرپورٹ پہنچ گئے۔ مگر پھر ہوا یوں کہ جب مرمت کے بعد جہاز کی ٹوکیو روانگی کا اعلان ہوا اور فیض صاحب واپس جانے کے لیے چلے تو امیگریشن والوں نے انہیں کاؤنٹر پر روک لیا اور بتایا کہ ان کا نام Exit Control List پر ہے اور وہ ملک سے باہر نہیں جا سکتے۔ فیض صاحب نے ان کو بہت سمجھایا کہ بھئی ہم تو پہلے ہی ملک سے باہر ہیں۔ اس وقت ایک بین الاقوامی مسافر کی حیثیت سے ایک غیر ملکی ایئر لائن سے سفر کر رہے ہیں اور صرف اپنے کچھ دوستوں سے ملنے لاؤنج سے باہر آئے تھے مگر امیگریشن والوں نے ایک نہ سنی۔ جب ہر طرح کی کوشش ناکام ہو گئی تو ان کے دوست ان کو شہر لے کر آ گئے۔ احمد مقصود نے مجھے بتایا کہ اب مسئلہ یہ ہے کہ صرف فیڈرل گورنمنٹ سے ان کو جانے کی اجازت مل سکتی ہے۔ مارشل لاء کے اس دور میں فیڈرل گورنمنٹ کا مطلب تھا۔ CMLA سیکرٹریٹ۔ اور چونکہ معاملہ فیض صاحب کا تھا' لہٰذا اجازت صرف جنرل ضیاء الحق کی سطح پر ہی دی جا سکتی تھی اور یہ کام ارباب نیاز محمد کرا سکتے تھے جو وفاقی وزیر کے عہدے پر فائز تھے۔ میرے سپرد یہ کام ہوا کہ میں ارباب صاحب کو تلاش کروں اور ساری صورتحال سے آگاہ کروں۔ خدا کا شکر ہے ارباب صاحب مل گئے۔ انہوں نے فی الفور مارشل لاء سیکرٹریٹ سے رابطہ کیا اور فیض صاحب اپنی منزل کی طرف پرواز کر گئے۔ غالباً اسی کے بعد فیض صاحب نے اپنی یہ نظم لکھی۔

دار کی رسیوں کے گلوبند گردن میں پہنے ہوئے
گانے والے ہر اک روز گاتے رہے
پائیلیں بیڑیوں کی [illegible] ہوئے

ناچنے والے دھومیں مچاتے رہے
ہم نہ اس صف میں تھے اور نہ اس صف میں تھے
راستے میں کھڑے ان کو تکتے رہے
رشک کرتے رہے
اور چپ چاپ آنسو بہاتے رہے
لوٹ کر آکے دیکھا تو پھولوں کا رنگ
جو کبھی سرخ تھا زرد ہی زرد ہے
اپنا پہلو ٹٹولا تو ایسا لگا
دل جہاں تھا وہاں درد ہی درد ہے

اس واقعے کے اگلے برس 1982ء میں فیض صاحب واپس وطن آگئے۔ یہ فیصلہ کرنے سے قبل وہ اسلام آباد آئے اور ارباب نیاز محمد کے مہمان ہوئے جنہوں نے جنرل ضیاء الحق سے ان کی ملاقات کا انتظام کیا۔ یہ اسی روز کی بات ہے جب جوش ملیح آبادی کا انتقال ہوا تھا۔ مجھے یاد ہے وہ صدر پاکستان سے ملاقات کے لیے جانے سے پہلے قبرستان آئے تھے۔ عین اس وقت جب جوش صاحب کو لحد میں اتارا جا رہا تھا۔ وہ بہت دیر تک قبر کے پاس کھڑے ان کے چہرے کو تکتے رہے۔ ان کے چہرے پر شدید غم کے تاثرات تھے۔ واپسی پر انہوں نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ خاموش خاموش کھوئے کھوئے سے وہ واپس چلے گئے۔ بعد میں ارباب صاحب نے مجھے بتایا کہ ضیا صاحب سے ان کی ملاقات بہت مختصر رہی۔ انہوں نے فیض صاحب سے کہا۔ آپ تو ہمارے ادب کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ آخر آپ ملک سے باہر کیوں رہتے ہیں؟ آپ کے پاکستان میں رہنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس پر فیض صاحب نے کہا کہ رہنے پر تو پابندی نہیں ہے مگر میں چاہتا ہوں ملک سے باہر آنے جانے پر بھی کوئی پابندی نہ ہو۔ جنرل ضیاء نے کہا' ایسا ہی ہوگا اور بس ملاقات ختم ہو گئی۔ اس کے بعد فیض صاحب نے اپنی خود ساختہ جلاوطنی ختم کر ڈالی اور واپس آکر اپنے محبوب شہر لاہور میں سکونت اختیار کر لی لیکن اس شہر کو دیکھ کر انہیں کچھ بہت خوشی نہیں ہوئی۔

گو سب کو بہم ساغر و بادہ تو نہیں تھا
یہ شہر اداس اتنا زیادہ تو نہیں تھا

گلیوں میں پھرا کرتے تھے دو چار دوانے
ہر شخص کا صد چاک لبادہ تو نہیں تھا

میجر محمد اسحاق نے جو فیض صاحب کے ساتھ راولپنڈی سازش کیس میں طویل عرصے تک جیل میں رہے' ان پر نزول شعر کی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے زندان نامہ کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "حیدر آباد میں فیض صاحب' میں اور عطا ملحق کمروں میں رہتے تھے اور میں اور عطا ان کے سب موڈوں سے واقف ہو گئے تھے۔ شعر کا عالم طاری ہوتا تو فیض صاحب خاموش ہو جایا کرتے تھے البتہ اٹھتے بیٹھتے گنگنا چکنے کے بعد ادھر ادھر دیکھنے لگتے۔ ہم بھانپ لیتے تھے کہ سامعین کی ضرورت ہے۔"

میں نے بھی دو ایک بار فیض صاحب کو شعر تخلیق کرنے کے اس مرحلے سے گزرتے دیکھا ہے۔ ایک بار تو دسمبر 1971ء میں کہ جب پاکستان اپنے مشرقی حصہ سے محروم ہوا تھا' 71ء کی جنگ ابھی ہفتہ دس روز پہلے ہی ختم ہوئی تھی اور ذوالفقار علی بھٹو کو شکست خوردہ قوم کے صدر کی حیثیت سے حلف اٹھائے چند ہی دن گزرے تھے۔ فیض صاحب راولپنڈی آئے ہوئے تھے اور انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں مقیم تھے۔ ملک کے دو لخت ہو جانے اور جنگ میں شکست کے بعد پاکستان کے رہنے والوں کی کیا کیفیت تھی' یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بوڑھے' بچے' جوان' مرد' عورت غرض ملک کا ہر باشندہ بے حد دل گرفتہ' مغموم اور افسردہ تھا۔ ہر ایک کے چہرے پر شکست کے پرتو تھے اور مجموعی طور پر ایک ایسی مایوسی کی فضا طاری تھی کہ ایک دوسرے سے بات تک کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ ملک کے دانشور' ماہرین معاشیات' صحافی' صنعتکار اور ریٹائرڈ سرکاری افسر بڑی تعداد میں راولپنڈی آئے ہوئے تھے۔ بھٹو صاحب نے زمام حکومت سنبھالنے کے بعد اپنی پسند کے لوگوں کو مختلف محکمے اور سرکاری شعبے تقسیم کرنے کا کام شروع کیا ہوا تھا' لہٰذا اسی کے نتیجے میں انٹر کانٹی نینٹل راولپنڈی ان اہم عہدوں کے امیدواروں کا مسکن بنا ہوا تھا جنہیں ملک کے دور و نزدیک سے وفاقی دارالحکومت میں بلایا گیا تھا۔ میں ان دنوں راولپنڈی' اسلام آباد ٹیلی ویژن اسٹیشن کا جنرل منیجر تھا اور ہر شام دفتر سے لوٹتے ہوئے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل چلا جایا کرتا تھا کہ وہاں بہت سے دوستوں اور دوسرے شہروں سے آئے ہوئے احباب سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ ایک دن اچانک فیض صاحب مجھے ہوٹل

کے کاریڈور میں مل گئے۔ کہنے لگے 'کس سے ملنے آئے ہو؟ میں نے کہا جو بھی مل جائے۔ آج کل ہوٹل کے ہر کمرے میں کوئی نہ کوئی جاننے والا ٹھہرا ہوا ہے۔ کسی میں یونس سعید ہیں، کسی میں شوکت صدیقی ہیں، کسی میں اسلم اظہر ہیں اور کسی میں عمر قریشی۔ تو پھر ٹھیک ہے، فیض صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ آج ہماری باری سہی۔ میں خوش ہو کر بولا چلیے پھر آپ کے کمرے میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ فیض صاحب کسی اور ہی موڈ میں تھے۔ بولے نہیں، ہمیں تو راولپنڈی کلب جانا ہے۔ کوئی ملنے آ رہا ہے۔ تم بھی ساتھ چلو۔ میں نے کہا کچھ دیر انتظار کریں۔ میں نے اپنی گاڑی واپس کر دی تھی۔ گھر پہنچ جائے تو فون کر کے بلوالوں گا۔ انہوں نے میری تجویز کو رد کر دیا۔ کہنے لگے' گاڑی واڑی چھوڑو۔ کلب یہاں سے قریب ہی تو ہے' چلو پیدل چلتے ہیں۔ ہم دونوں ہوٹل سے باہر آ گئے۔ موسم کافی سرد تھا۔ سڑک پر اندھیرا تھا۔ چونکہ بلیک آؤٹ کا سلسلہ ابھی تک مکمل طور پر ختم نہیں ہوا تھا' ہم مال روڈ کے فٹ پاتھ پر اس نیم تاریکی میں کلب کی طرف روانہ ہوئے۔ فیض صاحب بڑے پژمردہ تھے۔ انہیں مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور جنگ میں شکست کا بے حد غم تھا۔ چلتے چلتے وہ بار بار اپنے یہ مصرعے دہراتے رہے۔

مرے وطن تیرے دامان تار تار کی خیر
ہر ایک خانہ ویراں کی تیرگی پہ سلام
ہر ایک خاک بسر خانماں خراب کی خیر

اور پھر کہتے تھے "بھئی ہمیں کیا معلوم تھا کہ ہم نے جو یہ لکھا تھا اس طرح حقیقت بن کر سامنے آئے گا۔" میں نے محسوس کیا' وہ بہت بے چین سے تھے۔ اپنے یہ مصرعے وہ تمام راستے بڑے تواتر کے ساتھ دہراتے رہے۔ کلب پہنچ کر میں نے انہیں ایک میز پر چھوڑا اور خود ان کے دوست کو تلاش کرنے کلب کے دوسرے حصے کی طرف چلا گیا۔ جب میں واپس لوٹا تو فیض صاحب ایک کاغذ پر پنسل سے کچھ لکھ رہے تھے۔ یہ کاغذ پنسل انہوں نے میرے جانے کے بعد کلب کے بیرے سے منگوائی تھی۔ جب وہ لکھ چکے تو میں نے کاغذ ان کے ہاتھ سے لے لیا۔ مشرقی پاکستان کی مفارقت کے بعد یہ پہلا قطعہ تھا جو انہوں نے لکھا:

رفیق راہ تھی منزل ہر اک تلاش کے بعد
چھٹا یہ ساتھ تو رہ کی تلاش بھی نہ رہی

ملول تھا دل آئینہ ہر خراش کے بعد
جو پاش پاش ہوا اک خراش بھی نہ رہی

میں نے جلدی جلدی دوسرے کاغذ پر یہ اشعار نقل کیے اور فیض صاحب کے ہاتھ کی تحریر والا کاغذ تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

ایسے ہی ایک بار اور 1968ء میں بھی میں نے انہیں تخلیق کے عمل سے گزرتے دیکھا تھا۔ میں ان دنوں لاہور کے ٹیلی ویژن اسٹیشن سے منسلک تھا۔ لاہور اگرچہ میرے لیے نیا تھا مگر دو تین برسوں ہی میں وہاں کے ماحول میں اس قدر رل مل گیا تھا کہ اجنبیت کا احساس باقی نہیں رہا تھا۔ میرے دوستوں کا ایک حلقہ تھا اور پھر نئے نئے قائم شدہ ٹیلی ویژن کی اپنی ایک دنیا تھی۔ کم لوگ اور سارے کے سارے ایک ہی دھن میں لگے ہوئے کہ کس طرح ٹیلی ویژن کے پروگراموں کو دلچسپ سے دلچسپ تر بنایا جائے۔ غرض یہ میری پیشہ ورانہ زندگی کا بڑا ہی رنگا رنگ اور خوبصورت دور تھا۔ ٹیلی ویژن کی دنیا کے باہر بھی میرا اپنا ایک دوستوں کا حلقہ تھا۔ خاص طور پر یوسف جمال جو کراچی یونیورسٹی کے حوالے سے میرے دوستوں میں سے تھے' وہ ان دنوں مغربی پاکستان کے سیکرٹریٹ میں وزارت تعلیم کے ڈپٹی سیکرٹری تھے۔ دوسرے مصطفیٰ زیدی تھے جو لاہور کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ پاکستان ٹائمز کے محمد ادریس اور جانے پہچانے شاعر حمایت علی شاعر جنہیں یوسف جمال Support Ali Poet کہا کرتا تھا۔ شام کی گپ شپ اور شعر و شاعری کی محفلیں ہفتے میں دو ایک بار ضرور کہیں نہ کہیں آراستہ ہوتی تھیں۔ یوسف جمال اکثر شام کو ٹیلی ویژن اسٹیشن پر آجاتے تھے۔ وہ فیض صاحب کے سخت گرویدہ تھے۔ ان کی یادداشت ایسی کمال کی تھی کہ فیض صاحب کا تمام کلام ان کو ازبر تھا۔ ویسے تو مجھے بھی ان دنوں فیض صاحب کا ہر شعر سننے کے بعد فوراً ہی یاد ہو جاتا تھا مگر یوسف جمال کا کوئی ثانی ہی نہ تھا۔ وہ فیض سے اتنے متاثر تھے کہ بولتے بھی بالکل اسی طرح تھے۔ لہجے کو ایک مخصوص انداز میں جھٹکے دے دے کر۔ فیض صاحب کی چھوٹی بیٹی منیزہ جو ہمارے ساتھ ٹیلی ویژن پر بحیثیت پروڈیوسر کام کیا کرتی تھیں' یوسف جمال کو فیض صاحب کی نقل کرتے دیکھ کر کہا کرتی تھیں۔ "ایسے خوامخواہ...... بھلا ابا اتنے جھٹکے دے کر کہاں بولتے ہیں" یوسف جمال کے فیض صاحب کے لہجے اور انداز کی نقل بنانے کے سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ یاد آگیا۔ اس لیے اصل موضوع پر آنے سے پہلے

سنتے چلیے.....یوسف جمال فیض صاحب کے لہجہ اور ان کے انداز کی اس قدر نقل کرتے تھے کہ اپنی عام زندگی میں بھی ویسے ہی گفتگو کرنے لگے اور پھر جب ان کی شادی ایک بڑی ماڈرن مغربی انداز کی رئیس زادی سے ہوئی اور یوسف نے فیض صاحب کو اپنے گھر کھانے پر بلایا تو ان کے جانے کے بعد ان کی بیوی نے کہا

"Did you notice Yousaf.....the old man was trying to imitate you."

تو بات ہو رہی تھی لاہور میں ہماری شام کی محفلوں کی۔ اکثر ہم گلبرگ میں واقع ایک کوٹھی میں بھی جمع ہوتے تھے جو مصطفیٰ زیدی یا یوسف جمال میں سے کسی ایک نے دریافت کی تھی۔ اس کوٹھی کے مکین جن میں خواتین کی تعداد زیادہ تھی، بے حد خوش شکل، خوش مزاج اور پرکشش تھے۔ گھر میں اور حصوں کے علاوہ ایک کشادہ تہہ خانہ بھی تھا۔ اکثر محفل اسی تہہ خانے میں جمتی تھی۔ شام میں جب ہم وہاں جاتے تو اکثر قصور کے نوابزادے خضر حیات اور ان کے بھائی شیری بھی وہاں ملتے۔ ان دنوں یہ خاندان بھٹو صاحب کے جانثاروں میں سے تھا اور یہ سب نئی نئی قائم ہونے والی پیپلز پارٹی کے زبردست حمایتی تھے۔ ہماری اکثر شامیں اس گھر میں گزرتی تھیں جسے یوسف جمال اور میں تہہ خانے والوں کے نام سے پکارتے تھے۔

اس شام جس کا ذکر میں کرنے لگا ہوں، دوپہر کو یوسف جمال کا فون آیا کہ شام کو فیض صاحب آ رہے ہیں۔ فیض صاحب ان دنوں کراچی میں عبداللہ ہارون کالج سے منسلک تھے۔ یوسف نے کہا کہ شام کو فلیٹیز ہوٹل آ جاؤ کہ فیض صاحب وہیں قیام کریں گے۔ انہیں رات کو پاکستان ٹائمز کی یونین کے کسی مشاعرے کی صدارت کرنا ہے، لہٰذا ایسا کریں گے کہ مشاعرے میں جانے سے پہلے فیض صاحب کو تہہ خانے والوں کی طرف لے چلیں گے۔ پروگرام بے حد معقول تھا۔ میں فوراً راضی ہو گیا۔

شام کو جب میں فلیٹیز ہوٹل پہنچا تو فیض صاحب آ چکے تھے اور یوسف جمال کے ساتھ ہوٹل کے ریستوران میں بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر ہم بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ فیض صاحب کے کچھ اور ملنے والے بھی آ گئے۔ پھر درمیان میں ہوٹل کے فرنٹ ڈیسک سے فیض صاحب کے لیے یہ پیغام آیا کہ ان کے لیے ٹیلی فون ہے۔ وہ اٹھ کر گئے اور تھوڑی دیر بعد جب واپس آئے تو اس طرح جیسے نیند میں چل رہے ہوں۔ وہ بالکل خاموش اور پتھر کی طرح ساکت تھے۔ تھوڑی دیر ہم لوگوں کے پاس کھڑے رہے۔ پھر میز سے چابی اٹھا کر اپنے

کمرے کی طرف چل دیئے۔ میں اور یوسف حیران پریشان ان کے پیچھے ہو لیے۔ ہم نے بار بار دریافت کیا کہ فیض صاحب کس کا فون تھا؟ کیا خبر ہے؟ آپ ایک دم ایسے چپ کیوں ہو گئے ہیں؟ مگر وہ ہمارے کسی سوال کا جواب نہیں دے رہے تھے۔ دور خلاؤں میں خالی خالی نظروں سے تکتے وہ آہستہ آہستہ اپنے کمرے کی طرف چلتے گئے اور زیر لب کہتے رہے "آخر یہ کیسے ممکن ہے...... کیسے ہو سکتا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو اس نے مجھے ہاتھ ہلا کر الوداع کہا تھا۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے؟" ہم دونوں بضد رہے کہ وہ کچھ بتائیں لیکن فیض صاحب پر تو کچھ عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ واپس جا کر وہ بیڈ روم میں چلے گئے اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ ہم دونوں باہر سٹنگ روم میں بیٹھ گئے۔ کافی وقت گزر گیا۔ ہمیں پریشانی بھی تھی۔ آخر ہمت کر کے ہم نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے دروازہ کھولا اور آہستہ سے کہا "ہمیں تو کچھ پینے کے لیے منگوا دیں" ان کے چہرے سے صاف ظاہر تھا جیسے وہ روتے رہے ہیں۔ ہم دونوں نے پھر اصرار کیا کہ فیض صاحب بتائیں تو کیا ہوا؟ مگر وہ نہ بولے۔ تھوڑی دیر بعد بیرا جو مشروب لے کر آیا تھا' وہ بھی انہوں نے اندر کے کمرے میں ہی منگوا لیا اور ہم دونوں پھر اسی طرح انتظار میں بیٹھ گئے۔ ادھر مشاعرے کے منتظمین کی طرف سے گاڑی اور میزبانوں کا ایک نمائندہ بھی پہنچ چکے تھے۔ وہ آدمی بڑا بے چین تھا۔ مشاعرہ میں بڑی تاخیر ہو چکی تھی۔ آخر ہمت کر کے ایک بار ہم نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس بار فیض صاحب کا حال قدرے بہتر تھا۔ ہم نے کہا مشاعرے کے منتظمین نے آپ کو ساتھ لانے کے لیے کسی کو بھیجا ہے۔ گاڑی بھی بہت دیر سے آئی کھڑی ہے۔ فیض صاحب نے کچھ بڑی مجبوری اور بے بسی کے تاثرات کے ساتھ ہماری طرف دیکھا اور کہا "ہاں بھئی مشاعرہ تو ہے...... ابھی چلتے ہیں" تھوڑی دیر بعد وہ ہمارے ساتھ کار میں بیٹھ کر مشاعرہ گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں بھی وہ بار بار پھر یہی کہتے رہے "آخر یہ کیسے ممکن ہے...... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" مشاعرے کے پنڈال میں پہنچ کر استقبال کرنے والے فیض صاحب کو سٹیج پر لے گئے۔ میں اور یوسف جمال سامعین کی صفوں میں آ گئے۔ جہاں فیض صاحب کے بہت سے پرانے صحافی دوست بھی بیٹھے تھے۔ ان میں سے کسی نے ہم سے کہا "آپ لوگوں کا کمال ہے کہ فیض صاحب کو لے آئے ورنہ اس سانحہ کے بعد ہمیں تو بالکل امید نہیں تھی کہ وہ آئیں گے"

"کیسا سانحہ؟" یوسف جمال نے دریافت کیا۔ "آپ کو معلوم نہیں۔" ادھر سے جواب آیا۔ "آج شام کراچی میں لیڈی ڈاکٹر شوکت ہارون اچانک وفات پا گئیں۔" اوہ...... اب ہماری سمجھ میں سب کچھ آگیا۔ اسی شام کراچی ایئرپورٹ پر وہ انہیں الوداع کہنے آئی تھیں اور اس کے فوراً بعد دل کا دورہ پڑنے سے فوت ہو گئیں۔ ڈاکٹر شوکت ہارون کو فیض صاحب بہت عزیز رکھتے تھے۔ میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا مگر میرا خیال ہے کہ یہ اشعار فیض صاحب نے اسی شام فلیٹیز ہوٹل کے اس کمرے میں کہے جہاں انہوں نے تنہا خود کو کئی گھنٹوں کے لیے بند کر لیا تھا۔

چاند نکلے کسی جانب تیری رعنائی کا
رنگ بدلے کسی صورت شب تنہائی کا
دولت لب سے پھر اے خسرو شیریں دہناں
آج ارزاں ہو کوئی حرف شناسائی کا
صحن گلشن میں کبھی اے شہ شمشاد قداں
پھر نظر آئے سلیقہ تیری رعنائی کا
ایک بار اور مسیحائے دل دل زدگاں
کوئی وعدہ کوئی اقرار مسیحائی کا

فیض صاحب کو عربی، فارسی، اردو اور پنجابی شعراء کی شاعری سے حد درجہ شغف تھا۔ خاص طور پر غالب اور اقبال سے بے حد متاثر تھے۔ یہ بات مشہور تھی کہ جب فیض صاحب سے کسی نے ایک بار یہ کہا کہ آپ اس صدی کے اردو زبان کے سب سے بڑے شاعر ہیں تو انہوں نے یہ کہہ کر اس بات کو رد کر دیا کہ ہر صدی میں ایک ہی بڑا شاعر پیدا ہوتا ہے۔ اردو شاعری کے حوالے سے انیسویں صدی کا سب سے بڑا شاعر غالب تھا اور بیسویں صدی کا اقبال۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے تمام اساتذہ میں سب سے زیادہ مطالعہ ان دو شاعروں کا کیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ دیوان غالب ہمیشہ میرے سرہانے رکھا ہوتا ہے۔ مرزا ظفر الحسن نے کہ جن کا فیض صاحب کے ساتھ کراچی میں غالب لائبریری کے حوالے سے قریبی رابطہ رہا، اس حوالے سے لکھا ہے کہ فیض صاحب نے گفتگو کرتے ہوئے یہ کہا کہ "غالب کی مخصوص اچھائی یہ ہے کہ وہ ایک فرد نہیں، ایک نسل ہے۔ وہ چند دلچسپ لمحوں کا ترجمان

نہیں، ایک پورے دور کا نمائندہ ہے۔ غالب کے کلام پر ایک موہوم ہمہ گیر اداسی طاری ہے۔ اس اداسی میں ماضی کا غم ہے۔ حال سے بے اطمینانی ہے۔ انقلاب کی آرزو ہے۔ کچھ کرنے کی حسرت ہے۔ نہ کر سکنے کا دکھ ہے۔ ہم سب یونہی محسوس کرتے ہیں۔ ہم میں تقریباً ہر نوجوان کی ذہنی کیفیت یہی ہے اور یہی غالب کی مقبولیت کا بڑا راز ہے۔"

اور جہاں تک اقبال کا تعلق ہے جو نسبت فیض صاحب کو ان سے تھی، وہ اردو زبان کے کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔ دونوں کی جائے ولادت سیالکوٹ ہے۔ دونوں کے ابتدائی اساتذہ مشترک ہیں۔ دونوں لاہور کے گورنمنٹ کالج کے فارغ التحصیل ہیں۔ دونوں نے مستقل قیام کے لیے ایک ہی شہر لاہور کا انتخاب کیا اور فیض صاحب کے والد سے اقبال کے گہرے مراسم تھے۔ اقبال سے ان کی عقیدت اور اقبال کی شاعری کی عظمت کے اعتراف کے لیے ان کی یہ نظم ہی کافی ہے جو انہوں نے ان کی وفات پر کہی۔

آیا ہمارے دیس میں ایک خوش نوا فقیر
آیا اور اپنی دھن میں غزل خواں گزر گیا
سنسان راہیں خلق سے آباد ہو گئیں
ویران میکدوں کا نصیبہ سنور گیا
اب دور جا چکا ہے وہ شاہ گدا نما
اور پھر سے اپنے دیس کی راہیں اداس ہیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں مقیم ہے
اور اس کی لے سے سینکڑوں لذت شناس ہیں
اس گیت کے تمام محاسن ہیں لازوال
اس کا وفور اس کا خروش اس کا سوز و ساز
یہ گیت مثل شعلہ جوالہ تند و تیز
اس کی لپک سے باد فنا کا جگر فگار
جیسے چراغ وحشت صر صر سے بے خطر
یا شمع بزم صبح کی آمد سے بے خبر

1976ء میں جب ملک بھر میں علامہ اقبال کی ولادت کی صد سالہ تقریبات منعقد ہو

رہی تھیں، یہ سنا گیا کہ فیض صاحب ان کے فارسی کلام سے منتخب غزلوں کا اردو ترجمہ کر رہے ہیں۔ انہیں دنوں ایک روز راولپنڈی کلب میں احمد فراز اور میں، فیض صاحب کو گھیر کر بیٹھ گئے۔ ہمارا موقف یہ تھا کہ فیض صاحب چونکہ خود اتنے بڑے شاعر ہیں اور ایک طرح اقبال کے ہم پلہ ہیں، اس لیے ان کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے تخلیقی جوہر کو ترجموں کے کام میں ضائع کریں۔ پہلے تو فیض صاحب ہنسی مذاق میں ٹالتے رہے اور کہتے رہے بھئی آپ لوگ بالکل جاہل ہیں۔ آپ کو اندازہ نہیں، یہ کتنا بڑا کام ہے۔ پھر جب ہماری ضد جاری رہی اور ہم نے اصرار کیا کہ یہ ترجمے کا کام کوئی اور بھی کر سکتا ہے، آپ جیسے بلند مرتبہ شاعر کو یہ زیب نہیں دیتا تو وہ سنجیدہ ہو گئے اور یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ آپ ترجمہ کو کمتر قسم کا کام سمجھتے ہیں حالانکہ یہ طبعزاد تخلیق کی نسبت زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ آپ نے ابھی تک وہ ترجمے دیکھے تک نہیں ہیں اور فضول قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔ ہم ان کی بات سن کر خاموش ہو گئے۔ آخر میں انہوں نے کہا "بھئی اقبال کی اصل شاعری تو فارسی زبان میں ہے۔ یوں بھی پیام مشرق تو ہمارے مطلب کی شاعری کی کتاب ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ضرور ہونا چاہیے۔" پھر کچھ اور ذکر چل نکلا۔ اور پیام مشرق کے ترجمے کی بات ختم ہو گئی۔"

مگر ختم کہاں ہوئی۔ دو تین مہینوں کے بعد جب میں سرکاری دورے پر لاہور گیا تو ٹیلیویژن اسٹیشن پر فیض صاحب کا یہ پیغام ملا کہ میں شام کو ان سے ملوں اور کھانا بھی ساتھ کھاؤں۔ فیض صاحب کم ہی کسی کو کھانے پر مدعو کرتے تھے۔ اس لیے یہ خاصی حیرت ناک بات تھی۔ بہر حال شام کو ان کے داماد، سلیمہ کے شوہر اور میرے دوست شعیب ہاشمی کے ساتھ میں فیض صاحب کو ملنے ان کے ماڈل ٹاؤن والے گھر گیا۔ وہ سفید کرتے پاجامے میں ملبوس (فیض صاحب علی گڑھ کٹ کا پاجامہ اور کرتا پہنتے تھے۔ میں نے کبھی انہیں شلوار قمیص میں نہیں دیکھا۔) گھر کے باہر ٹہل رہے تھے۔ بڑی شفقت سے ملے۔ ہم دونوں کو اندر لے گئے اور پھر مجھے لابی میں بٹھا دیا جہاں پہلے سے ایک سینٹرل ٹیبل اور آمنے سامنے دو کرسیاں رکھی تھیں۔ شعیب کو کہا اب تم جاؤ، کھانے کے وقت آ جانا۔ جب وہ چلے گئے تو فیض صاحب اندر کمرے میں کچھ لینے گئے۔ اس اثنا میں ایلس آئیں، ان سے سلام دعا ہوئی اور تھوڑی ہی دیر بعد فیض صاحب ہاتھوں میں کاغذوں کا

پلندہ لیے کمرے سے بر آمد ہوئے۔ وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئے اور کاغذوں کا پلندہ درمیانی میز پر رکھ دیا۔ پھر انہوں نے کہا ”بھئی تم نے اور احمد فراز نے ایک روز ہم سے پیام مشرق کے ترجمے پر بات کی تھی ناں...... تو اب یہ مکمل ہو گیا ہے۔ میں نے صوفی تبسم سے اس کی نک سک بھی درست کرالی ہے۔“ میں ان کی بات سمجھ نہیں سکا اور خالی خالی نظروں سے ان کو دیکھتا رہا۔ وہ میری نگاہوں کے سوالیہ جواب کا مطلب سمجھ گئے اور کہنے لگے ”تو بھئی اب جب یہ کام ہو ہی گیا ہے تو ہم نے سوچا سب سے پہلے آپ ہی کو یہ ترجمے سنانا چاہئیں“ اس کے بعد وہ آرام آرام سے بڑا لطف لے لے کر اقبال کے فارسی کلام کے اردو ترجمے سناتے رہے۔ میں نے فیض صاحب سے خود ان کی زبانی کبھی اتنی دیر اور اتنے بہت سے شعر نہیں سنے تھے۔ جب کھانے کا وقت آیا تو شعیب ہاشمی آگئے۔ ہم تینوں نے ان کی کار میں جا کر ماڈل ٹاؤن کے ایک چھوٹے سے ریستوران میں بالٹی گوشت کھایا۔ میں نے دیکھا، چلتے ہوئے انہوں نے کاغذوں کا پلندہ اپنے ساتھ کار کی سیٹ پر رکھ لیا تھا۔ رات گئے جب میں ان سے رخصت ہونے لگا تو انہوں نے وہ پلندہ مجھے دیا اور کہا اب تم اقبال کے جشن ولادت کے سلسلہ میں مرتب کیے جانے والے پروگراموں میں یہ سلسلہ بھی شامل کر لو۔ میری تو جیسے عید ہو گئی۔ اگلے ہی روز میں نے لاہور ٹیلی ویژن کے پروگرام منیجر اختر وقار عظیم کو ترجموں کے یہ مسودات (یہ سب فوٹو کاپیاں تھیں جو شاید فیض صاحب نے پہلے ہی اسی غرض سے کرا کے رکھی تھیں کہ مجھے دے سکیں) دے دیئے اور جلد ہی ”پیام مشرق“ کے زیر عنوان لاہور مرکز سے موسیقی کے ایک ہفت روزہ پروگرام کی پیشکش شروع ہو گئی۔ ان ترجموں کو پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ واقعی اگر ایک بڑا شاعر دوسرے بڑے شاعر کے کلام کا ترجمہ کرے تو پھر معیار ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ ذرا دیکھیے۔

عاشق کے لیے یکساں کعبہ ہو کہ بت خانہ
یہ جلوت جانانہ وہ خلوت جانانہ
جبریل تو ادنیٰ سا ہے صید جنوں میرا
یزداں تہہ دام آئے اے ہمت مردانہ

☆......☆......☆

ہوس منزل لیلیٰ نہ تجھے ہے نہ مجھے
تاب سر گرمی صحرا نہ تجھے ہے نہ مجھے
میں بھی ساحل سے صدف چنتا رہا ہوں تو بھی
حاصل اک گوہر یکتا نہ تجھے ہے نہ مجھے

☆......☆......☆

آئے تربت پہ مری حلقہ کیے نوحہ گراں
دلبراں سیم تناں سروقداں گل بدناں
لا کوئی نغمہ جسے تیری زمیں پہچانے
بے خبر چھوڑ بھی دے طرز نوائے دگراں

فیض صاحب سنجیدہ صفت انسان تھے مگران کی سنجیدگی میں بھی ایک عجیب طرح کی خوشگواری اور آسودگی محسوس ہوتی تھی۔ وہ مسکراتے تو ہر وقت رہتے تھے مگر طنز و مزاح ان کی گفتگو میں شامل نہیں تھا۔ میرا ان کا تو رشتہ ہی بزرگی اور نیاز مندی کا تھا۔ ممکن ہے اپنے قریبی دوستوں اور ہم عمروں کی صحبت میں لطیفہ گوئی اور ہنسی ٹھٹھا کرتے ہوں یا شاید اپنے اہل خانہ کے ساتھ۔ میں نے کبھی سلیمہ، منیزہ یا شعیب ہاشمی سے پوچھا نہیں لیکن یہ بات میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک خوش مزاج آدمی تھے۔ نذاق اور تفریح کو دل سے پسند کرتے تھے اور گاہے بگاہے اس کا اظہار بھی کرتے تھے۔ میری بیوی کا نام صفیہ ہے مگر فیض صاحب جب بھی ان کو دیکھتے تو کہتے ''بھئی تم رضیہ یا صفیہ ہو۔'' آخر بار بار کے پوچھنے پر ایک بار جب وہ ہمارے گھر آئے ہوئے تھے اور انہوں نے پھر ہنس کر سوال کیا تو صفیہ نے کہا فیض صاحب میں آپ کو بارہا اپنا نام بتا چکی ہوں۔ اب اگر پھر کبھی آپ نے پوچھا تو میں خفا ہو جاؤں گی۔ وہ بہت ہنسے اور بولے بھئی ہمارا بار بار پوچھنا تمہیں برا لگتا ہے۔ یہی تو ہمیں اچھا لگتا ہے'' اسی طرح ایک بار ان کا فون آیا تو میرے بیٹے نے اٹھایا جس کی عمر ان دنوں دس بارہ برس کی ہو گی۔ اس نے ریسیور ہاتھ میں پکڑے زور سے آواز لگائی ''ابی فیض انکل فیض کا فون ہے'' جب میں نے ریسیور ہاتھ میں لیا تو دوسری طرف فیض صاحب بے تحاشا ہنس رہے تھے کہ بھئی یہ فیض انکل فیض تو کمال کی اصطلاح ہے۔

فیض صاحب بڑے حاضر دماغ انسان تھے۔ جب خوشگوار موڈ میں ہوں تو ایسا ایسا فقرہ کہتے تھے کہ انسان عش عش کر اٹھے۔ ایک ایسی ہی شام میرے حصہ میں آئی' جب فیض صاحب میرے گھر رات کے کھانے پر آئے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ پی ٹی وی میں ہمارے نئے نئے مقرر کردہ چیئر مین ہارون بخاری تھے جو پطرس صاحب کے بیٹے اور زیڈ اے بخاری کے بھتیجے تھے۔ اسی حوالے سے بات ان دونوں بزرگوں یعنی بخاری برادان پر چل نکلی۔ فیض صاحب بخاری برادران کی باتیں کرتے رہے۔ پطرس بخاری کی دانشوری اور طنز و مزاح والی تحریریں اور زیڈ اے بخاری کی اداکاری اور لطیفہ گوئی خاص موضوع تھا۔ چونکہ لطیفوں کی بات ہو رہی تھی تو ہارون بخاری صاحب نے کہا' میں بھی ایک لطیفہ سناؤں گا شاید اس طرح وہ اپنے باپ اور چچا سے اپنے حس مزاح اور فنکارانہ صلاحیتوں کے رشتے استوار کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہارون بخاری نے جو لطیفہ سنایا' وہ کچھ اس طرح سے تھا ''کسی جنگل میں ہاتھی سیر کے لیے نکلا۔ سامنے سے ایک چوہا آ رہا تھا۔ چوہے نے اس سے پہلے کبھی ہاتھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس عظیم الجثہ مخلوق کو دیکھ کر بڑا حیران ہوا اور اس سے پوچھا ''تو کون ہے......؟'' ہاتھی نے جواب دیا ''میں ہاتھی ہوں۔'' چوہے نے پھر سوال کیا۔ ''تو کہاں رہتا ہے؟'' جواب دیا ''اسی جنگل میں۔'' چوہے کی حیرت کم نہیں ہو رہی تھی۔ آخر کار ڈرتے ڈرتے اس نے سب سے اہم سوال کر ڈالا۔ ''تیری عمر کیا ہے؟'' ہاتھی نے جواب دیا۔ ''تین سال۔'' چوہا جواب سن کر دم دبا کر چپ چاپ ایک طرف کو چل دیا۔ تب ہاتھی نے اس کو روکا اور اس سے اس کا نام' اس کی رہائش وغیرہ کے بارے میں پوچھنے کے بعد آخری سوال کیا۔ ''اور تیری عمر کیا ہے؟'' چوہے نے گردن جھکا لی اور بولا ''عمر تو میری بھی تین سال ہی ہے مگر ذرا صحت کمزور ہے'' لطیفہ ختم ہوا مگر کچھ اس انداز سے سنایا گیا تھا کہ کوئی نہیں ہنسا۔ تب فیض صاحب کی آنکھوں میں شرارت آمیز چمک آئی اور ہارون بخاری کی طرف دیکھتے ہوئے بولے ''بھئی ہیں تو یہ بھی بخاری۔ پر ذرا صحت کمزور ہے''

فیض صاحب بہت ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے۔ مجھے ابھی تک کوئی ایسا ان کا جاننے والا دوست' عزیز' شاگرد یا ساتھی نہیں ملا جو یہ کہہ سکے کہ اس نے فیض صاحب کو کبھی غصے میں دیکھا ہو۔ ان کی شخصیت میں بڑا ٹھہراؤ تھا۔ وہ ہر حال میں بڑے پر سکون اور

باوقار نظر آتے تھے۔ یقینی بات ہے کہ ان کے دل پر بھی ہر طرح کی واردات گزرتی ہوگی۔ ایک شاعر ہونے کے ناطے وہ عام انسانوں کی نسبت یقیناً زیادہ حساس تھے مگر مجال ہے جو داخلی غم غصے اور فکرمندی کو انہوں نے اپنی ظاہری شخصیت پر کبھی حاوی آنے دیا ہو۔ ان کے چہرے پر ہمیشہ ایک مخصوص مسکراہٹ رہتی تھی اور جب وہ بات کرتے تھے تو ایسا اطمینان ظاہر ہوتا تھا کہ جیسے دنیا میں ان کے لیے مسائل کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ ان کی صلح پسند طبیعت، مطمئن رویہ اور پرسکون باتیں سن کر یہ ماننے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا کہ یہ اتنے بڑے ترقی پسند انقلابی اور باغی شاعر ہیں۔ یہ بات اس لیے اور بھی عجیب لگتی تھی کہ ان کا یہ رویہ دوسرے ترقی پسند اور انقلابیوں سے بالکل مختلف تھا۔ ایک قصہ اس سلسلے میں بڑا مشہور ہوا۔ ایک بار ان سے کسی نوجوان کامریڈ نے بہت مضطرب ہو کر پوچھا "فیض صاحب آخر انقلاب کب آئے گا" فیض صاحب مسکرائے اور اپنے مخصوص انداز میں بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ "بھئی آجائے گا۔ ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے۔" فیض صاحب کی شخصیت کو مقبول عام بنانے میں ان کی اعلیٰ درجہ کی شاعری کے علاوہ ان کی سادگی اور شیرینی کا بھی بڑا حصہ ہے۔ ان میں تکبر اور خود پسندی، بے جا انانیت کا شائبہ تک نہیں تھا۔ کسی کی دل آزاری کرنا، کوئی ایسی حرکت کرنا جو دوسروں کو ناگوار گزرے، کوئی ایسی بات کرنا جس سے ان کے رتبہ یا حیثیت کا اظہار ہو، ان کی سرشت ہی میں نہیں تھا۔ لحاظ اور مروت ان کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ مجھے یاد ہے ایک بار کسی محفل میں ان سے کسی نے پوچھا۔ "فیض صاحب یہ بعض اخبارات میں آپ کے خلاف بے سروپا الزامات اور تضحیک آمیز تحریریں شائع ہوتی ہیں۔ آخر آپ ان کی تردید کیوں نہیں کرتے؟" انہوں نے جواب دیا "بھئی اگر ان کا اخبار یہ سب شائع کرنے کی وجہ سے زیادہ بکتا ہے تو انہیں یہ کرنے دو۔ ہمارا کیا بگڑتا ہے۔"

ایک دن میں نے فیض صاحب سے کہا کہ آپ نے اپنی زندگی کس قدر سہل بنا رکھی ہے۔ پوچھا "کس طرح؟" میں نے کہا، آپ کبھی کسی سے کسی بات پر اختلاف ہی نہیں کرتے۔ مثلاً آپ یہاں بیٹھے ہیں، ابھی کوئی آجائے اور آپ سے کہے، فیض صاحب چلیے ذرا باہر چلتے ہیں۔ آپ فوراً اُٹھ کر کھڑے ہو جائیں گے۔ پھر دروازے پر کوئی اور مل جائے اور کہے، ابھی تھوڑی دیر تو اور بیٹھیے۔ آپ واپس آکر بیٹھ جائیں گے۔

اب آپ ہی بتائیے۔ آپ سے کوئی کس طرح جھگڑے اور کیوں خفا ہو'' سن کر ہنسنے لگے اور بڑے پیار سے کہا ''تم زیادہ گستاخ نہیں ہوتے جا رہے ہو''

اسی سلسلہ میں مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد ہے۔ کراچی میں کمال احمد رضوی نے فیض صاحب کو اپنے گھر کھانے پر بلایا ہوا تھا۔ میں اور برہان الدین حسن بھی مدعو تھے۔ جو کراچی ٹیلی ویژن کے جنرل منیجر تھے۔ کمال احمد رضوی ان دنوں بیچ لگژری ہوٹل کے قریب بوٹ کلب کو جانے والی سڑک پر ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ فیض صاحب لاہور سے آئے ہوئے تھے اور پی ای سی ایچ ایس میں کسی کے گھر قیام پذیر تھے۔ انتظام یہ تھا کہ عالمی شہرت یافتہ وائلین نواز امداد حسین جو پروفیسر سراج کے صاحبزادے تھے، فیض صاحب کو پک کریں گے اور اپنی کار میں کمال احمد رضوی کے یہاں لے کر آئیں گے۔ دعوت کے سارے مہمان آٹھ بجے ان کے گھر جمع ہو گئے مگر کافی وقت گزرنے کے باوجود نہ امداد آئے اور نہ فیض صاحب۔ دو ڈھائی گھنٹے کے جان لیوا انتظار کے بعد سب نے یہ جان لیا کہ وہ لوگ اب نہیں آئیں گے۔ بھوک سے سب کا برا حال تھا اور لفظوں میں اظہار کیے بغیر سارے ہی مہمان دل ہی دل میں فیض صاحب کو برا بھلا کہہ رہے تھے کہ حامی بھرنے کے باوجود غائب ہو گئے۔ جب گیارہ بجنے کو آئے تو کمال رضوی نے مجبور ہو کر کھانا لگوا دیا۔ عین اس وقت نیچے سے کمال کے کتے کے بھونکنے کی آواز آئی جس کا مطلب تھا کہ کوئی آیا ہے۔ کمال رضوی لپک کر نیچے گئے اور ذرا دیر بعد امداد حسین اور فیض صاحب کو ساتھ لیے واپس آئے۔ سب نے ایک ساتھ ان پر شکوے شکایات کی یلغار کر دی۔ آخر جب محفل ذرا پر سکون ہوئی تو فیض صاحب نے تاخیر کا سبب بتایا۔ کہنے لگے ''بھئی ہم تو وقت کے بہت پابند ہیں۔ اول تو امداد ہمیں لینے دیر سے آئے۔ پھر جب کار میں ہمیں بٹھا کر روانہ ہوئے اور ڈرگ روڈ پر آئے۔ (جسے اب شاہراہ فیصل کے نام سے جانا جاتا ہے) تو ہم نے ان سے کہا بھئی آپ تو مخالف سمت جا رہے ہیں۔ کمال احمد رضوی کے ہاں جانے کے لیے تو اس سڑک پر داہنے ہاتھ مڑ کر چلنا تھا مگر امداد نے اصرار کیا کہ وہ صحیح سمت جا رہے ہیں۔ ہم چپ ہو گئے۔ پھر جب کار ایئر پورٹ کے اسٹار گیٹ کے سامنے پہنچی تو انہیں احساس ہوا اور واپس لوٹے، اس طرح دیر ہو گئی۔'' کسی نے کہا فیض صاحب جب آپ کو معلوم تھا کہ

وہ غلط سمت میں جا رہے ہیں تو آپ نے انہیں روکا کیوں نہیں؟ کہنے لگے "بھئی ایک دفعہ کہہ تو دیا تھا' اب اگر وہ نہیں مانتے تو ہم کیا کرتے" اس بھولپن پر اور صاف گوئی پر لوگوں کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ اسلام آباد میں ہوا۔ 1984ء میں اسلام آباد کی ادبی تنظیم دائرہ کی جانب سے ایک تقریب منعقد ہوئی۔ یہ اسلام آباد میں ان کی کسی تقریب میں آخری شرکت تھی۔ اس تقریب کی ایک بڑی یادگار تصویر میرے پاس ہے جس میں' میں فیض صاحب اور صادقین کے درمیان بیٹھا ہوں۔ یہ تصویر میری اسٹڈی میں آویزاں ہے اور ہمیشہ میرے سامنے رہتی ہے اور چیزوں کے علاوہ اس جلسہ میں ڈاکٹر محبوب الحق نے فیض کی نظموں کے انگریزی ترجمے بھی پڑھ کر سنائے جو انہی دنوں کتابی صورت میں شائع ہوئے تھے۔ تقریب کے اختتام پر جب مہمان مشروبات کے لیے میزوں کی طرف گئے تو فیض صاحب کے ایک منہ چڑھے دوست نے جو مشہور نقاد بھی ہیں' ان سے کہا "فیض صاحب! ڈاکٹر محبوب الحق نے آپ کے شعروں کا کیسا خراب ترجمہ کیا ہے اور سنا ہے انہوں نے طباعت سے پہلے مسودہ آپ کو دکھایا بھی تھا تو پھر آپ نے اس کی اشاعت کی اجازت کیسے دیدی؟ فیض صاحب نے مسکرا کر کہا "ہاں بھئی ہم نے دیکھا تو تھا لیکن جب انہوں نے ترجمہ کر ہی لیا تھا تو ہم نے سوچا انہیں چھپوانے دیں۔ کچھ کہتے تو ان کی دل آزاری ہوتی"

فیض صاحب کی شخصیت کے ان تمام پہلوؤں کو ان کے قریبی دوست اور میرے محترم ڈاکٹر آفتاب احمد نے بیان کرتے ہوئے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے "ان کو کتابوں سے زیادہ انسانوں سے محبت تھی۔ میں نے انہیں کبھی کسی پر غصہ کرتے نہیں دیکھا۔ نفرت نام کی چیز سے وہ نا آشنا تھے۔ ان کو لوگ اچھے لگتے تھے۔ ہنستے کھیلتے لوگوں میں بیٹھ کر وہ واقعی بہت خوش رہتے تھے۔ وہ بہت کم افسردہ یا مغموم نظر آتے تھے۔ اس معاملے میں وہ بہت پرائیویٹ آدمی تھے۔ ذاتی دکھ کو وہ خود ہی جھیلتے تھے۔ برداشت اور صبر و سکون ان کی طبیعت کا خاصہ تھے۔ اپنی افسردہ دلی سے انجمن کو افسردہ نہیں کرتے تھے۔" آفتاب بھائی کے اس مختصر مگر نہایت جامع تبصرے کے باوجود میرا جی چاہتا ہے کہ اپنے مضمون کو اشفاق احمد کے ان فقروں پر ختم کروں جو انہوں نے فیض صاحب سے اپنے

نظریاتی اختلاف کے باوجود "ملامتی صوفی" کے زیر عنوان "شام شہریاراں" کے دیباچے میں لکھے "اگر فیض صاحب حضور سرور کائنات ﷺ کے زمانے میں ہوتے تو ان کے چہیتے غلاموں میں سے ہوتے۔ جب بھی کسی بدزبان' تند خو' بداندیش یہودی دکاندار کی دراز دستی کی خبر پہنچتی تو حضور ﷺ کبھی کبھی ضرور فرماتے "آج فیض کو بھیجو۔ یہ بھی دھیما ہے۔ صابر ہے' بردبار ہے۔ احتجاج نہیں کرتے' پتھر بھی کھا لیتا ہے۔ ہمارے مسلک پر عمل کرتا ہے۔"

زندگی کے آخری زمانے میں فیض صاحب سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ وہ اسلام آباد آتے تو میرا ان سے ملنا ضروری ہوتا۔ کبھی کسی ملنے والے کے گھر اور کبھی خود میرے گھر۔ اسلام آباد میں زیادہ تر ان کا قیام بیگم اقبال کے گھر ہوتا مگر ان کے پروگرام کی ترتیب اور تنظیم ان کے قریبی دوست ڈاکٹر ایوب مرزا کے ذمہ ہوتی تھی۔ ایوب مرزا سے میرے بھی دیرینہ روابط تھے اور اسی لیے ڈاکٹر صاحب کسی نہ کسی صورت فیض صاحب سے میری ملاقات کی کوئی نہ کوئی سبیل ضرور نکال لیتے۔ 1984ء کی ان آخری ملاقاتوں میں' میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ بجھے بجھے سے نظر آنے لگے تھے۔ ایک تو ڈاکٹروں کے بتائے ہوئے پرہیزوں کے سبب انہیں سگریٹ وغیرہ قطعی طور پر چھوڑنا پڑی۔ انہیں ایک خاص انداز سے سگریٹ پینے کی عادت تھی۔ جس طرح گفتگو کرتے ہوئے یا اپنا کلام سناتے ہوئے وہ لہجے کو تھوڑا جھٹکا سا دیا کرتے تھے۔ اسی طرح سگریٹ کے کش لینے اور سگریٹ کو انگلیوں میں دابنے میں بھی کچھ اسی طرح کا تاثر ملتا تھا۔ سگریٹ ترک کر دینے کے باوجود بھی ان کی انگلیاں کبھی کبھی اسی طرح حرکت کرنے لگتی تھیں جیسے ان میں سگریٹ دبا ہو۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ان کی شاعری میں بھی ایک عجیب سا حزن و ملال سرایت کرتا جا رہا تھا۔ مجھے لندن میں آخری بار افتخار عارف نے جو چند شعر ان کے سنائے' اس کے بعد سے مجھے جانے کیوں لگنے لگا تھا کہ بس چل چلاؤ کی گھڑی اب زیادہ دور نہیں ہے۔

حلقہ کیے بیٹھے رہو اک شمع کو یارو
کچھ روشنی باقی تو ہے ہر چند کہ کم ہے

تھک کر یونہی پل بھر کے لیے آنکھ لگی تھی
سو کر ہی نہ اٹھیں یہ ارادہ تو نہیں تھا

خاک رہ جاناں پر کچھ خوں تھا گرہ اپنا
اس فصل میں ممکن ہے یہ قرض اتر جائے

اجل کے ہاتھ کوئی آرہا ہے پروانہ
نہ جانے آج کی فہرست میں رقم کیا ہے

اور آخر پروانہ آگیا۔ اس اداس شام فیض صاحب اپنے چاہنے والوں کو غمگسار اور افسردہ دل چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ میں ان دنوں اسلام آباد کے ای سیون سیکٹر میں رہتا تھا۔ فیض صاحب بھی دو ایک بار اس گھر میں آچکے تھے۔ اس شام جب میں سورج غروب کے ذرا دیر بعد شام کی واک سے لوٹا تو میری بیوی صفیہ اور بچے کچھ حیران و پریشان سے گھر کی دہلیز پر کھڑے تھے۔ میرا ماتھا ٹھنکا کہ ضرور کوئی بری خبر ہے۔ صفیہ کو فیض صاحب سے میری محبت اور عقیدت کا بخوبی علم ہے۔ اس لیے اس نے ہزار پوچھنے پر بھی ایک دم مجھے کچھ نہیں بتایا۔ پھر اس لیے بھی کہ صرف دو ماہ قبل میری امی کا انتقال ہوا تھا اور ان کا صدمہ ابھی تک دل سے محو نہیں ہوا تھا۔ آخر یہ مشکل اس طرح آسان ہوئی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بول اٹھی' جانے کس نے فون اٹھایا اور پھر وہیں سے باآواز بلند مجھ سے پوچھا ''خالد سعید بٹ صاحب پوچھ رہے ہیں' کیا آپ ان کے ساتھ چلیں گے ......؟'' میں نے استفسار کیا کہ کہاں تو صفیہ نے بتایا کہ لاہور سے خبر آئی ہے کہ فیض صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ کل صبح ان کی تدفین ہے۔ میں جیسے سناٹے میں آگیا۔ جس کمرے میں' میں بیٹھا تھا وہاں سامنے والے صوفے پر فیض صاحب ایک دوپہر بیٹھے تھے۔ جب وہ ہمارے ہاں لنچ پر آئے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ پھر سے اس صوفہ پر آبیٹھے ہیں اور اپنے مخصوص انداز میں سگریٹ پیتے ہوئے مسکرا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں ''ٹھیک ہے بھئی تم کہا کرتے تھے ناں کہ آپ نے اپنی زندگی بڑی سہل بنالی ہے۔ کسی بات سے انکار ہی نہیں کرتے...... تو بس یہ ہوا۔ ہم سے موت کے فرشتہ نے آکر کہا کہ

چلو...... ہم نے کہا ٹھیک ہے بھئی۔ تم کہتے ہو تو چلے چلتے ہیں۔"

اگلے روز ماڈل ٹاؤن کے قبرستان میں انہیں دفنانے کے بعد جب میں مصلح الدین اور فرہاد زیدی گاڑی میں لاہور سے واپس اسلام آباد آرہے تھے تو سارے راستے ہم تینوں فیض صاحب کے شعر سناتے رہے...... اور کافی سفر کے بعد جب میں نے یہ شعر پڑھا تو پھر سب خاموش ہو گئے۔ پھر اسلام آباد تک ہم تینوں میں سے کسی نے ان کا کوئی شعر نہیں سنایا۔

اک گل کے مرجھانے پر کیا گلشن میں کہرام مچا
اک چہرہ کمھلا جانے سے کتنے دل ناشاد ہوئے
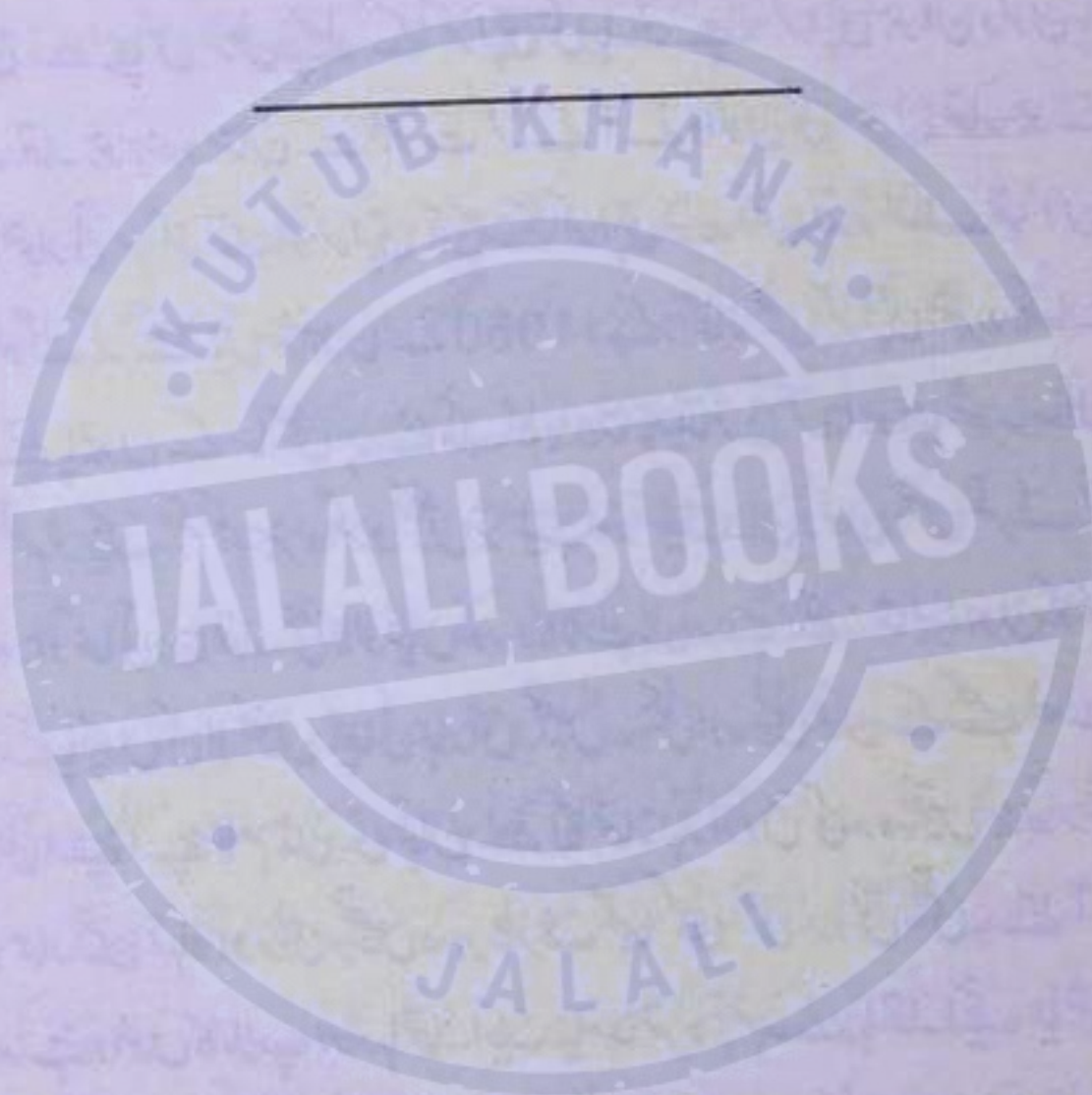
ذوالفقار علی بخاری

یہ آج سے پچاس سال پہلے کے کراچی کی بات ہے۔ کراچی جو ان دنوں پاکستان کا دارالحکومت تھا۔ جو ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والوں کی منزل تھا۔ جو نئے ملک کا ابھرتا ہوا نیا تجارتی مرکز تھا۔ وہ کراچی آج کے کراچی سے کس قدر مختلف تھا' اس کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے 1950ء کے آغاز میں کراچی شہر دیکھا ہے۔ بحیرہ عرب کے نیلے پانیوں کے ساحل پر نئے ملک کا بڑھتا پھیلتا ترقی کرتا ہوا نیا شہر۔ صاف شفاف سڑکیں، منظم ٹریفک، کم کم سبزہ مگر دلکش ترتیب اور سلیقہ۔ ان دنوں جس طرف نظر ڈالیں' کچھ نہ کچھ ہوتا دکھائی دیتا تھا۔ نئی کالونیاں اور مکانات بن رہے تھے۔ شاہراہوں کو کشادہ کیا جا رہا تھا۔ پانی کے پائپوں کی لائنیں بچھائی جا رہی تھیں۔ بجلی اور ٹیلی فون کے کھمبے نصب ہو رہے تھے۔ ہر کوئی اپنے اپنے کام میں جی جان سے لگا تھا۔ بازاروں کی رونقیں بڑھ رہی تھیں۔ دفتروں کی عمارتیں آباد ہو رہی تھیں۔ ہر طرف گہما گہمی تھی' رونق تھی۔ نئے آنے والوں اور پرانے رہنے والوں کا ملاپ ہو رہا تھا۔ ایک نیا معاشرہ جنم لے رہا تھا۔ ایک نیا شہر وجود پا رہا تھا۔ ان دنوں جس طرف بھی نظر ڈالو' ایک عجب سی مسرت' طمانیت اور حوصلہ مندی کا احساس ہوتا تھا۔ روشنیوں' خوشبوؤں' خوشیوں کی بستی جہاں ہمت والے لوگ رہتے تھے۔ جن کے چہرے عزم اور خلوص سے دمکتے تھے اور جن کا ہر عمل آنے والے روشن اور تابناک دور کی نوید دیتا تھا۔ اگرچہ بے شمار مسائل تھے اور شہر کے رہنے والوں کو ہر روز ہر لمحہ نئی نئی دشواریوں سے واسطہ پڑتا مگر ان کے ماتھوں پر شکن نہیں آتی تھی۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے مہاجر کراچی شہر کے پرانے باسی اور پاکستان کے دوسرے علاقوں سے نقل مکانی کر کے آنے والے لوگ سب ایک ہی جذبے اور ایک ہی لگن سے اپنے اپنے

کاموں میں مصروف تھے۔ نہ دلوں میں کدورتیں تھیں، نہ نفرتوں، منافقتوں اور مخالفتوں کے لیے کسی کے پاس وقت تھا۔ جن لوگوں نے اس زمانے کا کراچی دیکھا ہے، وہ خوش قسمت ہیں کہ انہوں نے ایک نئے شہر، ایک نئے معاشرے اور ایک نئے ملک کو اپنی آنکھوں سے تعمیر ہوتے دیکھا۔ اس زمانے میں جن چند شخصیات نے کراچی کی سماجی اور شہری زندگی میں بڑی اہمیت اور مقبولیت حاصل کی، ان میں مجید لاہوری، مولانا احتشام الحق تھانوی، خان بہادر حبیب اللہ، علامہ رشید ترابی، سروری عرفان اللہ وغیرہ کے علاوہ چند ایک سرکاری افسران بھی تھے جیسے ابو طالب نقوی کراچی شہر کے چیف کمشنر۔ ممتاز حسین نیشنل بینک آف پاکستان کے سربراہ۔ کموڈور خالد جمیل پاکستان نیوی کے ایک اعلیٰ افسر اور زیڈ اے بخاری ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل۔

میرا خیال ہے سارے ملک میں اس وقت شوبز کے شعبے میں بخاری صاحب کی ٹکر کا کوئی آدمی نہیں تھا۔ کراچی شہر کا ہر پڑھا لکھا شخص اور ہر وہ آدمی جس کا ادب، ثقافت، موسیقی یا نشریات سے کوئی تعلق تھا، بخاری صاحب کو پہچانتا تھا۔

میں نے بھی کئی بار انہیں دیکھا تھا۔ مشاعروں کی صدارت کرتے ہوئے، مجالس میں مرثیہ پڑھتے ہوئے اور کبھی کبھی ریڈیو پاکستان کے براڈکاسٹنگ ہاؤس کے صحن میں کار سے اترتے یا سوار ہوتے ہوئے۔ ایک طالب علم کی حیثیت سے ریڈیو پاکستان میرا آنا جانا تھا۔ جو ان دنوں کراچی کا سب سے اہم ثقافتی مرکز سمجھا جاتا تھا۔ میں سندھ مسلم کالج کا طالب علم تھا۔ کالج میں ادبی، ثقافتی اور ڈرامائی سرگرمیوں کے سبب ریڈیو تک میری رسائی ہوئی۔ جہاں میں یونیورسٹی میگزین کے پروگرام میں حصہ لیا کرتا تھا۔ یہ میری ریڈیو کی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز تھا۔ ریڈیو کی دنیا میرے لیے بے حد جاذب نظر تھی اور رفتہ رفتہ دل میں صرف ایک ہی تمنا پروان چڑھنے لگی کہ کسی نہ کسی صورت ریڈیو پاکستان میں ملازمت مل جائے اور آخر کار اس تمنا کی تکمیل کا وقت آ ہی گیا۔ یہ کہانی بڑی ڈرامائی نوعیت کی ہے۔ جس میں بخاری صاحب کا رول مرکزی تھا۔ 1955ء میں میں نے بی اے کا امتحان دیا تو اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ریڈیو پاکستان میں پروگرام پروڈیوسروں کی آسامیاں مشتہر ہوئیں۔ میں نے درخواست بھیج دی اور ایک ایک دن گن گن کر انٹرویو لیٹر کا انتظار کرنے لگا۔ کافی وقت گزر چکا تھا کہ ایک دن میرے بڑے بھائی شمیم جاوید نے بتایا کہ ان کی اطلاع کے

مطابق ریڈیو پاکستان میں پرسوں پروڈیوسروں کے انٹرویو ہو رہے ہیں۔ مجھ پر جیسے بجلی سی لرز پڑی۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ مجھے انٹرویو کے لیے نہیں بلایا گیا تھا۔ میں انتہائی افسردہ اور ملول ہوا۔ ذہن کی عجیب سی کیفیت تھی۔ اس روز سارا وقت میں چپ چاپ لیٹا رہا۔ کچھ کرنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ شام میں میرے دوست یونس رضوی آئے۔ انہوں نے اسٹوڈنٹ ویلفیئر آرگنائزیشن کے نام سے ایک انجمن بنائی ہوئی تھی جو غریب طالب علموں میں کتابیں تقسیم کیا کرتی تھی۔ میں ہر سال ان کی تقسیم کتب کی تقریب میں میزبانی کے فرائض انجام دیا کرتا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ اگلے روز تقریب ہے اور مجھے حسب روایت میزبان اناؤنسر کے فرائض انجام دینے ہیں۔ میرا موڈ بے حد خراب تھا اور طبیعت سخت افسردہ تھی' لہٰذا میں نے انکار کر دیا۔ میں نے مشورہ دیا کہ اس بار یہ کام کسی اور سے کرالیں۔ وہ بضد رہے اور کہنے لگے کہ ہم نے انوی ٹیشن کارڈ بھی چھپوا لیے ہیں جن میں سٹیج سیکرٹری کے طور پر آپ کا نام شامل ہے۔ انہوں نے اپنی فائل سے ایک دعوت نامہ نکال کر مجھے دکھایا۔ دعوت نامہ دیکھ کر میں چونک پڑا اور معاً ایک خیال میرے دل میں آیا اور میں نے یونس صاحب سے کہا کہ ٹھیک ہے میں کل شام کی تقریب میں آؤں گا۔ دعوت نامہ میں مہمان خصوصی کے طور پر ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل سید ذوالفقار علی بخاری کا نام لکھا تھا۔ اگلے روز میں وقت مقررہ پر تقریب میں شرکت کے لیے پہنچ گیا۔ حسب معمول طالب علموں کا اچھا خاصا ہجوم تھا جو مہمان خصوصی کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ بالکل صحیح وقت پر بخاری صاحب ایک بڑی سیاہ رنگ کی شیورلیٹ کار میں تشریف لائے۔ وہ نیلے رنگ کا دھاری دار سوٹ پہنے ہوئے تھے جس کے ساتھ گہرے سرخ رنگ کی ٹائی تھی۔ اس روز پہلی بار میں نے انہیں اتنے قریب سے دیکھا۔ بے حد پر شکوہ شخصیت' سرخ و سفید رنگ' لانبا قد' سر پر بہت گھنے کھچڑی بال' کچھ کچھ گھنگھریالے' چہرے پر شفقت اور رعب کا ملا جلا تاثر' نہایت خوبصورت اور کھرجدار آواز لیکن ان کی ساری شخصیت میں جو چیز انسان کی توجہ سب سے زیادہ اپنی طرف مبذول کراتی تھی' وہ ان کی موٹی موٹی گھنی بھنویں تھیں۔ (میرے ایک دوست حسیب احمد کہا کرتے تھے کہ بخاری صاحب اپنی بھنوؤں سے مونچھوں کا کام لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب غصہ میں ہوتے ہیں تو بھنوؤں کو تاؤ بھی دیتے ہیں) چونکہ اس تقریب میں منتظمین کی جانب سے سب سے زیادہ اہم آدمی

میں تھا' اس لیے میرا تعارف بطور خاص کرایا گیا۔ "یہ آغا ناصر ہیں جو آج کی تقریب میں میزبانی کے فرائض انجام دیں گے۔ آپ تو ضرور جانتے ہوں گے انہیں۔ یہ ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھتے ہیں اور پروگراموں میں صداکاری بھی کرتے ہیں۔" (چند ہفتہ پہلے ہی میرا پہلا ڈرامہ ریڈیو پاکستان کراچی کے مقبول پروگرام اسٹوڈیو نمبر نو میں نشر ہوا تھا اور سارے کالج میں دھوم تھی کہ میں ریڈیو کے ڈرامہ لکھنے والوں میں شامل ہوں) بخاری صاحب نے پہلے سر سے پاؤں تک مجھے غور سے دیکھا۔ پھر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ ذرا دیر بعد جب ہم سب کرسیوں پر بیٹھے تو میری نشست بخاری صاحب کے بالکل ساتھ تھی۔ انہوں نے بڑی شفقت سے پوچھا۔ "برخودار آپ ریڈیو میں کیا کیا کرتے ہیں؟" میں نے جواب دیا کہ ابتداء میں یونیورسٹی پروگرام میں حصہ لیا کرتا تھا لیکن اب جنرل پروگراموں کے لیے لکھنا شروع کر دیا ہے۔ انہوں نے رسماً پوچھا تو پھر یہ بتائیں ریڈیو کے پروگراموں میں آپ کو کیا کیا خامیاں نظر آتی ہیں؟ میں تو پہلے ہی جلا بیٹھا تھا۔ اس سوال نے مہمیز کا کام کیا اور میں بلا ادب لحاظ جو منہ میں آیا' کہتا چلا گیا۔ میں نے کہا ڈی جی صاحب آپ کے پروگرام غیر معیاری' غیر دلچسپ اور نہایت ناقص ہیں۔ ان میں کوئی تنوع نہیں ہے۔ آپ کے پروڈیوسروں میں تخلیقی صلاحیتوں کا فقدان ہے اور پروگراموں کی تریب و پیشکش کے لیے کوئی بھی عرق ریزی نہیں کرتا وغیرہ وغیرہ بخاری صاحب کے لیے میری باتیں بہت غیر متوقع تھیں۔ وہ حیرت سے مجھے دیکھتے رہے اور جب میری بات ختم ہوئی تو بڑی خوشدلی سے کہا "برخودار! بہت خفا معلوم ہوتے ہو۔ آخر بات کیا ہے؟" میں خاموش رہا تو انہوں نے پھر کہا "چلو میں تسلیم کرتا ہوں کہ جو کچھ تم نے کہا' سب صحیح ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ ان کمزوریوں اور برائیوں کو کس طرح دور کیا جا سکتا ہے؟" میں نے جواب دیا۔ "آپ ان خرابیوں کو دور کرنا ہی نہیں چاہتے۔ اس کے لیے نئے خون کی ضرورت ہے اور آپ کا محکمہ نئے لوگوں کو آزمانے کے لیے تیار نہیں ہے" "وہ کیسے؟ انہوں نے خشمگیں نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے دل کا سارا بوجھ اتار دیا اور بڑے اعتماد سے جواب دیا کہ میں اتنے عرصہ سے ریڈیو کے لیے کام کر رہا ہوں۔ میں نے پروگرام پروڈیوسر کی جاب کے لیے درخواست بھیجی تھی۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے انٹرویو کے لیے کل صبح امیدواروں کو بلایا ہوا ہے لیکن مجھے اس قابل بھی نہیں سمجھا گیا کہ انٹرویو میں بلاتے۔ بخاری صاحب

کے چہرے پر کچھ ایسے تاثرات پیدا ہوئے جیسے انہوں نے میری شکایت کو تسلیم کر لیا ہے۔ میری پیٹھ پر ہلکی سے تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ "آپ بھی کل انٹرویو کے لیے آجائیں۔ ہم آپ کو انٹرویو کریں گے۔"

اس کے بعد فنکشن شروع ہو گیا۔ میرے دل سے جیسے سارا بوجھ اتر گیا تھا اور نتیجتاً میں نے اس فنکشن کی بہت خوبصورت کمپیئرنگ کی جس کی تعریف بہت عرصہ بعد ایک دن بخاری صاحب نے بھی کی۔ چائے کے دوران بخاری صاحب انجمن کے اراکین سے مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہے اور میں دور کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔ ان کی شخصیت میں ایک عجیب طرح کی جاذبیت تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسا بارعب، جامع زیب، خوش گفتار اور سمارٹ شخص اس سے پہلے کوئی نہیں دیکھا تھا۔ جب وہ رخصت ہونے لگے تو ہم چند لوگ انہیں کار تک چھوڑنے گئے۔ وہ اپنی گاڑی خود چلا کر لائے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کے بعد انہوں نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کیا اور مجھے قریب بلا کر کہا "کل صبح نو بجے ریڈیو کے ہیڈ کوارٹر آجایئے گا اور میرے پرائیویٹ سیکرٹری سے مل لیجئے گا۔"

دوسرے دن میں وقت مقررہ پر 71 گارڈن روڈ پر واقع ڈائریکٹر جنرل کے دفتر میں پہنچا تو باہر لان میں بیس پچیس آدمی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ یہ سب امیدوار تھے جن کو انٹرویو کے لیے بلایا گیا تھا۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کس سے بخاری صاحب کے سیکرٹری کے دفتر کے بارے میں معلوم کروں کہ ایک گورے رنگ کا ذرا پستہ قد آدمی میرے پاس آیا اور مجھ سے پوچھا "آپ آغا ناصر ہیں؟" میں نے اثبات میں جواب دیا تو اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ "میرا نام سدن خان ہے۔ میں ڈی جی کا پرائیویٹ سیکرٹری ہوں۔ کل شام آپ کی بخاری صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے آپ کا نام امیدواروں کی فہرست میں شامل کرا دیا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنی فائل سے ایک چھوٹا سا لفافہ نکال کر مجھے تھما دیا۔ یہ انٹرویو لیٹر تھا۔ میں شکریہ ادا کر کے دوسرے امیدواروں کے ساتھ آکر بیٹھ گیا۔ کافی انتظار کے بعد میری باری آئی۔ میرا نام پکارا گیا اور میں انٹرویو کے لیے ڈی جی کے دفتر میں داخل ہوا۔ یہ ایک بہت بڑا کمرہ تھا۔ اتنا بڑا کہ جس دروازے سے میں داخل ہوا اس سے اس میز تک پہنچنے کے لیے بیس پچیس قدم کا فاصلہ تھا جہاں انٹرویو بورڈ کے ممبران تشریف فرما تھے۔ انٹرویو

بورڈ تین آدمیوں پر مشتمل تھا۔ درمیان میں بخاری صاحب پورے کروفر کے ساتھ بیٹھے تھے۔ سفید قمیص، سفید پتلون، گہری سرخ ٹائی ان کے قدموں میں ایک سیاہ رنگ کے جھبرے بالوں والا روسی کتا بیٹھا تھا۔ ان کے دائیں جانب رشید احمد صاحب بیٹھے تھے جو ان کے نائب تھے اور بائیں جانب ڈاکٹر امداد حسین تھے جو ان دنوں وزارت تعلیم میں نائب مشیر کے عہدے پر فائض تھے اور انہیں خاص طور پر انٹرویو بورڈ میں شامل کیا گیا تھا۔ میں اجازت لے کر سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ بخاری صاحب نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ دوسرے دو ممبران نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی۔ بخاری صاحب نے اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف یکے بعد دیگرے مسکراتے ہوئے دیکھا اور ان سے کہا "یہ برخوردار کل شام مجھے ایک فنکشن میں ملے تھے۔ انہوں نے وہاں مجھے سب کے سامنے بہت ڈانٹا۔" ڈاکٹر امداد حسین نے تو ان کی بات پر ہلکی سی مسکراہٹ دی مگر رشید صاحب بے حد سنجیدہ صورت بنائے اسی طرح بیٹھے رہے۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ بہت مشکل آدمی ہیں پھر انٹرویو شروع ہوا۔ زیادہ تر سوال خود بخاری صاحب نے پوچھے۔ میں بڑے اعتماد سے جواب دیتا رہا۔ انٹرویو ختم ہوتے ہوتے مجھے اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ میرا انٹرویو بہت اچھا ہوا ہے۔ ان کے تھینک یو کہنے کے بعد میں اپنی نشست سے اٹھا اور سلام کر کے جب جانے کے لیے مڑا تو معاً بخاری صاحب کی گرجدار آواز سن کر میرے قدم رک گئے۔ "سنو صاحبزادے!" میرے دل میں خوف کی لہر سی اٹھی، میں نے مڑ کر دیکھا۔ انہوں نے میرے چہرے پر اپنی نظریں پیوست کر دیں اور بڑی سنجیدگی سے بولے "آپ نے وہ اشتہار پڑھا تھا جس میں پروڈیوسروں کی پوسٹ کے لیے درخواستیں طلب کی گئی تھیں؟" میں نے خالی خالی نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہنے والے ہیں۔ "جی؟؟"

"آپ کو علم ہے اس پوسٹ کے لیے امیدواروں کے لیے گریجویٹ ہونا ضروری ہے؟ کیا آپ گریجویٹ ہیں؟" اور اچانک مجھے خیال آیا کہ میرا بی اے کا رزلٹ تو ابھی آیا ہی نہیں ہے اور اس طرح میں گریجویٹ ہونے کا دعویدار نہیں ہو سکتا۔

دراصل ہوا یوں تھا کہ بی اے کا امتحان دینے کے بعد جب پروڈیوسرز کی آسامیوں کے لیے درخواستیں طلب کی گئیں تو میں نے ریڈیو سے جوش محبت میں ملازمت کے لیے درخواست بھیج دی۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ مجھے یقین تھا کہ میں لازماً امتحان میں

کامیاب ہو جاؤں گا لیکن امر واقعہ تھا کہ میرے امتحان کا نتیجہ نہیں آیا تھا اور جب تک نتیجہ کا باضابطہ اعلان نہ ہو جائے' اس وقت تک میں گریجویٹ نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے حوصلہ سے کام لیا اور بظاہر بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ "اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے میں نے بی اے کا امتحان دیا ہے اور مجھے یقین ہے' میں ضرور پاس ہو جاؤں گا"۔ "اور اگر فرض کریں آپ پاس نہیں ہوئے؟" اس بار رشید احمد صاحب نے سنجیدگی کے ساتھ ذرا ترش لہجہ میں دریافت کیا۔ خدا جانے کہاں سے مجھ میں اتنی جرات آگئی تھی۔ میں نے برجستہ جواب دیا۔ "میں اس طرح کی باتیں فرض نہیں کیا کرتا"۔ انٹرویو بورڈ کے ممبروں میں سے کسی نے بھی اس کے بعد کچھ نہیں کہا۔ انٹرویو ختم ہو چکا تھا اور اب کمرے سے باہر نکلتے ہوئے مجھے پورا یقین تھا کہ میں اس انٹرویو میں ناکام ہو چکا ہوں۔ کئی دن میں غمزدہ اور بیزار بیزار سا رہا۔ ریڈیو کی نوکری نہ ملنے کے خود ساختہ غم کے علاوہ ایک عجیب سا احساس ندامت بھی تھا کہ غلطی خود میری تھی اور میں نے اس شام بخاری صاحب سے جو گفتگو کی' وہ نامناسب تھی مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب چند روز بعد مجھے ریڈیو سے اپنی تقرری کا خط موصول ہوا۔ پروڈیوسر کی پوسٹ کے لیے مجھے منتخب کر لیا گیا تھا۔ ہاں خط کے آخر میں ایک جملہ تھا "آپ کی تقرری بی اے کا امتحان پاس کرنے سے مشروط ہے۔" خدا کا شکر ہے یہ خط آنے سے پہلے میرا رزلٹ آ چکا تھا اور میں نے اچھے نمبروں سے بی اے پاس کر لیا تھا۔ بعد میں جب ملازمت کے دوران بخاری صاحب کی قربت نصیب ہوئی تو وہ اکثر محفلوں میں لوگوں کو یہ قصہ سنایا کرتے تھے کہ آغا ناصر نے ڈانٹ ڈپٹ کر کے یہ نوکری حاصل کی ہے۔

بخاری صاحب بے شمار صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ایک اعلیٰ پایہ کے شاعر' موسیقی کے استاد' نہایت باہنر اداکار اور معیاری ہدایتکار ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے ایڈمنسٹریٹر بھی تھے۔ حیرت ہوتی تھی کہ ایسا جمالیاتی ذوق اور فنکارانہ مزاج رکھنے والا انسان اتنا لائق منتظم اعلیٰ کس طرح بن گیا۔ عام طور پر فنکار اور شاعر قسم کے لوگ انتظامی امور میں بالکل صفر ہوتے ہیں مگر بخاری صاحب ایسے دبدبے والے افسر تھے کہ لوگ ان کا نام سن کر تھر تھر کانپنے لگتے تھے۔ انہوں نے جس بے سروسامانی میں پاکستان میں ریڈیو کے قیام اور اس کے فروغ کے لیے ناقابل فراموش خدمات انجام دیں' وہ تاریخ کا حصہ ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستان کے حصہ میں صرف تین ریڈیو اسٹیشن آئے تھے۔ ایک پشاور میں' دوسرا لاہور میں

اور تیسرا ڈھاکہ میں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا کے سارے صنعتی اور ترقی یافتہ ملک ابھی معاشی اور صنعتی مشکلات پر قابو پانے کی کوششوں میں سرگرداں تھے۔ بازار تکنیکی آلات اور ہر قسم کی مشینوں سے یکسر خالی تھے۔ اس نئے قائم شدہ ملک میں ریڈیو سٹیشنوں کا قیام اور نئے ٹرانسمیٹروں کی تنصیب ایک ناممکن العمل چیز معلوم ہوتی تھی مگر بخاری صاحب نے ایک ذہین اور زیرک منتظم اعلیٰ کی حیثیت سے حکومت کے اہم عہدیداروں کو راضی کیا اور پاکستان میں نشریات کی دنیا آباد کرنے کے لیے ایک بالکل نئی ترکیب نکالی۔ ان کے انجینئروں نے ملکوں ملکوں گھوم کر جنگ کے بچے کھچے ساز و سامان سے ایسے پرزے اور آلات ڈھونڈ نکالے جن کو جوڑ جوڑ کر اس نو آزاد مملکت میں قومی نشریات کی بنیادیں استوار کی گئیں۔ اس طرح کا سامان مغربی ممالک اور خاص طور پر امریکہ میں کباڑیوں کی دکانوں سے حاصل کیا گیا۔ بخاری صاحب نے اپنے اعتماد کے لائق فائق انجینئروں کو یہ سامان خریدنے کے لیے بیرون ملک بھیجا اور دیکھتے ہی دیکھتے مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان قومی نشریاتی رابطہ بھی قائم ہو گیا اور پاکستان کے عارضی دارالحکومت کراچی میں ایک چھوٹے سے ریڈیو اسٹیشن نے بھی کام کرنا شروع کر دیا۔ یہ تو صورتحال کا ایک رخ ہے۔ اسکے علاوہ انہیں اور بھی بہت سے کام کرنا تھے۔ پاکستان کی نئی نئی قائم ہونے والی براڈ کاسٹنگ سروس کے لیے موزوں اسٹاف کا انتخاب۔ خاص طور پر انجینئرز' پروڈیوسرز اور خبر کے شعبے میں کام کرنے والے لوگ۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ ریڈیو سروس چلانے کے لیے یہ شعبے کتنے اہم ہیں۔ چونکہ ملک مالی مشکلات کا شکار تھا۔ ہندوستان نے اثاثوں کی تقسیم اور فنڈز کی فراہمی میں مکاری کر کے پاکستان کا حق مار لیا تھا اور فنڈز کی دستیابی ایک بڑا سنگین مسئلہ تھا۔ پاکستان کی نئی نئی حکومت کے خزانے خالی تھے مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ صرف تین ریڈیو اسٹیشن اتنے بڑے ملک کے لیے ناکافی تھے۔ آلات اور مشینری کے علاوہ نئے ریڈیو اسٹیشنوں اور ٹرانسمیٹروں کی عمارتوں کے لیے زمین کے وسیع قطعات کی ضرورت بھی تھی اور اس کے لیے تگ و دو بھی سربراہ محکمہ کا ہی کام تھا۔ غرض اس موقع پر بخاری صاحب نے اپنی بے پناہ انتظامی صلاحیتوں کا ایسا بھرپور مظاہرہ کیا کہ بہت تھوڑے عرصے میں سارا نقشہ بدل گیا۔ میں تو 1955ء کے آخر میں ریڈیو پاکستان میں ملازم ہوا اور ابتدائی دور کے یہ سارے قصے اور مشکلات کی داستان میں نے دوسروں کی زبانی سنی ہیں مگر میں یہ بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ 1955ء

میں آزادی کے صرف آٹھ برس بعد جب میں نے بحیثیت پروڈیوسر اپنی ملازمت کا آغاز کیا تو اس وقت پاکستان کا ریڈیو کسی صورت بھی دنیا کے کسی ریڈیو نیٹ ورک سے کمتر نہیں تھا۔ کراچی میں انٹیلی جنس اسکول کے خیموں سے شروع ہونے والا ریڈیو اسٹیشن بندر روڈ پر چار پانچ برس پہلے منتقل ہو چکا تھا۔ بلدیات والوں کی اس پرانی عمارت کو بخاری صاحب اور ان کی ٹیم نے ایک ایسے شاندار براڈکاسٹنگ ہاؤس میں تبدیل کر دیا تھا کہ اس دور کے کراچی کی مشہور عمارتوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ بخاری صاحب کو کراچی کے براڈکاسٹنگ ہاؤس سے (جو ریڈیو والوں میں صرف بی ایچ کے نام سے پکارا جاتا تھا) بے حد محبت تھی۔ بہانے بہانے سے ایک دن میں کئی کئی چکر بی ایچ کے لگاتے تھے اور ہر چیز کا معائنہ بذات خود کرتے تھے۔ کبھی کینٹین میں کھانے پینے کی چیزیں ٹیسٹ کر رہے ہیں، کبھی لان میں گھاس اور پودوں کے متعلق ہدایات دے رہے ہیں اور اسٹوڈیوز تو ان کے نزدیک دنیا کی سب سے متبرک اور مقدس جگہ تھی۔ مجال ہے کہ اسٹوڈیو میں ریت کا ایک ذرہ یا لکڑی کا تنکہ پڑا نظر آجائے۔ صفائی کرنے والے صبح و شام دروازوں، شیشوں، فرنیچر اور قالینوں کی صفائی میں لگے رہتے۔ ہر کسی کو ہمہ وقت یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ جانے بخاری صاحب کب آجائیں اور کسی نے کام میں کوتاہی کی ہے تو اس کی سرزنش نہ ہو جائے۔ ان کے آنے کا خوف ہر وقت ہر گھڑی سب کو لگا رہتا تھا۔ پروڈیوسر ہوں یا انجینئر، ڈیوٹی آفیسر ہو یا اناؤنسر، دروازہ پر کھڑا اسٹوڈیو گارڈ ہو یا مین گیٹ پر ریسپشن کے کمرے میں موجود ریسپشنسٹ، ہر کوئی چوکنا اور ہوشیار رہتا تھا کہ وہ کسی بھی وقت آسکتے ہیں۔ صبح سویرے، دوپہر، شام یہاں تک کہ نصف شب کے بعد بھی۔ وہ خود کہا کرتے تھے کہ موت کا اور بخاری کا کوئی وقت مقرر نہیں۔

جب کبھی بخاری صاحب ملکی یا غیر ملکی دورے پر کچھ دن کے لیے کراچی سے باہر جاتے تو سب کی جیسے عید ہو جاتی۔ وہ جو ایک دھڑکا سا لگا ہوتا تھا، وہ چند روز کے لیے دور ہو جاتا تھا لیکن یہ خوشی عارضی ہوتی تھی۔ کچھ ہی دن بعد وہ لوٹ آتے اور پھر وہی ڈسپلن کی پابندیاں، اسٹوڈیو کے چمکتے فرش، صاف شفاف آئینے، میزوں پر رنگا رنگ تازہ پھولوں کے گلدستے، ستھرے کپڑوں میں ملبوس اسٹاف کے لوگ اور تعریف اور تنقید کے منتظر فنکار۔ بخاری صاحب کا تعلق سب سے تھا اور انہیں ہر ایک چیز کا خیال رہتا تھا۔ کسی کے لباس پر تنقید کرتے، کسی کی وضع قطع پر۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص ایسا نظر آتا جو بسور رہا ہو تو لطیفے سنا کر

اس کے چہرے پر بحالی لانے کی کوشش کرتے۔ کسی نے شیو نہ کیا ہو تو اس کو بہت ڈانٹتے۔ کہا کرتے تھے، کم کھاؤ مگر صاف ستھرے کپڑے پہنو۔ خود کو دیکھنے کے قابل بناؤ۔ یہ شو بز کا محکمہ ہے۔ ایک بار خود انہوں نے مجھے بتایا کہ اسٹاف کے سلیکشن میں خاص طور پر پروگرام پروڈیوسر کے انتخاب میں وہ علم و فضل، ذہانت اور تجربہ کے ساتھ ساتھ صورت شکل، لباس اور شخصیت کے نمبر بھی رکھتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ کئی ایسے لوگ جو بڑے عالم فاضل تھے اور بعد ازاں ملک کے مشہور دانشوروں میں شمار ہونے لگے تھے، بخاری صاحب کے ریڈیو پروڈیوسرز کے امتحان میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ ایک اچھے منتظم کی صلاحیتوں میں ایک بڑی صلاحیت اس کا دفتری کام بھی سمجھا جاتا ہے۔ بخاری صاحب کو ڈیسک ورک پسند تو نہیں تھا مگر یہ کام وہ انتہائی مہارت اور تیز رفتاری سے کرتے تھے۔ کبھی کبھی جب موڈ میں ہوتے تو اپنے ابتدائی وقت کے قصے سناتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ میں نے زندگی میں جتنی وضاحتیں دی ہیں اور جتنی جواب طلبیاں میری ہوئی ہیں، کسی اور کی ہوتیں تو وہ میدان چھوڑ جاتا۔ ان کی خود نوشت سوانح پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں ایسے کام کرنے کا بے حد شوق تھا جس سے سرکار اور اس کے افسران خفا ہوں لیکن ان کے یہ عمل ہمیشہ کسی نہ کسی مثبت کام کے لیے ہوتے تھے۔ مثلاً فنکاروں کی عزت اور تکریم کے لیے غیر منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق کی پاسداری کے لیے، اردو زبان کے فروغ کے لیے اور سب سے بڑھ کر نشریات کے پیشہ اور اس سے منسلک کارکنوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے وہ بے حد حوصلہ مند انسان تھے اور فیصلہ کرتے وقت جرات اور ایمانداری کے ساتھ حقائق اور پیشہ ورانہ ضرورتوں کو بھی مد نظر رکھتے۔ یہ خیال ہرگز نہیں کرتے تھے کہ اس فیصلہ کے نتائج کیا ہوں گے اور سرکار عالی مدار کے کون کون سے محکمے اور افسران اعلیٰ اس فیصلہ پر خفا ہوں گے۔ اپنی اسی جرات اور مثبت ضد کی بنا پر انہوں نے بڑے بڑے لوگوں کو اپنا دشمن بنالیا اور بڑی بڑی جنگیں لڑیں مگر کامیابی نے ہمیشہ ان کے قدم چومے۔

وہ آزادی سے قبل برطانوی ہند میں کوئی بہت بڑے افسر نہیں تھے مگر ان کی سرگزشت پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان کے معرکے ہمیشہ بڑے بڑے لوگوں سے رہتے تھے۔ سیکرٹری آف انڈیا اور وائسرائے ہند سے لے کر صوبائی گورنروں اور مرکزی حکومت کے سیکرٹریوں کے ساتھ ان کے تعلقات اور اختلافات آج کے زمانے میں بھی حیرت زدہ

کر دیتے ہیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ غلامی کے دور میں، انگریزی سرکار کے زمانے میں وہ یہ سب کچھ کیسے کر گزرتے تھے۔ محکمانہ چپقلشوں اور دفتری لکھت پڑھت کا ذکر کرتے ہوئے ایک دفعہ انہوں نے بڑا دلچسپ قصہ سنایا۔ کہنے لگے افسران بالا سے میرے تعلقات کا یہ عالم تھا کہ دہلی ریڈیو کے اسٹیشن ڈائریکٹر سیٹھنا نے ایک بار خفا ہو کر ایک دن میں میری چونتیس جواب طلبیاں کیں۔ ظاہر ہے کہ اس دن کوئی اور کام کرنے کا تو وقت ہی نہیں ملا۔ بس پورا دن کیفیتیں لکھنے میں گزر گیا۔ ایک جواب طلبی کا سبب بہت ہی دلچسپ تھا۔ میرے نام جو مراسلہ اسٹیشن ڈائریکٹر کی طرف سے آیا، اس میں اس بات کی جواب طلبی کی گئی تھی کہ کل رات نو بجکر دس منٹ پر اسٹوڈیو نمبر چار کا دروازہ کیوں کھلا ہوا تھا؟ میں نے اس کا جو جواب لکھا، وہ یہ تھا کہ حضور عالی کل رات نو بجکر دس منٹ پر اسٹوڈیو نمبر چار کا دروازہ اس لیے کھلا ہوا تھا کہ کسی نے اسے بند نہیں کیا تھا۔ صرف افسران بالا اور سرکاری عہدیداروں تک یہ قصے محدود نہ تھے۔ انہیں انتظامی امور سے اتنی زیادہ واقفیت تھی کہ وہ بڑے بڑے سیاسی رہنماؤں، سماجی نیتاؤں اور دیگر سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کے کرتا دھرتاؤں سے بھی آئے دن الجھتے رہتے تھے۔ وہ کسی کے ایسے مطالبات کو تسلیم کرنے کے لیے ہرگز تیار نہ ہوتے تھے جو قانونی یا انتظامی طور پر ناجائز ہوتے۔ ایسے بہت سے قصے ہیں جن میں برطانوی ہند کے سب سے بڑے انگریزی اخبار ٹائمز آف انڈیا کے ایڈیٹر فرانس لو، رائٹر نیوز ایجنسی کے سربراہ جان ٹرنر، ہندو سیاسی نیتا مرار جی ڈیسائی کے ایم منشی، سردار پٹیل وغیرہ کے اصرار کے باوجود بخاری صاحب ان کی بات ماننے کو تیار نہیں ہوئے۔ اپنی بات پر ڈٹ جانا اور انتظامی امور میں کسی کی مداخلت برداشت نہ کرنے کی پالیسی انہوں نے پاکستان میں بھی اپنائے رکھی بلکہ ان کا حوصلہ اور جرات کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی کہ اب وہ قومی نشریات کے ادارے کے ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر فائز تھے۔

بخاری صاحب کی پسند ناپسند میں شدت ہوتی تھی۔ ان کے دوست، شناسا، دفتری ساتھی اور ملنے والے تین گروہوں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں۔ پہلا گروہ وہ جن کو بخاری صاحب پسند نہیں کرتے تھے، دوسرے وہ جن کو وہ بے حد عزیز رکھتے تھے۔ تیسری قسم ایسے لوگوں کی تھی اور ان کی تعداد سب سے زیادہ تھی جن کو بخاری صاحب بے حد عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، ان کی لیاقت اور کارکردگی کے معترف تھے مگر انہیں اپنے دوستوں کے حلقے

میں شامل کرنے کو تیار نہیں تھے۔ وہ ایسے لوگوں کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں اور علم و فضل کے قائل تو ہوتے مگر ان کو اپنے "انر سرکل" میں جگہ نہیں دیتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب پاکستان کا پہلا دستور نافذ ہوا اور 23 مارچ 1956ء کو سکندر مرزا نے کراچی کے گورنر جنرل ہاؤس کے دربار حال میں پہلے صدر کی حیثیت سے حلف اٹھایا تو اس دن سارے کراچی شہر میں جشن کا سا سماں تھا۔ لگتا تھا قوم آج صحیح معنوں میں آزاد ہوئی ہے کہ اب مملکت کا سربراہ تخت برطانیہ کے ماتحت نہیں رہا۔ اس روز ریڈیو پاکستان نے پورے دن خصوصی پروگرام نشر کیے۔ قومی نغمے اور ملی ترانے بطور خاص اس موقع کے لیے ریکارڈ کیے گئے اور سارے شہر میں اہم مقامات پر لاؤڈ سپیکروں کا انتظام کیا گیا تاکہ ریڈیو کے پروگرام عام شہریوں کے لیے ریلے کیے جا سکیں۔ 23 مارچ 1956ء کا دن تھا، میں سارا دن آؤٹ سائیڈ براڈکاسٹ کے پروگراموں میں مصروف رہا تھا جن میں صدر کی حلف وفاداری کی تقریب اور افواج پاکستان کی پریڈ بھی شامل تھے۔ عام شہریوں کے تاثرات پر مبنی خصوصی پروگرام کے لیے میں پوری شام شہر کے مختلف علاقوں میں گھومتا رہا تھا۔ رات گئے یہ آخری پروگرام نشر کرنے کے بعد جب میں تھکا ہارا اسٹوڈیو سے نکلا تو ڈیوٹی آفیسر نے بتایا کہ بخاری صاحب کا فون آیا تھا۔ آپ کے لیے پیغام ہے کہ ٹھہرے رہیں۔ میں بے حد تھکا ہوا تھا مگر ڈائریکٹر جنرل کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ بخاری صاحب کو اپنی تھکن اور دن بھر کی مصروفیت کا حال سنا کر اجازت لے کر چلا جاؤں۔ جب میں خود کو تسلیاں دیتا ہوا سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا تو بی ایچ کے کھلے صحن میں بخاری صاحب کھڑے تھے اور ان کے گرد ریڈیو کے چند اور لوگ بھی تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے بڑی شفقت سے اپنے پاس بلایا اور میرے پروگرام کی تعریف کی۔ میں نے دن بھر کی محنت مشقت اور سخت مصروفیت کا ذکر کیا تو کہا۔ ہاں مجھے علم ہے۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ پھر انہوں نے اپنی کار کا دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کے بعد ایک ایک کر کے تین چار آدمیوں کو کار میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ناصر جہاں چلو بیٹھو۔ آغا ناصر تم آؤ، ماجد تم بھی پیچھے بیٹھو۔ اور پھر باقی لوگوں کو جو باہر کھڑے رہ گئے تھے، ہاتھ ہلا کر سلام کیا اور گاڑی موڑتے ہوئے کہا "تم سب نے آج بڑی محنت کی ہے۔ ہم تم کو کیفے ٹیریا میں کھانا کھلائیں گے۔ پھر شہر کی سیر کریں گے اور ریڈیو سے نشر ہونے والے ترانے

لاؤڈ سپیکروں پر سنیں گے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پروگراموں کے انچارج اسسٹنٹ ڈائریکٹر کا نام لیا کہ وہ بھی اپنے کمرے میں بیٹھے ہیں اور آج سارا دن انہوں نے خصوصی پروگراموں کی نگہداشت میں گزارا ہے۔ ان کو بھی ساتھ لے لیں۔ بخاری صاحب نے گاڑی موڑتے موڑتے ایک دم بریک لگائی۔ میری طرف گھور کر دیکھا اور اپنے ساتھ کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ناصر جہاں سے کہا۔ "ناصر یہ تمہارے ہم نام دوست ابھی تک ہمارے مزاج کو نہیں سمجھ سکے" اور پھر مڑ کر مجھ سے کہا "ارے برخوردار مجھے معلوم ہے' وہ محنتی آدمی ہے مگر وہ اپنی پارٹی کا آدمی نہیں ہے۔" رفتہ رفتہ مجھے پتہ لگ گیا کہ ان کی پارٹی کے آدمی کون ہیں اور یہ مرتبہ حاصل کرنے کے لیے انسان میں کیا کیا خصوصیات اور وصف ہونے چاہئیں۔ خوش شکل' خوش لباس' خوش بیان اور خوش مزاج ہونا ان کے حلقہ احباب میں داخلے کی پہلی چند شرائط تھیں۔ ان کے حلقہ احباب میں پاکستان بننے سے پہلے اور بعد جو لوگ شامل رہے' بخاری صاحب بہت ہی محبت اور شفقت سے ان کا ذکر کرتے تھے۔ قبل از آزادی کے دوستوں میں میں نے اکثر ان کو جن لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے سنا' ان میں تنویر حبیب' ڈنکر راؤ' مہرا مسانی' رفعت سروش' بلراج ساہانی' راجکماری بندرا' نذیر احمد اور سب سے بڑھ کر آل انڈیا ریڈیو کے پہلے انگریز ڈائریکٹر جنرل فیلڈن جو نہ صرف ان کے افسر بلکہ بہت قریبی دوست بھی تھے۔ یہ سارے وہ لوگ ہیں جنہوں نے آئندہ زندگی میں شاعری' فلم' تھیٹر اور براڈکاسٹنگ کے شعبوں میں بڑا نام کمایا اور اوج کمال تک پہنچے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے شہرت کے بام عروج پر پہنچنے میں بخاری صاحب کی صحبت کا بھی بڑا دخل رہا ہو گا۔

بخاری صاحب کی زندگی کا ایک نمایاں پہلو ان کی مشرقیت تھی۔ دفتر میں' افسری شان و شکوہ بالکل انگریز کے انداز کی ویسا ہی کروفر' وہی رعب داب وہی دفتری ڈسپلن مگر ذاتی زندگی میں مشرقی تہذیب کا اعلیٰ ترین نمونہ۔ خدا جانے برصغیر کی تہذیب و تمدن کے سارے عوامل انہوں نے کہاں کہاں سے جمع کیے تھے۔ پشاور کے رہنے والے مگر نشست و برخاست اور سلام و بندگی بالکل لکھنو والوں جیسی۔ خوش خلقی اور بے تکلفی جو پنجاب کے رہنے والوں کا خاصہ ہے' میزبانی اور مہمانداری اپنے وطن مالوف یعنی پشاور کی سوغات۔ غرض کوئی وصف' کوئی کمال ہمارے مسلم ہند کی تہذیب کا ایسا نہ تھا جو ان میں نہ پایا جاتا ہو۔ پشتو' ہندکو' پنجابی' بنگالی اور

انگریزی بڑی روانی سے بولتے تھے۔ اردو سے تو انہیں والہانہ عشق تھا۔ انہوں نے کسی یونیورسٹی سے ڈگری نہیں لی تھی مگر زبان دانی میں ایسے طاق کہ بڑے بڑے اساتذہ اور اہل علم ان کے آگے ہیچ تھے۔ فیض صاحب کہا کرتے تھے کہ زبان و عروض کے معاملے میں کوئی گڑبڑ ہو جائے تو بخاری صاحب ایک دم ٹوک دیتے ہیں اور ہمیشہ صحیح ٹوکتے ہیں۔ اردو تلفظ کے ایسے ماہر کے کسی کو غلط تلفظ سے ریڈیو پر بولتے سن لیتے تو اسی وقت فون کر کے اصلاح کرتے اور متعلقہ آدمی کو خوب ڈانٹ پلاتے۔ اب تو سن کر یقین بھی نہیں آتا مگر ان کے زمانے میں ریڈیو پاکستان کے ہر اسٹیشن پر تلفظ چیک کرنے والوں کی باقاعدہ آسامیاں تھیں۔ کراچی ریڈیو پر ان آسامیوں پر مشہور شاعر ارم لکھنوی اور شمس زبیری ملازم تھے۔

اب زبان و ادب کا ذکر چل نکلا ہے تو بخاری صاحب کی شخصیت کے اس پہلو پر کچھ بات ہو جائے۔ بخاری صاحب خود اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے۔ ان کی شاعری بڑی مرصع اور پر کیف ہے۔ ان کے اشعار شیرینی، سادگی اور زبان کی سحر انگیزی سے پر ہوتے ہیں۔ اسلوب کی رعنائی اور عبارت کی زیبائی ان کا خاص وصف ہے۔ جن دنوں کا میں ذکر کر رہا ہوں، ان دنوں کراچی کی معاشرتی زندگی میں مشاعروں کا بہت رواج تھا۔ بڑی تعداد میں چھوٹے بڑے مشاعرے سارے شہر میں منعقد ہوتے رہتے تھے۔ کالجوں میں، سکولوں میں، ادبی انجمنوں کے زیر اہتمام اور خود ریڈیو پاکستان کے پروگراموں میں مشاعرہ کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ بخاری صاحب نہ صرف اچھی غزل کہتے تھے بلکہ ان کے پڑھنے کا انداز بھی ایسا دلکش تھا کہ بس جی چاہتا تھا، وہ شعر سناتے ہی رہیں۔ خوبصورت آواز، خوبصورت انداز اور خوبصورت کلام۔ غرض جس محفل میں بھی شریک ہوتے، مشاعرہ لوٹ لیتے۔ ان کی دو چار غزلیں تو زبان زد عام تھیں اور جیسے ہی وہ اپنا کلام سنانے مائیکروفون کے سامنے آتے سامعین کی طرف سے پکار شروع ہو جاتی "رات گزرنے والی ہے......" اور بخاری صاحب کو وعدہ کرنا پڑتا کہ کچھ نیا کلام سنانے کے بعد وہ یہ غزل ضرور سنائیں گے جس کے یہ چند شعر ان دنوں بے حد مقبول تھے۔

اب کوئی نہیں سناٹا ہے، تاروں کی نگاہیں جھکی ہیں
چل ساتھ مرے دو گام کہ ساقی رات گزرنے والی ہے
اک جام کے بدلے ہوش و خرد یہ سودا مہنگا سودا ہے
پر کون چکائے دام کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

یہ برہم ہونے والی محفل یوں بھی برہم ہو جاتی
ہم کہہ کے ہوئے بدنام کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

کہتے ہیں جب پہلی بار یہ غزل بخاری صاحب نے اپنے گھر پر چند شاعر دوستوں کی موجودگی میں سنائی تو بے حد داد ملی مگر کسی من چلے نے بخاری صاحب کو آزمائش میں ڈالنے کے لیے کہا کہ ہم تو جب مانیں گے اگر آپ شام کی ردیف استعمال کر کے دکھائیں۔ ظاہر ہے جس غزل کا قافیہ رات گزرنے والی ہے ہو' اس زمین میں ایسا شعر نکالنا "شام کہ ساقی رات گزرنے والی ہے" بالکل ناممکن نظر آتا ہے مگر بخاری صاحب نے یہ چیلنج قبول کیا اور چند ہی روز بعد ان سارے احباب کو جو اس روز موجود تھے' گھر پر مدعو کیا اور یہ شعر سنایا۔

خورشید کو جام سے شرمائیں گے شام کو تیرا وعدہ تھا
ایفائے عہد شام کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

اس غزل کے علاوہ ایک اور غزل کی بھی مشاعروں میں فرمائش کی جاتی تھی۔ خود بخاری صاحب کو اپنی یہ غزل بہت پسند تھی۔

دہر مرگ ساماں میں زندگی غنیمت ہے
زیست کا مزہ کیسا زیست ہی غنیمت ہے
ریگ بے وفائی میں میری آنکھ پرنم ہے
ایسے گرم صحرا میں یہ نمی غنیمت ہے
موت بھی نہیں ملتی عاشقوں کو بن مانگے
بے کسوں کو یار اے خودکشی غنیمت ہے

کبھی کبھی وہ سید ناصر جہاں سے کہ جن کی آواز بے حد میٹھی تھی' اپنے شعر ترنم سے سنا کرتے تھے۔ عام طور پر ایسی فرمائش رات گئے اس وقت کرتے تھے جب ہمیں گھر چھوڑنے کے لیے کار میں نکلے ہوں۔ یہ تین اشعار جو ان کا کہنا تھا' وہ اپنے دوست حبیب تنویر سے بھی سنا کرتے تھے۔ گاہے بگاہے ناصر جہاں کو بھی سنانے کی فرمائش کرتے۔

آج رہ رہ کر طبیعت مری گھبراتی ہے
نہ تصور کوئی بندھتا ہے نہ نیند آتی ہے

قہر ہوتا ہے کسی بزم میں پینا مجھ کو
ایک بھولی ہوئی عزلت ہے کہ یاد آتی ہے
بارہا دیکھا کہ حافظ کی غزل کی مستی
اے غزل خواں تیری آنکھوں میں اتر آتی ہے

جب ایوب خان کا مارشل لاء لگا اور اس کے کچھ عرصے بعد بخاری صاحب کو ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا تو ان کی شاعری پر بھی اس دور کا اثر نظر آنے لگا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے انہیں دنوں کے جی گراونڈ کراچی میں ایک بڑا مشاعرہ ہوا جس میں پاکستان اور ہندوستان کے مشاہیر شعراء نے شرکت کی۔ اس مشاعرے میں بخاری صاحب نے جو غزل پڑھی' اس نے ہم سب کو مصیبت میں ڈال دیا۔ ذرا سوچیے مارشل لاء کے کڑے دور میں ان اشعار کو کیسے نشر کیا جا سکتا تھا۔

ہیں طائران چمن قید آشیانے میں
مگر یہ بات کہے کون اس زمانے میں
اڑوں کہاں کہ ہوا میں بھی جال پھیلے ہیں
میں پر سمیٹ کے بیٹھا ہوں آشیانے میں
نہ میکدہ ہی سلامت نہ خانقاہ محفوظ
شراب مل نہ سکے جب شراب خانے میں

ریکارڈنگ تو ہو گئی مگر اب مسئلہ یہ تھا کہ "قابل اعتراض" اشعار کو سنسر کرنے کی کسی میں بھی ہمت نہ تھی۔ کم از کم ریڈیو اسٹیشن پر تو مجھ جیسے جونیئر پروڈیوسر سے لے کر سینئر ترین ریجنل ڈائریکٹر تک کوئی اس کے لیے تیار نہیں تھا کہ سابق ڈائریکٹر جنرل کی غزل پر سنسر کی قینچی چلائی جائے۔ سخت پریشانی کا عالم تھا۔ کسی نے مشورہ دیا کہ صرف موجودہ ڈی جی ہی ان سے اجازت لے سکتا ہے' لہٰذا رشید احمد صاحب سے کہ جو ڈی جی ہونے کے علاوہ بخاری صاحب کے پرانے ساتھی اور دوست بھی تھے' درخواست کی گئی کہ وہ بخاری صاحب سے بات کریں۔ انہوں نے بات کی اور اس کا علم مجھے اس طرح ہوا کہ ایک دوپہر دفتر میں مجھے پیغام ملا کہ بخاری صاحب مجھ سے فون پر بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے فون کیا کہ اب بے تحاشہ ڈانٹ پڑے گی مگر ادھر تو انداز ہی کچھ اور تھا۔ بخاری صاحب نے

ہنستے ہوئے مجھ سے کہا کہ اتنی چھوٹی سی بات کے لیے ڈی جی سے کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ تم مجھے خود ٹیلی فون کر کے بتا سکتے تھے۔ میرے لیے بالکل عجیب بات تھی ورنہ کسی بھی پروگرام میں چاہے' وہ تقریر ہو' شاعر کا کلام ہو' ڈرامہ یا فیچر ہو' جب بھی کچھ سنسر کیا جاتا تو لکھنے والے بے حد ناراضگی کا اظہار کرتے لیکن بخاری صاحب کا تو رویہ ہی کچھ اور تھا۔ کہنے لگے "میں نے برس ہا برس ریڈیو کی ملازمت کی ہے۔ مجھے علم ہے ہر پروگرام جو نشر ہوتا ہے' اسے پہلے پرکھا اور سنا جاتا ہے اور اگر کوئی بات سرکار کی پالیسی سے متصادم ہو تو وہ نکال دی جاتی ہے' لہٰذا آپ لوگوں کو پوری اجازت ہے کہ میرے کلام سے جتنا کچھ چاہیں' پالیسی کے نقطہ نظر سے نکال دیں مگر جان عزیز ذرا یہ خیال رکھنا میرا کلام بے ربط اور بے مزہ نہ ہو جائے۔ یہ شاعری میری عمر بھر کی کمائی ہے اور سرکاری ملازمت کی طرح میں اس سے کبھی ریٹائر ہونے والا نہیں ہوں" ان کے آخری فقرے کی پاسداری کرتے ہوئے میں نے ایڈیٹنگ میں ہلکا ہاتھ رکھا اور صرف ایک شعر نکالا۔ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے بخاری صاحب نے ریڈیو میں کام کرنے والوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ ایک وہ جو ان کو بہت عزیز تھے جن سے وہ بے حد محبت کرتے تھے۔ دوسرے وہ جن کی وہ حد درجہ عزت کرتے تھے اور ان کے علم و فضل اور صلاحیتوں کے قائل تھے اور تیسرے وہ جن کے ساتھ ان کے تعلقات بس واجبی سے تھے۔ مجھے ان کے تقسیم کردہ پہلے درجہ میں جگہ حاصل کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ایسے لوگوں کو کہ جنہیں وہ خود سے قریب اور اپنے اعتماد کا آدمی سمجھتے تھے' زیادہ سے زیادہ کام ان کے سپرد کرنے لگتے تھے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ملازمت کے ابتدائی دور میں بچوں اور عورتوں کے پروگرام پروڈیوس کیے مگر جلد ہی شمس الدین بٹ صاحب کی ترقی ہو جانے پر اسٹوڈیو نمبر نو جیسا اہم اور مشہور ڈرامہ پروگرام مجھے دے دیا گیا اور میں ڈرامہ سیکشن کا سربراہ بن گیا۔ بخاری صاحب کو ڈرامے سے میری بے تحاشہ محبت اور دلچسپی کا احساس تھا۔ میں کم و بیش سات سال تک اسٹوڈیو نمبر 9 میں ہر ہفتہ ایک گھنٹہ کا ڈرامہ پروڈیوس کرتا رہا جو ہر اتوار کی رات نو بجے نشر ہوتا تھا اور اس زمانے میں ریڈیو پاکستان کا سب سے مقبول پروگرام سمجھا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ جب مقبول سلسلہ وار پروگرام حامد میاں کے ہاں دوبارہ شروع ہوا تو اس کی پروڈکشن کی ذمہ داری بھی مجھے سونپی گئی۔ کچھ عرصہ بعد مشہور فلمی کامیڈین نور محمد چارلی کے ساتھ "ہفتہ پونے نو" کے نام سے

بخاری صاحب نے ایک نیا پروگرام شروع کیا جس میں وہ خود بھی ایک مستقل کردار ادا کرتے تھے۔ وہ بھی میرے حصہ میں آیا۔ جب شوکت تھانوی جنگ اخبار کے ادارتی شعبے سے وابستہ ہو کر لاہور سے کراچی آئے اور انہوں نے لاہور سے نشر ہونے والے اپنے بے حد مقبول پروگرام "قاضی جی" کو کراچی ریڈیو سے پیش کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو بخاری صاحب نے اسٹیشن ڈائریکٹر کو میرا نام دیا کہ اس پروگرام کی پیشکش کی ذمہ داری مجھے سونپی جائے۔ اس کے علاوہ اپنے ذاتی پروگرام "جمعہ خان جمعہ" کی پیشکش بھی انہوں نے کچھ عرصہ کے لیے میرے ذمہ لگائی تھی۔ میری زندگی کے وہ اتنے مصروف دن تھے اور اتنا زیادہ کام تھا کہ اب سوچتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ اتنا بہت کچھ میں کس طرح کر لیتا تھا۔ پھر ساتھ ہی میں اس حلقہ میں بھی شامل ہو گیا تھا جنہیں بخاری صاحب وقتاً فوقتاً اپنے گھر بلاتے اور اپنے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھلاتے۔ ان کے گھر تقریباً روزانہ ہی رات کو محفل جمتی تھی جس میں ان کے احباب شریک ہوتے۔ شاعر' موسیقار' صداکار' پروڈیوسر۔ آدھی رات کے بعد جب یہ محفلیں ختم ہوتیں تو وہ سب کو اپنی کار میں بٹھا کر ہر ایک کو گھر ڈراپ کرتے تھے۔ ایسی ہی ایک رات جب بخاری صاحب مجھے اور سید ناصر جہاں کو ڈراپ کرنے مارٹن کوارٹر جا رہے تھے' میں نے ان سے دریافت کیا کہ اب رات کے دو بجے ہیں۔ آپ کو واپس ہوتے ہوئے ایک گھنٹہ اور لگ جائے گا' بستر پر دراز ہوتے ہوتے تین بج جائیں گے اور سنا ہے آپ صبح چھ بجے روزانہ ایمپریس مارکیٹ بھی جاتے ہیں جہاں سے خود گوشت اور سبزی خریدتے ہیں تو پھر آپ سوتے کس وقت ہیں" بخاری صاحب ہنسے اور ناصر جہاں سے مخاطب ہو کر بولے "میاں یہ پتہ ابھی تمہیں نہیں ہے کہ تم لوگوں کو چھوڑنے کے بعد میں ابھی گھر نہیں جاؤں گا' ایئرپورٹ کی طرف جاؤں گا۔ لانگ ڈرائیو کے لیے" پھر انہوں نے نیند کے فلسفہ پر اظہار خیال شروع کر دیا۔ ان کا کہنا تھا نیند دماغ کو سکون اور آرام دینے کا نام ہے۔ اس کے لیے آنکھوں کا کھلا رہنا یا بند رہنا اہمیت نہیں رکھتا۔ ان کا کہنا تھا کہ جب وہ رات کے سناٹے میں خالی سڑک پر ایئرپورٹ کی جانب اپنی کار کا رخ کر دیتے ہیں تو ان کی نیند پوری ہو جاتی ہے۔ چونکہ اس طرح وہ اپنے ذہن کو مکمل سکون اور آرام مہیا کرتے ہیں۔ اس بات کی تصدیق ان کے پرانے ملنے والوں نے بھی کی کہ برسوں سے بخاری صاحب کا یہی طریقہ رہا ہے۔ شام کو اپنے گھر پر محفل سجانا' پھر رات گئے تک ادب موسیقی' شاعری' حالات حاضرہ پر گفتگو اور

نصف شب کے بعد مہمانوں کو ان کے گھروں پر ڈراپ کرنا۔

بخاری صاحب کو کھانے پینے کا بے حد شوق تھا۔ خود تو کم خوراک تھے مگر دوسروں کو کھلا کر بہت خوش ہوتے تھے۔ گوشت، سبزی وغیرہ خود خرید کر لاتے تھے اور کبھی کبھی پکاتے بھی خود تھے۔ ان کی یہ محفلیں برس ہا برس چلتی رہیں۔ ہاں ان میں شریک ہونے والے بدلتے رہے۔ جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں، ان دنوں ان محفلوں میں شریک ہونے والوں میں ناصر جہاں، نہال عبداللہ، محمد علی، سلیم گیلانی، مرزا ظفرالحسن، رشید تبسم اور کراچی کے بہت سے شاعر شامل تھے۔ عام طور پر یہ نشستیں بخاری صاحب کے بڑے بیڈ روم میں ہوا کرتی تھیں جہاں ان کے ایک بہت جدید قسم کے پلنگ کے علاوہ بہت سے صوفے، آرام کرسیاں اور کشن پڑے ہوتے تھے۔ وہ خود ایک مخصوص صوفے پر تشریف رکھتے اور ان کے سامنے ایک بڑی سی اونچی چوکور میز رکھی ہوتی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ان محفلوں میں سب سے زیادہ خود بخاری صاحب ہی گفتگو فرماتے تھے۔ محفل میں موجود شاعروں سے کلام بھی سنا جاتا۔ بخاری صاحب خود بھی اشعار سناتے۔ اپنے بھی اور دوسروں کے بھی۔ وہ ہر موضوع پر گفتگو کرتے تھے اور ان کا انداز بیان اور طرز تکلم اس قدر دلچسپ اور مسحور کن ہوتا تھا کہ جی چاہتا تھا، بس وہ بولتے رہیں اور آپ سنتے رہیں۔ آواز نہایت کھرج دار، لہجہ بڑا دل پذیر، تلفظ کی غلطی ناممکن۔ حکایتیں اور لطیفے کچھ اس انداز سے سناتے تھے کہ کئی بار سنے ہونے کے باوجود اتنا ہی لطف آتا جیسے پہلی بار سن رہے ہوں۔ ایسے محفل آرا لوگ کم ہی ہوتے ہیں اور پھر ایسا میر محفل تو صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ شام کی ان محفلوں میں میں نے ہمیشہ انہیں سفید کرتے اور کھلے پانچوں کے پاجامے ہی میں دیکھا۔ انہیں لباس سجتے بھی بہت تھے اور انہیں ملبوسات کے انتخاب اور وقت کی مناسبت کا اندازہ بھی بڑا صحیح تھا۔ صبح کو دفتر میں ان کو جب بھی دیکھا، بالکل صاحب بہادر کی طرح۔ ایک سے ایک اعلیٰ کوالٹی کا سوٹ ان کے پاس تھا۔ زیادہ تر سوٹ بیرون ملکوں سے خریدے ہوئے ہوتے۔ بعض اس زمانے کے تھے جب وہ بی بی سی میں کام کرتے تھے۔ وہ اس بات پر بڑا فخر کرتے تھے کہ اتنے برس گزر جانے کے باوجود یہ سوٹ ابھی تک بالکل فٹ آتے ہیں۔ دوپہر کے بعد جب وہ براڈکاسٹنگ ہاؤس میں پروگرام پروڈیوس کرنے آتے تھے کہ جو ان کا ذاتی شوق تھا تو مختلف لباس میں ہوتے۔ بھڑکیلے رنگ کی قمیص اور ڈھیلی ڈھالی پتلون۔ کبھی کبھی گیلس لگائے

ہوتے۔ رات کو ہمیشہ کرتا پاجامہ پہنتے۔ کسی مجلس یا مشاعرہ میں جانا ہوتا تو شیروانی زیب تن کرتے۔ میں نے کسی پر شیروانی اتنی بجتی نہیں دیکھی جتنی بخاری صاحب پر۔ لگتا تھا کہ یہ لباس تو ایجاد ہی صرف ان کے لیے ہوا ہے۔

ملازمت کے دوران سارا وقت بھر گری روڈ کی کوٹھی میں اقامت پذیر رہے۔ یہ بہت بڑی کوٹھی تھی جو پٹیل پارک (حال نشتر پارک) کے سامنے تھی۔ اوپر کی منزل میں بخاری صاحب رہتے تھے اور نیچے والا حصہ روزنامہ ڈان کے چیف ایڈیٹر الطاف حسین کے پاس تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بخاری صاحب کلفٹن کے ایریا میں ایک بنگلہ میں شفٹ کر گئے تھے۔ میں نے 1964ء میں کراچی کو خیر آباد کہہ دیا تھا اور ٹیلی ویژن سے منسلک ہونے کے بعد پہلے لاہور اور پھر راولپنڈی میں مقیم رہا۔ سرکاری کاموں سے اکثر اوقات کراچی جاتا رہتا تھا اور میری ہمیشہ یہ کوشش ہوتی تھی، بخاری صاحب سے ملے بغیر کراچی سے نہ لوٹوں۔ جب کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتا، بے حد خوش ہوتے، سینے سے لگاتے۔ ہر طرح کی خاطر مدارت کرتے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی محفل آرائی کا شوق اسی طرح برقرار تھا۔ میں جب بھی ملنے گیا، ہمیشہ دو چار احباب کو بیٹھے پایا۔ جب پی ٹی وی کے ڈائریکٹر پروگرام کے عہدے پر فائض ہونے کے بعد پہلی بار میں نے سلام کے لیے حاضری دی تو محفل جمی ہوئی تھی۔ بہت سے انجانے لوگ بیٹھے تھے، دراصل اس عرصہ میں ان کا حلقہ احباب کافی حد تک بدل چکا تھا۔ میرے پروموشن کی خبر ان کو مل چکی تھی۔ بڑی محبت سے سینے سے لگایا اور اہل محفل سے میرا تعارف یوں کرایا "بھئی یہ آغا ناصر ہیں۔ پہلے ٹیلی ویژن میں کام کرتے تھے، اب ٹیلی ویژن کو خیر آباد کہہ کر ہیڈ کوارٹر چلے گئے ہیں۔" پھر دیر تک مجھے اس اہم عہدے پر کام کرنے کے طریقے اور اصرار و رموز سمجھاتے رہے۔ اسی طرح ایک بار میں ملنے گیا تو کہنے لگے "بھئی ڈائریکٹر پروگرام صاحب کراچی ٹی وی کے عملہ کو ہدایت کر دیں کہ مجھے تعزیتی پروگراموں کے علاوہ بھی کسی پروگرام میں بلا لیا کریں۔ ٹیلی ویژن پر میری شکل دیکھتے ہی لوگ سمجھتے ہیں کہ کوئی مر گیا ہے۔" دراصل بخاری صاحب ادب، آرٹ اور ثقافت کے شعبے میں ہر کسی کو جانتے تھے اور اسی لیے جب کسی مشہور شخصیت کا انتقال ہوتا تو ٹی وی والے انہیں اپنے تاثرات بیان کرنے کے لیے ضرور بلاتے تھے۔ تعزیتی پروگراموں پر مجھے یاد آیا۔ ہم نے ٹی وی کے لیے ساری ایسی بزرگ شخصیتوں کے طویل انٹرویو ریکارڈ کرنے کا سلسلہ شروع کیا جو عمر کی

آخری منزلوں میں تھے لیکن جب وہ لوگ دریافت کرتے کہ یہ پروگرام کب نشر ہوگا تو پروڈیوسروں کو ادھر ادھر کی باتیں بنانے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا۔ ظاہر ہے اب اس شخصیت سے یہ تو نہیں کہا جاسکتا تھا کہ آپ کی موت پر نشر کرنے کے لیے یہ ریکارڈنگ کی جارہی ہے لیکن بخاری صاحب تو خود ان باتوں کو سمجھتے تھے اور اندرون خانہ انہیں ہر چیز کا علم تھا' لہٰذا ایک ملاقات میں مجھے کہنے لگے۔ "آج کل میں اپنا تعزیتی پروگرام ریکارڈ کرا رہا ہوں" میں کچھ شرمندہ سا ہوا تو ہنس کر بولے "اس میں حجاب کیسا' آخر مرنا تو سب کو ایک دن ہے اور دنیا کے سارے ریڈیو اور ٹیلی ویژن نیٹ ورکس میں یہ طریقہ ہے کہ ایسی شخصیتوں کے بارے میں ان کی زندگی ہی میں زیادہ سے زیادہ میٹریل ریکارڈ کر لیا جاتا ہے۔ بخاری صاحب نے یہ طویل انٹرویو کئی نشستوں میں ریکارڈ کرایا اور جب ان کی وفات کے بعد یہ پروگرام نشر ہوا تو ہمیں احساس ہوا کہ وہ تو اپنا مکمل تعزیتی پروگرام خود ہی مرتب کر گئے ہیں۔

بخاری صاحب جیسا حاضر دماغ اور اعلیٰ پایہ کا بذلہ سنج مشکل ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ لطیفہ گوئی' پھبتی' شوخی' شرارت ان کی شخصیت کا اٹوٹ حصہ تھے۔ فقرے باز ایسے کمال کے کہ جب کسی پر فقرہ کس دیا تو اٹھائے نہ اٹھتا۔ ایسے موقعوں پر وہ بڑے آدمیوں کی بڑائی کا لحاظ بھی نہیں کرتے تھے بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ غرے والے افسروں اور اکڑفوں کرنے والے وزیروں' سفیروں کو خاص طور پر طنز و مزاح کا نشانہ بناتے تھے۔ ایک بڑا مشہور قصہ تو زبان زد خاص و عام تھا اور زیادہ تر لوگ اسے لطیفہ سمجھ کر ہی ہنسا کرتے تھے لیکن میں نے ایک روز بخاری صاحب سے تصدیق چاہی تو انہوں نے کہا کہ یہ گھڑی ہوئی کہانی نہیں ہے' بالکل سچ ہے۔ واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز بخاری صاحب کو اس وقت کے سیکرٹری اطلاعات نے فون کیا اور کہا کہ ایک بڑے عالم دین نے شکایت کی ہے کہ جس کار میں صبح سویرے انہیں درس قرآن کے پروگرام کے لیے لایا جاتا ہے' اس گاڑی میں سارنگی نواز بندو خان بھی بیٹھے ہوتے ہیں۔ بخاری صاحب کو آرٹسٹوں اور فنکاروں سے جس قدر محبت اور لگاؤ تھا' اس کے پیش نظر یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے دل پر یہ اعتراض سن کر کیا گزری ہوگی۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا' صرف یہ کہا کہ میں دیکھتا ہوں۔ چار چھ دن بعد پھر وزارت کے سیکرٹری نے دریافت کیا کہ آپ نے اس سلسلے میں کیا کیا؟ بخاری صاحب نے فی الفور جواب دیا "میں نے معافی مانگ لی ہے۔"

لیکن مولانا توکل مجھ سے پھر شکایت کر رہے تھے؟ انہوں نے بتایا۔

"جی...... لیکن میں نے تو استاد بندو خان سے معافی مانگی ہے" سیکرٹری یہ بات سن کر زناٹے میں آگیا۔ تب بخاری صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا کہ جناب عالی اس ملک میں بندو خان کے پائے کا سارنگی نواز کوئی دوسرا نہیں، ان کی جس قدر بھی قدر و منزل کی جائے، کم ہے۔ مولانا کے ہم پلہ تو اور بھی مل سکتے ہیں۔"

ایک اور واقعہ جس سے ان کی جرات اور حاضر دماغی کا اظہار ہوتا ہے۔ پیر علی محمد راشدی کے ساتھ پیش آیا۔ راشدی صاحب اپنے وقت کے بڑے صحافی تھے۔ سندھ کے ایک ایسے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے جو علم و فضل کے لیے مشہور تھا۔ پچاس کے عشرے میں جب آئے دن مرکزی حکومتیں بدلتی رہتی تھیں اور روز روز نئے وزیر اعظم مقرر ہوتے رہتے تھے، ایک موقع پر جب کابینہ میں ردوبدل ہوا تو راشدی صاحب وزیر اطلاعات و نشریات مقرر ہو گئے۔ چارج سنبھالنے کے تھوڑے ہی دن بعد وزیر محترم نے ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل کو اپنے دفتر میں بلایا اور انہیں ہدایتیں دینا شروع کیں۔ انہوں نے کہا کہ "ریڈیو کے پروگراموں کا معیار بڑا پست ہے۔ ضروری ہے کہ اس طرف توجہ دی جائے۔ دوسرے یہ کہ نئے فنکاروں کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی۔ ضروری ہے کہ آپ نئے لوگوں کو بھی موقع دیں۔ تیسرے یہ کہ پروگراموں کی پیشکش میں......"

اب بخاری صاحب کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور انہوں نے کہا "معاف کیجئے گا مجھے ایک قلم اور کاغذ کا پرزہ عنایت فرمایئے گا؟"

"وہ کس لیے؟" راشدی صاحب نے دریافت کیا۔

"تاکہ آپ کی گرانقدر ہدایات قلمبند کر سکوں۔" بخاری صاحب نے جواب دیا۔ راشدی صاحب بہت ذہین اور چالاک آدمی تھے مگر بخاری صاحب کی بات پر گرمی کھا گئے اور خفگی سے بولے "سایں آپ کس طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ میں پروگراموں کو بہتر بنانے، ان کا معیار بلند کرنے اور زیادہ دلچسپ بنانے کی بات کر رہا ہوں۔ یہ اتنی معمولی اور آسان باتیں ہیں، آپ یہ کاغذ، قلم مانگ کر مجھ پر طنز کیوں فرما رہے ہیں؟"

بخاری صاحب نے برجستہ کہا "صاحب آپ بھی تو کمال کرتے ہیں۔ کیا آپ کا خیال ہے، ہمیں ان معمولی اور آسان باتوں کا علم نہیں ہے؟ کیا آپ کا خیال ہے ہمارا دل اچھے

پروگرام پیش کرنے کو نہیں چاہتا؟ راشدی صاحب نے یہ سنا اور تلملا کر رہ گئے۔

بخاری صاحب میں بہت سی کمزوریاں بھی تھیں۔ ایک تو یہ کہ کانوں کے کچے تھے۔ کوئی کسی کے خلاف سکھا پڑھا گیا اور انہوں نے یقین کر لیا۔ خاص طور پر اگر شکایت کسی ایسے شخص کے بارے میں ہو جو ان سے قربت کے تعلقات رکھتا ہو تو ان کا پارہ ایک دم چڑھ جاتا تھا۔ ان کی اسی کمزوری نے ان کے بعض بہت سے قریبی اور لائق فائق ماتحتوں کو ان سے دور کر دیا۔ ایک مثال تو حمید نسیم کی ہے کہ جو اپنے زمانے کے نہایت ذہین، زیرک اور عالم فاضل آدمی تھے۔ ابتدائی دور میں بخاری صاحب ان کے بے حد گرویدہ تھے۔ اسی سبب سے ان کے بہت سے حاسد اور دشمن پیدا ہو گئے تھے۔ وہ مسلسل اسی تاک میں لگے رہتے تھے کہ بخاری صاحب کا دل حمید نسیم سے برا کیا جائے اور اکثر اوقات وہ اپنی ان کوششوں میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ اسی طرح ریڈیو کے ایک بڑے مقبول صداکار ایس ایم سلیم تھے۔ آواز کیا تھی جادو کر دیتے تھے اس دور میں۔ یوں سمجھ لیں کہ ریڈیو میں ان کی وہ اہمیت اور قدر و منزلت تھی جو دلیپ کمار کی ہندوستانی فلم انڈسٹری میں تھی۔ بخاری صاحب کے بڑے چہیتے تھے مگر حاسدوں نے ان کے حوالے سے کچھ ایسے قصے بخاری صاحب کو سنائے کہ ان کا دل برا ہو گیا اور پھر اس کا کلائمکس یہ ہوا کہ ایک دن براڈ کاسٹنگ ہاؤس میں سب کے سامنے بخاری صاحب نے سلیم کی بے حد بے عزتی کی اور وہ ریڈیو کی ملازمت چھوڑ گئے۔ کافی عرصہ بعد لوگوں نے کچھ صلح صفائی کرائی۔ ایس ایم سلیم واپس آ گئے مگر وہ پہلی والی بات ختم ہو چکی تھی۔ جلد ہی ایس ایم سلیم کو پاکستان میں وائس آف امریکہ کے دفتر میں پروڈیوسر کی ملازمت مل گئی اور انہوں نے ریڈیو پاکستان کو خیر آباد کہہ دیا۔

بخاری صاحب کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ جب کسی کا تمسخر اڑاتے تو اس حد تک کہ وہ بیچارہ بالکل تباہ و برباد ہی ہو جاتا۔ میں نے ایک ایسا منظر خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ہمارے ایک اسسٹنٹ ریجنل ڈائریکٹر تھے جو پروگراموں کے انچارج تھے۔ بخاری صاحب ان کو زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔ خود وہ بھی موقع کی مناسبت سے ایسی حرکتیں کرتے رہتے تھے جو بخاری صاحب کی ناگواری کا سبب بنتی تھیں۔ ایک بار بخاری صاحب آسٹریلیا گئے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے اسسٹنٹ ڈائریکٹر صاحب نے بخاری صاحب کے کسی چہیتے کو کافی تنگ کیا۔ جب بخاری صاحب واپس آئے تو ظاہر ہے اس شخص نے اپنے افسر کی شکایت کی اور

بخاری صاحب نے اسسٹنٹ ڈائریکٹر صاحب کو سبق پڑھانے کا فیصلہ کر لیا۔ دو چار روز بعد وہ صبح سویرے پروگرام میٹنگ میں آ گئے۔ ریڈیو کے شعبے میں دن کا آغاز ہمیشہ پروگرام میٹنگ سے ہوتا ہے کہ جس میں گزشتہ رات نشر کیے گئے پروگراموں پر تنقید و تبصرہ اور آنے والے دن کے پروگراموں کی تفصیلات پر گفتگو ہوتی ہے۔ اس میٹنگ میں پروگرام اور پریزینٹیشن سے تعلق رکھنے والا سارا عملہ شریک ہوتا ہے۔ اس روز میٹنگ میں بخاری صاحب' اسسٹنٹ ڈائریکٹر صاحب کی ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئے جو میٹنگ کی صدارت کر رہے تھے۔ پہلے وہ آسٹریلیا میں اپنے قیام کی باتیں بتاتے رہے کہ کس طرح ایشیا براڈ کاسٹنگ یونین کے خدو خال سنوارے جا رہے ہیں اور آسٹریلیا ریڈیو کے ڈی جی سر چارلس موزیز اس سلسلہ میں کتنی محنت کر رہے ہیں۔ پھر انہوں نے اپنے سفر کا حال سنانا شروع کر دیا۔ کہنے لگے "واپسی پر میرے ساتھ کی نشست پر ایک پاکستانی نودولتیا بیٹھا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے یہ بیٹھے ہیں۔ وہ پہلے تو بڑے غور سے میرے لباس اور میری وضع قطع کو دیکھتا رہا پھر اس نے کہا' آپ کا سوٹ بہت اچھا ہے۔ میں نے کہا "جی۔" اس نے میرے کوٹ کا دامن زور سے پکڑ کر بڑی زور سے کھینچا اور پوچھا "ہاؤ مچ؟" یہ کہتے ہوئے بخاری صاحب نے اسسٹنٹ ڈائریکٹر صاحب کے کوٹ کا دامن زور سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا کہ وہ گھبرا ہی گئے۔ پھر بولے "ذرا دیر بعد اس نے میرے قمیص کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا۔ اس طرح کہ میرا بٹن توڑ ڈالا اور یہ کہتے ہوئے بخاری صاحب نے جھٹکا دے کر اسسٹنٹ ڈائریکٹر صاحب کے قمیص کا بٹن توڑ ڈالا۔ ظاہر ہے اسسٹنٹ ڈائریکٹر صاحب انتہائی نروس ہو رہے تھے اور حاضرین محفل بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس سارے قصہ کا کلائمکس اس طرح ہوا کہ بخاری صاحب نے کہا اور اس کے بعد تو اس شخص نے حد ہی کر دی۔ میری ٹائی کو کمبخت نے اس طرح اپنی طرف کھینچنا شروع کیا کہ میری آنکھیں باہر نکل آئیں اور وہ ہاؤ مچ' ہاؤ مچ کہتا رہا۔ یہ کہتے ہوئے بخاری صاحب نے ان کی ٹائی کو اتنی زور سے کھینچنا شروع کر دیا کہ واقعی ان کی آنکھیں باہر نکل آئیں اور بخاری صاحب ہنس ہنس کر کہتے رہے۔ "ہاؤ مچ' ہاؤ مچ"

بخاری صاحب کو جب کسی کی کوئی بات بری لگتی تھی تو فوراً ہی حساب چکتا کر دیتے تھے۔ مرزا ظفر الحسن جو موسیقی کے شعبے کے انچارج تھے' ان کے خاص مقربین میں سے تھے۔ اپنی ملازمت کے آخری زمانے میں کہ جب بخاری صاحب کو موسیقی سے بے حد لگاؤ

پیدا ہو گیا تھا' وہ ہر شام براڈ کاسٹنگ ہاؤس آ کر موسیقی کے مختلف پروگراموں کی ریہرسل اور ریکارڈنگ کیا کرتے تھے۔ اس تمام وقت مرزا صاحب معاون کے طور پر ان کے ساتھ ہوتے۔ ایک دن مرزا صاحب سے کسی بات پر بحث ہو گئی۔ بخاری صاحب کو اختلاف رائے بالکل پسند نہیں تھا' لہٰذا مرزا صاحب سے تھوڑا سا بے رخی کا انداز اختیار کر گئے۔ اگلے روز شام کو پھر آئے تو مرزا صاحب سے کہا' یار چائے پلوائیے۔ چائے آ گئی تو انہوں نے ادھر ادھر گزرنے والوں کو ایک ایک کر کے بلانا شروع کر دیا۔ جب خاصے لوگ جمع ہو گئے تو کہنے لگے "بھئی کل مرزا ظفر الحسن سے ہماری بڑی بحث ہوئی اور کوئی فیصلہ نہ ہو سکا اور آخر میں مجھے کہنا پڑا کہ مرزا صاحب آپ میرے رہن سہن پر حملہ کریں' میں پلٹ کر آپ کے رہن سہن پر حملہ کروں گا۔ آپ میرے مال و اسباب پر حملہ کریں' میں آپ کے مال و اسباب پر حملہ کروں گا۔ آپ میرے عہدے اور رتبے پر حملہ کریں' میں آپ کے عہدے اور رتبے پر حملہ کروں گا مگر آپ میری عقل پر حملہ کرتے ہیں تو میں آپ کی کس چیز پر حملہ کروں!

اس طرح کی فقرے بازی کا ایک مشہور واقعہ ان کے بڑے بھائی پطرس بخاری سے منسوب ہے۔ ایک محفل میں جہاں پطرس بخاری اور ان کے ہم عمر احباب بیٹھے تھے' زیڈ اے بخاری بھی موجود تھے۔ پطرس صاحب بڑا بھائی ہونے کی حیثیت سے بخاری صاحب سے بار بار کسی کام کو کہتے۔ پانی لاؤ...... اب برف لاؤ...... وہ ایک کرسی اور چاہیے وغیرہ وغیرہ...... اس پر محفل میں موجود کسی دوست نے ذوالفقار علی بخاری سے کہا۔

"بخاری صاحب سگ باش برادر خورد نہ باش"

بخاری صاحب تو جیسے بھرے بیٹھے تھے' برجستہ جواب دیا۔ یہ نہیں یوں کہیے۔

"سگ باش برادر سگ نہ باش"

ایسے لوگ جو بخاری صاحب کو عزیز تھے' ان سے جب کبھی ناراض ہوتے تو خفگی کے اظہار کے طور پر بول چال بند کر دیتے تھے۔ اگر غصہ زیادہ ہو تو سلام کا جواب بھی نہیں دیتے تھے اور دیکھ کر منہ پھیر لیتے تھے۔ اس طرح کی ایک خفگی کا قصہ جو بہت مشہور ہوا' نامور بزرگ شاعر ارم لکھنوی سے تعلق رکھتا ہے۔ ارم صاحب ریڈیو سے منسلک بھی تھے اور بخاری صاحب کے احباب کی فہرست میں شامل تھے۔ کسی محفل میں بخاری صاحب کو ارم

صاحب کی کوئی بات ناگوار گزری اور نتیجتاً انہوں نے ارم صاحب سے بات کرنا بند کر دی۔
ارم صاحب مخصوص لکھنوی ثقافت کے پروردہ تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں ان کی طبع نازک پر گراں گزرتی تھیں اور پھر یہاں تو ریڈیو کے اتنے بڑے افسر کی خفگی کا معاملہ تھا۔ انہوں نے اپنے سے ہر کوشش کی کہ بخاری صاحب سے مل کر معذرت کر لیں مگر بخاری صاحب ایک فنکار آدمی بھلا اس بھولے بھالے معصوم صفت شاعر کو یہ موقع کیسے دے سکتے تھے۔ وہ تو ان کے اضطراب اور ان کی پریشانی سے جیسے حظ اٹھا رہے تھے۔ کئی دن گزر گئے، پھر یوں ہوا کہ کسی مشاعرے میں کہ جس کی صدارت بخاری صاحب کر رہے تھے، ارم لکھنوی بھی بحیثیت شاعر مدعو تھے۔ جب ان کو کلام سنانے کے لیے بلایا گیا تو حاضرین کے اصرار پر انہوں نے اپنی مشہور غزل سنائی جو ان دنوں بے حد مقبول تھی۔

ہم باغ تمنا میں دن اپنے گزار آئے
آئی نہ بہار اب تک شاید نہ بہار آئے
تصویر بنی دیکھی اک جان تمنا کی
آنسو مری آنکھوں میں کیا سلسلہ وار آئے

سارا حال داد کے شور سے گونج اٹھا مگر مجال ہے جو بخاری صاحب کی بھنوؤں کے تناؤ میں ذرا بھی لچک آئی ہو۔ وہ اسی طرح سنجیدہ صورت خاموش مسند صدارت پر بیٹھے اس طرح ان کی غزل سنتے رہے جیسے وہ اردو زبان ہی سے ناواقف ہوں۔ جب غزل ختم ہو گئی تو اٹھنے سے پہلے ارم صاحب نے بخاری صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا!
"حضور۔ ایک شعر صرف آپ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے لایا ہوں۔" اور پھر انہوں نے بڑی رقت کے ساتھ یہ شعر پڑھا......

یوں وہ گزرے نظر چرائے ہوئے
ہم لیے رہ گئے سلام اپنا

بخاری صاحب یہ شعر سن کر پھڑک اٹھے۔ بڑے جذباتی انداز میں اپنی نشست سے اٹھے اور ارم لکھنوی کو گلے لگا لیا۔ سارے گلے شکوے اور شکایتیں اس ایک شعر نے دور کر دیں۔
بخاری صاحب نے بلا شرکت غیرے کم و بیش بارہ تیرہ سال ریڈیو کے محکمے پر حکمرانی کی۔ وہ سنتے سب کی تھے لیکن کرتے وہی تھے جو وہ چاہتے تھے اور عام طور پر پیشہ ورانہ نقطہ نظر

سے اکثر وہی فیصلہ اور عمل صحیح بھی ہوتا تھا۔ ریڈیو پاکستان کی نشوونما پالیسیوں کی منصوبہ بندی، پروگراموں اور ایڈمنسٹریشن کی تشکیل غرض سب کچھ ان کی فکر اور ان کی خواہشات کے مطابق ہوتا تھا۔ وہ خواب دیکھتے اور ان کے پاس اپنے خوابوں کو حقیقت کا روپ عطا کرنے کے ذرائع بھی تھے۔ یہ قوت انہوں نے کس طرح حاصل کی، اس کا جواب ان لوگوں کے لیے ڈھونڈنا کوئی مشکل نہیں ہے جو بخاری صاحب کو جانتے تھے۔ وہ دھن کے پکے تھے۔ براڈکاسٹنگ سے دیوانگی کی حد تک عشق کرتے تھے اور اللہ نے ان کو بے خوفی اور جرات مندی کے اوصاف سے نوازا تھا، لہٰذا جو سوچتے تھے، کر گزرتے تھے۔ خواہ راہ میں کیسی ہی بڑی بڑی رکاوٹیں حائل کیوں نہ ہوں۔ ریڈیو کے پروگراموں، ریڈیو پر کام کرنے والے کارکنوں، فنکاروں، غرض نشریات کے شعبے کے ہر پہلو پر ان کی اس قدر گہری چھاپ تھی کہ ان کے دور کے ٹھیک تیس برس بعد جب میں نے ریڈیو پاکستان کے سربراہ کا عہدہ سنبھالا تو مجھے ہمہ وقت کچھ ایسا احساس رہتا تھا جیسے بخاری صاحب یہیں کہیں ہیں اور دیکھ رہے ہیں کہ ان کے بتائے ہوئے اصولوں سے روگردانی تو نہیں کی جا رہی ہے!

ریڈیو سے ریٹائرمنٹ کے بعد بخاری صاحب بہت عرصے فارغ رہے۔ یہ ان کے لیے بڑا مشکل وقت تھا۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک ایسے انسان کے لیے جو ذہنی اور جسمانی طور پر صحت مند ہو، اپنے کام کا ماہر ہو اور ایک مخصوص شعبہ زندگی میں طویل تجربہ رکھتا ہو، یہ فراغت کس قدر جان لیوا ہو سکتی ہے لیکن بخاری صاحب نے ان کٹھن دنوں میں بھی اپنی ظاہری حالت اور پرانی روایات کو برقرار رکھا۔ مہمان نوازی، محفل آرائی، شعر و ادب اور موسیقی سے دلچسپی اور وابستگی ویسے ہی قائم رہی اور کسی کو احساس نہ ہونے دیا کہ ان کے دل پر کیا بیت رہی ہے۔ 1964ء سے 1969ء تک میں لاہور کے ٹیلی ویژن اسٹیشن پر متعین تھا، ہر سال محرم کے دنوں میں ہم بخاری صاحب کو کراچی سے تین چار روز کے لیے بلا لیا کرتے تھے اور ان سے ان کے مخصوص انداز میں مرثیہ تحت اللفظ نشر کراتے تھے۔ ریڈیو پر تو ان کی مرثیہ خوانی کو پہلے ہی بڑی شہرت حاصل تھی مگر ٹیلی ویژن نے آواز کے ساتھ ان کی شاندار شخصیت کو سکرین پر پیش کر کے ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کو کچھ اور بھی اجاگر کر دیا۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ ٹیلی ویژن پر بخاری صاحب کے مرثیوں کے پروگرام پیش کرنے کا اعزاز مجھے حاصل ہے۔

لاہور ٹیلی ویژن پر سال بہ سال آنے جانے سے انہیں ٹیلی ویژن سے دلچسپی پیدا ہوئی اور پھر مرثیہ خوانی کے علاوہ وہ دوسرے پروگراموں میں بھی شریک ہونے لگے۔ ان کا ایک ہفتہ وار پروگرام "اوراق" کے نام سے کافی عرصہ نشر ہوتا رہا جس میں بخاری صاحب اردو ادب کے شاہکار مضامین اور کتابوں سے اقتباس پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔

لاہور کے بعد جب 1967ء میں کراچی کے ٹیلی ویژن مرکز کی بنیاد ڈالی جانے لگی تو بخاری صاحب کے پرانے دوستوں نے حکومت کو اس بات پر راضی کر لیا کہ بخاری صاحب کو اس نئے ٹیلی ویژن اسٹیشن کا جنرل منیجر مقرر کر دیا جائے۔ بخاری صاحب اس عہدے پر تعیناتی سے بے حد خوش تھے اور جی جان لگا کر نئے ٹیلی ویژن اسٹیشن کے اسٹاف کی بھرتی' پروڈیوسروں کا انتخاب اور پروگراموں کی ترتیب اور درجہ بندی کے کاموں میں لگ گئے۔ انہوں نے بڑی محنت کی۔ اپنی ساری صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نئے اسٹیشن کی بنیادیں مستحکم کیں مگر اس بار قسمت ان کے ساتھ نہیں تھی۔ جو ہوا اس کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے۔

کراچی ٹیلی ویژن اسٹیشن کی رسم افتتاح کے لیے صدر پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خان کو مدعو کیا گیا تھا۔ افتتاحی تقریب کے لیے ٹیلی ویژن اسٹیشن کے لان میں اسٹیج بنایا گیا تھا۔ بخاری صاحب نے اپنے طور پر سارے انتظامات مکمل کرنے کی کوشش تو کی تھی مگر ان کے پاس تجربہ کار اور تربیت یافتہ لوگ نہیں تھے۔ پروگرام اور انجینئر کے شعبے میں انہوں نے ریڈیو سے تعلق رکھنے والے ایسے لوگ ملازم رکھ لیے تھے جنہیں ٹیلی ویژن سے تعلق نہ تھا' اپنا پرانا طریقہ اختیار کرتے ہوئے کسی اور کی معاونت اور مشورے کے بغیر' زیادہ تر اسٹاف خود ہی منتخب کیا تھا۔ انہی لوگوں کی وجہ سے پہلے ہی مرحلہ پر مسائل پیدا ہو گئے۔ اگرچہ بخاری صاحب اپنی طبیعت کے مطابق بڑے پر اعتماد تھے کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا مگر شومئی تقدیر سب کچھ غلط ہو گیا۔ افتتاحی تقریب میں وقت مقررہ پر صدر ایوب تشریف لائے اور انہیں اسٹیج پر لے جا کر ان کی مخصوص نشست پر بٹھایا گیا۔ کسی نے یہ چیک نہیں کیا کہ کرسیوں پر نیا نیا رنگ کیا گیا تھا جو ابھی خشک نہیں ہوا تھا۔ جب صدر گرامی تقریر کے لیے اٹھنے لگے تو ان کی پتلون کرسی کے گدے سے ایسی چپکی کہ کرسی بھی ان کے ساتھ ہی اٹھ گئی۔ اب دائیں بائیں بیٹھے افسران سخت شرمندہ ہوئے اور کرسی کو صدر کی پتلون سے یا

صدر کی پتلون کو کرسی سے چھڑانے کی تگ ودو میں لگ گئے۔ بڑی مشکل سے کرسی کو علیحدہ کیا گیا مگر سرخ پینٹ صدر مملکت کی پتلون اور کوٹ کے دامن پر بری طرح لتھڑ چکا تھا۔ ایوب خان کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔ بہر کیف وہ تقریر کے لیے مائیکروفون کے سامنے آئے اور اپنی افتتاحی تقریر پڑھنے لگے۔ تقریر کے آخری حصہ میں انہوں نے اسکرپٹ سے ہٹ کر بھی کچھ فرمایا جس کا لب لباب یہ تھا کہ ٹیلی ویژن جیسی طاقتور اور نئی میڈیم کو صرف لہو لعب اور تفریح کے لیے استعمال نہ کیا جائے بلکہ تعلیمی مقاصد کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔ انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا کہ "ٹیلی ویژن کو صرف فلمی نغموں کے فرمائشی پروگرام اور مشاعرہ بازی کے لیے استعمال نہیں ہونا چاہیے۔" تقریب کے بعد صدر کو عمارت کے اندر لے جایا گیا۔ تقریب پر رواں تبصرہ جاری تھا' جب وہ کنٹرول روم میں داخل ہوئے تو کمنٹیٹر نے کہا۔ "صدر ذی وقار کنٹرول روم میں تشریف لے آئے ہیں۔ وہ اب بٹن دبائیں گے اور ٹیلی ویژن مرکز کراچی سے پروگراموں کا آغاز ہو جائے گا۔ اس فقرے کے ساتھ ہی صدر صاحب نے بٹن دبایا اور سکرین پر اناؤنسر کا چہرہ نمودار ہوا جس نے پہلا اناؤنسمنٹ کیا جو کچھ اس طرح تھا۔ "ہم اپنے پروگراموں کا آغاز بچوں کے پروگرام سے کر رہے ہیں۔ آج کا سب سے پہلا پروگرام ہے "جانوروں کا مشاعرہ۔" میں تو اس وقت وہاں نہیں تھا مگر جو لوگ تھے' وہ کہتے ہیں کہ مشاعرہ کا نام سن کر صدر صاحب کا چہرہ غصہ سے تمتمانے لگا اور انہوں نے بڑی خفگی سے مینیجنگ ڈائریکٹر کی طرف دیکھا جو ان کے ساتھ کھڑے تھے۔ اس اپی سوڈ کا کلائمکس اس طرح ہوا کہ جب صدر اور ان کے ساتھی کنٹرول روم سے نکل کر اسٹوڈیو میں آ رہے تھے تو پیچھے سے مشاعرہ کے کمپیئر کی آواز آ رہی تھی "اور ناظرین یہ جان کر خوشی ہو گی آپ کو کہ آج کی تقریب کے مہمان خصوصی جناب الو تشریف لا رہے ہیں جو مشاعرے کی صدارت کریں گے تو تشریف لا رہے ہیں صدر الو"

اس کے بعد جو کچھ ہوا' اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ بخاری صاحب اگلے روز چھٹی پر چلے گئے اور چند دن بعد کسی آپریشن کے لیے ہسپتال میں داخل ہو گئے۔ مجھے عارضی طور پر کراچی اسٹیشن پر تعینات کیا گیا تھا۔ کچھ روز بعد میں ملنے گیا۔ انکل سریا ہسپتال کے کمرے میں بیڈ پر لیٹے تھے۔ بڑے پیار سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دباتے رہے۔ پھر آہستہ سے بولے "آخر عمر میں یہ ذلت بھی اٹھانا تھی۔ بھائی میں ریڈیو کا آدمی ہوں' تم سنبھالو

اپنے ٹیلی ویژن کو۔ تمہیں یہ کام آتا ہے“میں نے ذرا ان کی طبیعت بحال کرنے کے لیے کہا’ آپ کو معلوم ہے’ بدر رضوان نے آپ کے آپریشن پر ایک لطیفہ بنالیا ہے۔ ہر ایک سے کہتا ہے”جانتے ہو بخاری صاحب کا کس چیز کا آپریشن ہوا ہے؟ وہ ریڈیو کا سسٹم نکلوا کر ٹیلی ویژن کا سسٹم ڈلوا رہے ہیں۔“ بخاری صاحب خوش دلی سے ہنسنے لگے۔

ٹیلی ویژن چھوڑنے کے بعد مجھے علم نہیں کہ انہوں نے کوئی اور باقاعدہ ملازمت کی یا نہیں۔ یہ سنتے تھے کہ وہ ریڈیو پاکستان میں سینٹر پروڈکشن یونٹ میں مشیر کے طور پر کچھ کرتے رہے اور غالباً سلیم گیلانی نے جو ان کے مقربین خاص میں سے تھے’ان کو بیٹھنے کے لیے دفتر اور دیگر سہولیات بھی مہیا کر دی تھیں مگر یہ بھی سننے میں آتا تھا کہ وہاں لوگوں کا سلوک ان کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ ان کو وہ عزت اور احترام نہیں دیا جاتا تھا جس کے وہ مستحق تھے۔

1970ء کی دھائی میں پاکستان میں ٹیلی ویژن نے بڑی تیز رفتاری سے ترقی کا آغاز کیا اور اس کے ساتھ ہی میری ذمہ داریوں اور مصروفیات میں بھی بے پناہ اضافہ ہوتا گیا۔ پہلے 1970ء کے الیکشن’ پھر 1971ء کی جنگ’ جمہوریت کا آغاز’ اسلامی سوشلزم کا غلغلہ’ اسلامی سربراہی کانفرنس اور ایسے ہی قومی نوعیت کے بہت سے مراحل۔ ان سب واقعات اور معاملات میں پاکستان ٹیلی ویژن کا بڑا اہم کردار تھا اور اس کے ساتھ ساتھ خود ٹیلی ویژن کے اپنے فروغ اور ترقیاتی کاموں کا سلسلہ بھی تیزی سے جاری تھا۔ پشاور اور کوئٹہ میں نئے ٹی وی اسٹیشنوں کے قیام کی تیاریاں’ نیشنل مائیکرو ویو لنک کا آغاز’ سیٹلائٹ رابطوں کی ابتداء’ رنگین ٹیلی ویژن متعارف کرانے کی منصوبہ بندی۔ غرض ہر اعتبار سے ٹیلی ویژن والوں کے لیے یہ بڑی گہما گہمی اور مصروفیت کا زمانہ تھا۔ مجھے اپنی سرکاری مصروفیات کے سلسلہ میں اکثر کراچی جانا تو ہوتا تھا لیکن اب کوشش کے باوجود ہر بار بخاری صاحب کے ہاں حاضری دینا ممکن نہیں ہوتا تھا مگر اتنا ضرور تھا کہ میں جب بھی کراچی گیا اور ان سے بغیر ملے واپس آیا تو دل پر ایک بوجھ سا محسوس کرتا تھا اور کوشش ہوتی تھی کہ اگلے پھیرے میں ضرور ان کے نیاز حاصل کروں مگر کافی عرصہ گزر گیا اور میں ایسا نہ کر سکا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے’اس بار میں کئی روز کراچی میں قیام کے باوجود ان سے مل نہیں سکا تھا اور راولپنڈی واپسی کا دن آ گیا تھا۔ دراصل ان سے ملاقات کا سب سے بہتر وقت شام کے بعد ہوتا تھا اور میرے لیے اس زمانے میں کراچی میں کوئی شام خالی ہونا تقریباً ناممکن سی بات تھی۔ واپس راولپنڈی روانگی

سے ایک روز قبل میں نے کراچی ٹیلی ویژن کے جنرل منیجر برہان الدین حسن سے کہا کہ آج شام بخاری صاحب سے ملاقات کی کوئی صورت نکالو۔ انہوں نے کہا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ چونکہ آج شام ایک سرکاری دعوت میں شرکت ضروری ہے مگر ایک اور صورت ہو سکتی ہے۔ میں نے پوچھا' وہ کیا......؟ برہان نے کہا۔ بخاری صاحب ہر اتوار کو اپنے ایک پرانے دوست مسٹر تھاور کے ساتھ کراچی جم خانہ میں لنچ کرتے ہیں۔ میں خود بھی اکثر وہاں جاتا رہتا ہوں' لہٰذا آپ مناسب سمجھیں تو کل ہم لنچ پر ان سے مل سکتے ہیں۔ کراچی جم خانے سے آپ سیدھے ایئرپورٹ چلے جایئے گا۔ تجویز معقول تھی' حسب پروگرام اگلے روز ہم جم خانہ پہنچ گئے۔ بخاری صاحب اور تھاور صاحب کلب کے برآمدے میں لنچ کے لیے آراستہ میز پر بیٹھے تھے۔ میں نے کافی عرصہ بعد انہیں دیکھا تھا۔ مجھے وہ کمزور اور لاغر نظر آئے۔ وہ اس وقت تھاور صاحب کو ڈانٹ رہے تھے کہ تم آج پھر سات منٹ لیٹ آئے ہو۔ مجھے دیکھ کر بے حد خوش ہوئے' محبت سے گلے لگایا اور گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بڑے خوشگوار موڈ میں تھے مگر میں نے محسوس کیا آواز کی کھنک اور لہجے کی دھمک میں پہلے جیسا زور نہ تھا۔ وہ حسب روایت ہر موضوع پر بات کرتے رہے۔ ٹیلی ویژن کے پروگرام' ریڈیو پاکستان کی زبوں حالی' حکومت کی کارگزاریاں اور ناکامیاں' روٹی کپڑا اور مکان کے نعروں اور وعدوں کے اسرار و رموز غرض بخاری صاحب ہر موضوع پر اظہار خیال کرتے رہے۔ دھیمے اور متوازن لہجے میں۔ کلام و بیاں میں وہی سحر انگیزی تھی مگر درمیان میں رک رک جاتے تھے اور اپنی کمزوری اور بیماریوں کی بات کرنے لگتے تھے۔ کہنے لگے "زیادہ بولوں تو سانس پھول جاتی ہے اور زیادہ دیر کھڑا بھی نہیں رہا جاتا۔ کمزوری ہونے لگتی ہے" پھر جانے کس طرح گفتگو کا رخ پرانی تہذیب اور اخلاقیات کی طرف مڑ گیا۔ وہ پرانے زمانے کو یاد کرنے لگے۔ بولے "تب معاشرتی اقدار کچھ اور طرح کی ہوا کرتی تھیں۔ کیسے کیسے لوگ تھے اور ان کے کیا کیا طریقے تھے۔ بڑے بڑے اہل علم اور اہل دانش لیکن سادگی اور انکساری کا ایسا نمونہ کہ آج ان باتوں پر یقین کرنا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے۔" وہ خاموش ہو گئے جیسے ماضی کے خزانے میں کچھ ڈھونڈنے لگے ہوں۔ پھر انہیں کچھ یاد آیا اور بڑے اداس لہجے میں گویا ہوئے۔ "ایسے ہی ایک بزرگ مرزا محمد سعید تھے۔ دہلی ریڈیو کے ابتدائی دنوں میں پروفیسر مرزا سعید تقاریر نشر کرنے کے لیے ریڈیو اسٹیشن آیا کرتے تھے۔ ان کے علم و فضل کا عالم یہ تھا کہ اس دور کے

بڑے بڑے دانشور اور عالم فاضل اس بات پر ناز کرتے تھے کہ انہیں مرزا صاحب سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ 1947ء کے بعد مرزا صاحب ہجرت کر کے پاکستان آگئے۔" بخاری صاحب خاموش ہوگئے اور خلاؤں میں تکنے لگے جیسے ان کے تصور کی آنکھ مرزا سعید کی شبیہہ دیکھ رہی ہو۔ پھر یوں لگا جیسے انہوں نے اپنے بکھرتے ہوئے خیالوں کو اکٹھا کر لیا۔ کہنے لگے۔" ایک شام وہ مجھے کراچی میں اچانک نظر آئے۔ ان دنوں انٹیلی جنس سکول میں ایک عارضی ریڈیو اسٹیشن قائم تھا۔ ایک شام میں ریڈیو اسٹیشن سے اپنی کار میں واپس جا رہا تھا کہ پل پار کرنے کے بعد سامنے سڑک کے پار فٹ پاتھ پر مرزا سعید نظر آئے۔ وہ چھڑی لیے خراماں خراماں چلے جا رہے تھے۔ میں نے گاڑی ان کے قریب جا کر روکی۔ دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔ میں نے کار کا دروازہ کھولا اور ذرا تامل کے بعد اگلی نشست پر میرے ساتھ بیٹھ گئے۔ کار چلاتے ہوئے میں ان سے حال احوال دریافت کرتا رہا۔ انہوں نے بتایا کہ کس طرح وہ دہلی سے بے سر و ساماں ہو کر لاہور پہنچے اور اب حال ہی میں کراچی آئے ہیں۔ جہاں ان کے ایک صاحبزادے کسی ملازمت میں ہیں۔ انہیں سب سے زیادہ غم اپنی کتابوں کے ضائع ہونے کا تھا جو سب دہلی میں رہ گئی تھیں۔ میں ان کی باتیں سنتا رہا اور آہستہ آہستہ کار ڈرائیو کرتا رہا۔ جب میں اس جگہ پر پہنچا جہاں سے وکٹوریہ روڈ شروع ہوتی ہے اور اس مقام پر کئی سڑکیں آکر ملتی ہیں تو میں نے مرزا صاحب کی منزل مقصود معلوم کرنے کی غرض سے دریافت کیا...... حضور آپ کو کہاں جانا ہے؟" مرزا صاحب نے ایک بار گردن گھما کر میری طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا کر بولے" مجھے تو کہیں بھی جانا نہیں ہے۔ میں تو گھر سے چہل قدمی کے لیے نکلا تھا۔ آپ نے کار میں بیٹھنے کو کہا تو میں انکار نہ کر سکا۔ اب آپ مجھے جہاں چاہیں اتار دیجیے' میں واپس پیدل گھر چلا جاؤں گا" قصہ کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے بخاری صاحب کی آواز بھرا گئی اور جب بات مکمل ہو گئی تو وہ آبدیدہ ہو گئے۔" ایسے نابغہ روزگار لوگ اب کہاں پیدا ہوتے ہیں" ماحول پر ایک اداسی چھا گئی تھی۔ دیر تک خاموشی رہی' لنچ ختم ہو چکا تھا۔ میں اور برہان تھوڑی دیر اور وہاں ٹھہرے اور پھر اجازت چاہی کہ مجھے سیدھے ایئرپورٹ جانا تھا۔ راستہ میں برہان نے مجھ سے کہا" میں نے بخاری صاحب کو اس طرح روتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا" میں نے جواب دیا۔" اضطراب و غم کی یہ کیفیت کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔ میرا خیال ہے' اب وہ ہمارے درمیان زیادہ عرصہ نہیں رہیں گے" اور

ایسا ہی ہوا۔ اس ملاقات کے کچھ عرصہ بعد مجھے راولپنڈی میں اطلاع ملی کہ بخاری صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ہم نے ان کی وفات کے سلسلہ میں طویل دورانیہ کا ایک بہت معیاری پروگرام پاکستان ٹیلی ویژن سے نشر کیا۔ اس پروگرام کی ترتیب اور تہذیب میں خود ان کا بڑا حصہ تھا۔ چونکہ ہم نے ان کا انٹرویو اس غرض سے پہلے ہی ریکارڈ کیا ہوا تھا اور اس انٹرویو کے اقتباسات اس تعزیتی پروگرام کی جان تھے۔ اس پروگرام کو ناظرین نے بے حد پسند کیا۔ اخبارات نے اپنے اداریوں اور تبصروں میں سراہا مگر وزیر اعظم سیکرٹریٹ سے جو پیغام مجھے ملا' وہ یہ تھا کہ پرائم منسٹر صاحب نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ ٹیلی ویژن والوں نے بخاری صاحب کی وفات پر اس نوعیت کا پروگرام کیا ہے کہ لگتا ہے وہ کوئی سربراہ مملکت تھے۔" میں نے اس کوتاہی پر افسران بالا سے معافی مانگ لی۔ اب میں انہیں کیسے سمجھاتا کہ سید ذوالفقار علی بخاری کا رتبہ کسی سربراہ مملکت سے کم نہیں تھا۔ وہ بلاشبہ نشریات کی مملکت کے سربراہ تھے۔

خواجہ معین الدین

یہ ممکن نہیں ہے کہ پاکستان میں اسٹیج ڈرامے کا ذکر ہو اور خواجہ معین الدین کا نام نہ آئے۔ وہ بلاشبہ تھیٹر کے حوالے سے ملک کے سب سے بڑے ڈرامہ نگار تھے۔ انہوں نے تھوڑے عرصے میں کم ڈرامے لکھے مگر بہت شہرت پائی۔

خواجہ معین الدین حیدر آباد دکن کے رہنے والے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم حیدر آباد کے مدرسوں اور اعلیٰ تعلیم حیدر آباد کی معروف جامعہ عثمانیہ میں ہوئی جہاں سے انہوں نے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ ایم اے کا امتحان انہوں نے 1948ء میں زوال حیدر آباد کے بعد پاکستان آ کر سندھ یونیورسٹی سے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ پیشہ کے اعتبار سے خواجہ معین للدین ایک مدرس تھے اور انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں انہوں نے بڑی محنت مشقت کے بعد 1949ء میں بچوں کے لیے ایک تعلیمی درسگاہ کی بنیاد ڈالی۔ اس اسکول کے قیام کے سلسلہ میں فنڈ جمع کرنے کے لیے انہوں نے اپنا مشہور ڈرامہ ”زوال حیدر آباد“ لکھا۔ اس کھیل کی ساری آمدنی اسکول کو دی گئی۔ خواجہ معین الدین تاحیات اس تعلیمی درسگاہ سے وابستہ رہے اور اس کے فروغ کے لیے کوشاں رہے۔ جہالت کے خلاف جہاد اور تعلیم کے فروغ کے لیے کوشش ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے نہ صرف انہوں نے ایک معیاری تعلیمی درسگاہ قائم کی بلکہ اپنے ڈراموں کے ذریعہ بھی بڑے موثر انداز میں یہ خدمت انجام دی۔ ان کے سارے کھیل ایسے موضوعات پر ہیں جو قومی نوعیت کے ہیں۔ ہر کھیل کا کوئی مقصد ہے اور ہر کھیل میں ان کا پیغام بہت واضح ہے۔ برصغیر کے اردو تھیٹر کے حوالے سے یہ ایک بالکل نئی بات ہے۔ اس پہلو پر اظہار رائے کرتے ہوئے بابائے اردو مولوی عبدالحق نے خواجہ معین الدین کے ڈراموں کے سلسلے

میں لکھا تھا "پہلے اردو تھیٹر کے لیے جو ڈرامے لکھے جاتے تھے' وہ یا تو محض خیالی ہوتے تھے یا پرانے قصوں اور داستانوں پر مبنی ہوتے تھے یا ترجمے۔ ان میں گانوں کی بھرمار ہوتی تھی۔ ہر شخص گا کر بات کرتا اور گا کر جواب دیتا یا پر تکلف مضحکہ خیز مقفا عبارت میں۔ زندگی سے ان ڈراموں کا کوئی تعلق نہ تھا۔ بعض ڈرامے ایسے بھی لکھے گئے جن کا تعلق زندگی کے واقعات سے ہے مگر اسٹیج کرنے کے قابل نہ تھے۔" لیکن خواجہ معین الدین کے ڈرامے "لال قلعہ سے لالو کھیت" کے بارے میں مولوی صاحب کی رائے یہ ہے کہ "یہ کھیل حقیقی واقعات پر مبنی ہے۔ حقیقی واقعات کو ڈرامائی شکل میں اس طرح پیش کرنا کہ اصل زندگی کا نقشہ کھنچ جائے' بڑا کمال ہے اور معین الدین صاحب نے اس کا حق ادا کر دیا ہے۔" مولوی عبدالحق کا یہ تبصرہ خواجہ معین الدین کے سارے ڈراموں پر صادق آتا ہے۔ مجھے اس بات سے مکمل اتفاق ہے کہ اردو زبان میں ایسے سچے' شگفتہ اور حقیقت پر مبنی ڈرامے کسی اور نے نہیں لکھے۔ ظرافت' شگفتگی اور طنز و مزاح کے پیرائے میں بات کہنے کا جو ڈھنگ خواجہ معین الدین کو آتا ہے' وہ کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔

خواجہ معین الدین سے میری ملاقات سب سے پہلے کب اور کہاں ہوئی' یہ تو اب مجھے یاد نہیں مگر اتنا یاد ہے کہ جب ہم رسمی طور پر پہلی مرتبہ ملے تو ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ خواجہ معین الدین کی ذات تو کراچی میں رہنے والوں کے لیے کسی تعارف کی محتاج تھی ہی نہیں مگر میں بھی ان کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم ایک بار رسمی طور پر متعارف ہوگئے تو بس پھر ملتے ہی چلے گئے اور ذہنی یگانگت اور خیالات کی ہم آہنگی کے سبب دو چار ہی ملاقاتوں میں قربت اور محبت کے اس درجہ پر پہنچ گئے جہاں پہنچنے کے لیے عام حالات میں برسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس بے تکلفی اور قربت کی سب سے بڑی وجہ تو یہ تھی کہ ہمارے درمیان کسی "کام" یا "غرض" کا رشتہ نہیں تھا۔ اس لیے یہ تعلقات بہت جلد دوستی کی صورت اختیار کر گئے۔ چونکہ یہ کلیتاً خلوص اور بے غرضی پر مبنی تھے۔ دوسری قدر مشترک ڈرامہ سے ہمارا لگاؤ اور اس فن سے دیوانگی کی حد تک عشق تھا۔

یہ 1950ء کے عشرے کا آخری زمانہ تھا۔ میں نے تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ریڈیو پاکستان میں پروڈیوسر کی حیثیت سے ملازمت کر لی تھی اور ڈرامہ سیکشن کا انچارج تھا۔ ریڈیو پاکستان کراچی پر ان دنوں حیدر دکن سے آئے ہوئے دوستوں کا راج تھا۔

مرزا ظفرالحسن' محمد عمر مہاجر' مجید فاروقی' وراثت مرزا' عبدالماجد' احمد رشدی' بدر رضوان' احمد عبدالقیوم' حمایت علی شاعر اور انور عنایت اللہ وغیرہ۔ نشریات کی دنیا کے آسمان کے ستاروں کی یہ کہکشاں کراچی کے براڈکاسٹنگ ہاؤس میں اتر آئی تھی۔ یہ سارے لوگ خواجہ معین الدین کے پرانے شناسا تھے۔ ان میں سے بہت سے ان کے نیاز مند تھے اور بہت سے ایسے تھے جن کے خواجہ معین الدین نیاز مند تھے۔

اس زمانہ کا ریڈیو پاکستان آج سے بہت مختلف تھا۔ دراصل نشریات تو دو تین گھنٹے صبح کے اوقات میں اور پانچ چھ گھنٹے رات کو ہوتی تھیں مگر ریڈیو اسٹیشن پر سارا دن بڑی رونق اور گہما گہمی رہتی تھی۔ یہ وہ دن تھے جب بندر روڈ پر واقع ریڈیو پاکستان کا براڈکاسٹنگ ہاؤس کراچی شہر کا سب سے بڑا ادبی اور ثقافتی مرکز سمجھا جاتا تھا۔ ہر وقت میلہ سا لگا رہتا تھا۔ شہر کے سارے دانشور' مشہور شاعر' نامور ادیب' مقبول گلوکار اور اداکار' معروف صحافی' غرض ادب' آرٹ' موسیقی' مصوری اور صحافت کے شعبوں سے تعلق رکھنے والی کوئی بھی اہم شخصیت ایسی نہ تھی جو اگر روزانہ نہیں تو کم از کم ہفتے میں ایک دوبار کراچی ریڈیو اسٹیشن کا چکر نہ لگائے۔ خواجہ معین الدین کا بھی یہی طریقہ تھا۔ انہیں جب فرصت ملتی سیدھے ریڈیو اسٹیشن آتے۔ احباب سے ملتے۔ ادبی' ثقافتی اور سیاسی موضوعات پر ہونے والے تبصروں اور بحثوں میں حصہ لیتے۔ گپ لگاتے اور چلے جاتے۔ نہ انہیں کسی سے کوئی ذاتی کام ہوتا تھا۔ نہ وہ ریڈیو کے کسی پروگرام میں حصہ لیتے تھے۔ نہ ریڈیو کے لیے کچھ لکھتے تھے۔ ریڈیو اسٹیشن پر ان کی آمد محض دوستوں سے ملاقات کی غرض سے ہوتی تھی اور دوستوں کے اس حلقہ میں میں بھی شامل تھا بلکہ میرا نام ان کی ترجیحات کی فہرست میں بہت اونچا تھا۔ وہ مجھے آغا خان کہہ کر پکارتے تھے اور میں جواب میں انہیں معین خان کہتا تھا۔

ہماری ملاقاتوں نے کچھ عرصہ بعد ایک اور طرح کے تعلقات کو جنم دیا جو پیشہ ورانہ نوعیت کے تھے۔

ایک دن معین خان نے مجھ سے کہا کہ ملک میں ڈرامہ کے فروغ اور مستحکم بنیادوں پر اسٹیج کے قیام کے لیے بہت سنجیدہ کوششوں کی ضرورت ہے اور ایسی کوششیں انفرادی طور پر نہیں کی جا سکتیں' لہٰذا کیوں نہ ہم ایک ایسی انجمن قائم کریں جو اسٹیج سے منسلک ادیبوں' ہدایتکاروں اور دوسرے کارکنوں کی انجمن ہو۔ کچھ دن غور و خوض کے بعد اور دوسرے

دوستوں سے مشورے کے ساتھ ہم نے "ڈرامہ گلڈ" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس کے پہلے صدر خواجہ معین الدین اور سیکرٹری میں تھا۔ کچھ سرکاری نوعیت کے اعتراضات کے سبب میں نے کچھ عرصہ بعد گلڈ کی سیکرٹری شپ خواجہ معین کے ایک قریبی دوست ڈاکٹر وحید کے حوالے کر دی لیکن اس کی پیشہ ورانہ کارکردگیوں اور دیگر کاموں میں اسی طرح حصہ لیتا رہا۔ ڈرامہ گلڈ کو پہلے ہی دن ڈراموں کا ایک بڑا خزانہ ہاتھ آگیا جو ہم نے گلڈ کے بینر کے تحت اسٹیج کرنا شروع کر دیئے۔ یہ ڈرامے خواجہ معین الدین کے لکھے ہوئے تھے جو گزشتہ دس بارہ برسوں میں بے حد شہرت حاصل کر چکے تھے۔ ملک کے مختلف شہروں میں جہاں جہاں بھی یہ ڈرامے اسٹیج کیے گئے، بہت مقبول ہوئے اور یوں ڈرامہ گلڈ نے بڑی کامیابی کے ساتھ اس کام کا آغاز کیا جس کے لیے یہ قائم کیا گیا تھا۔

ڈرامہ گلڈ کے قیام نے ہمارے تعلقات پر یہ اثر ڈالا کہ ہم پہلے کی نسبت زیادہ ایک دوسرے سے ملنے لگے۔ ہر دوسرے تیسرے دن سہ پہر کے بعد خواجہ معین الدین براڈ کاسٹنگ ہاؤس آجاتے۔ وہ عام طور پر چار، چھ آدمیوں کے جلو میں آتے تھے جن میں اکثر اوقات ڈاکٹر وحید، اکبر حسینی، مسلم ضیائی، عزیز کارٹونسٹ، صمدانی، ڈاکٹر مختار صدیقی اور کبھی کبھی نظر حیدر آبادی اور ابراہیم جلیس بھی ہوتے تھے۔ دفتر کے علاوہ اب ہمارا ایک دوسرے کے گھر بھی آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ چھٹی کے دن یا کبھی عام دنوں میں شام کے وقت یا تو میں ٹہلتا ہوا حیدر آباد کالونی چلا جاتا یا پھر وہ مارٹن روڈ میرے گھر آجاتے۔ ڈرامے اسٹیج کرنے کی غرض سے مجھے خواجہ معین کے ساتھ کراچی سے باہر جانے کا بھی اتفاق ہوا اور یوں مجھے انہیں اور زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

خواجہ معین بڑے وضع دار آدمی تھے۔ لانبا قد، فربہ جسم، گہرا سانولا رنگ جس میں بڑی کشش تھی، مہربان چہرہ، دردمند آنکھیں۔ یہ تھا ان کا سراپا۔ وہ ہمیشہ کھلے پائینچوں کا حیدر آبادی پاجامہ اور کرتا پہنتے تھے اور گھر سے شیروانی پہنے بغیر کبھی باہر نہیں نکلتے تھے۔ ان کی آواز بھاری اور لہجہ حلاوت اور مٹھاس سے بھرا تھا۔ اچھے کھانوں کا ذوق رکھتے تھے اور چائے اور تمباکو نوشی کے شوقین تھے۔ ہر وقت ان کے ہاتھ میں بڑھیا قسم کی سگریٹ کا پیکٹ ہوتا تھا۔ ایک بار حیدر آباد دکن گئے تو لوٹتے ہوئے کئی کارٹن ایک مخصوص برانڈ کی سگریٹ کے لے آئے جو پاکستان میں میسر نہ تھی۔ ان کی صحبت سے بھانت بھانت کے لوگ لطف اندوز

ہوتے تھے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور پڑھے لکھے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں سے لے کر ڈراموں میں ایکسٹرا کے رول کرنے والے ایکٹروں اور اسٹیج پر پس پردہ کام کرنے والے کاریگروں اور مزدوروں تک سب ہی سے ان کا براہ راست تعلق رہتا اور وہ ہر کسی سے اسی کے معیار اور اس کی دلچسپی کی باتیں کرتے تھے۔ وہ تھیٹر میں کام کرنے والے ان چھوٹے اور غریب کارکنوں کی بھی اتنی ہی عزت کرتے تھے۔ منو بھائی کا کہنا ہے کہ ایک دن وہ راولپنڈی میں ان کے گھر آئے ہوئے تھے۔ آریہ محلہ کے قریب لیاقت باغ میں عید کا میلہ شروع ہو چکا تھا اور اس میلہ میں عالم لوہار اور منظور جھلا اپنے اپنے تھیٹر لے کر آئے ہوئے تھے اور راولپنڈی کے شہریوں کو اپنی کڑکتی، گونجتی، لہراتی اور بل کھاتی آواز میں اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔ انہوں نے معین الدین کی توجہ بھی حاصل کر لی۔ میں نے خواجہ صاحب کو بتایا کہ عالم لوہار کے جسم پر چاقو کے چھ اور منظور جھلا کے جسم پر دس زخم ہیں۔ یہ زخم انہیں اپنے تھیٹر، اپنے فن اور فنکاروں کی حفاظت کرتے وقت آئے ہیں۔ خواجہ معین الدین نے کہا "وہ خوش قسمت ہیں کہ زخم دیکھ اور گن سکتے ہیں۔" پھر بولے "میں تھیٹر کے دانشوروں سے زیادہ تھیٹر کی خاطر نگری نگری خاک چھاننے والے ان فنکاروں کی قدر کرتا ہوں۔"

خواجہ معین الدین بلاشبہ اردو کے عظیم ڈرامہ نگار تھے۔ وہ صرف ڈرامہ لکھتے ہی نہیں تھے۔ خود ڈرامے پیش بھی کرتے تھے۔ جو لوگ ڈرامہ کے فن سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ڈرامہ کاغذ کے صفحات کے لیے نہیں ہوتا، اسٹیج پر پیش کرنے کے لیے ہوتا ہے اور یہ پیشکش ہدایتکار، تزین کار، اداکار اور دوسرے کارکنوں کی اجتماعی کاوشوں سے وجود میں آتی ہے۔ خواجہ معین الدین کو یہ فن آتا تھا۔ وہ ڈرامہ لکھتے تھے، اس کی ہدایتکاری کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اس کے سیٹ ڈیزائن میں رہنمائی کرتے تھے اور اپنی ڈرامہ ٹیم کے پروڈکشن منیجر یعنی منتظم اعلیٰ کی ذمہ داری بھی سنبھالتے تھے۔ چونکہ وہ ان سارے مرحلوں اور تمام مشکلوں سے آگاہ تھے جو ڈرامہ کرنے والوں کو پیش آتی ہیں، اس لیے وہ اسکرپٹ لکھتے وقت ان ساری باتوں کو پیش نظر رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کے ڈرامے ایسے ہیں کہ جو ہمارے وسائل اور حالات کو سامنے رکھ کر لکھے گئے اور بغیر کسی مشکل کے پیش کیے جاتے رہے۔

بحیثیت ہدایتکار خواجہ معین الدین اس مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے جو فنکاروں کو زیادہ سے زیادہ آزادی دینے کا قائل ہے۔ اداکاروں کے انتخاب میں وہ نہایت محتاط تھے اور

بڑے سوچ بچار کے بعد کردار کی مناسبت سے اداکار منتخب کرتے تھے مگر جب ایک بار کوئی رول کسی کو دے دیتے تھے تو پھر اس کی ادائیگی میں بڑی حد تک ایکٹر کو خود مختاری حاصل ہوتی تھی۔ وہ خود کر کے دکھاؤ والے ہدایتکار نہیں تھے بلکہ گفتگو کے ذریعہ اداکار کو اس کا کردار سمجھاتے تھے اور اس موقع پر باہمی صلاح مشورے کے اصول کو پیش نظر رکھتے تھے۔ اگر ان کی ٹیم کا کوئی رکن مناسب مشورہ دے تو اسے قبول کر لیتے تھے۔ اس طرح وہ نہ صرف اداکار کو کردار کی اصل روح سے واقفیت حاصل کرنے میں مدد دیتے تھے بلکہ خود بھی اندازہ لگا لیتے تھے کہ ان کے تخلیق کیے ہوئے کردار کو دوسروں نے کس طرح سمجھا ہے۔ ریہرسلوں کے دوران حصہ لینے والوں کو اظہار خیال کی مکمل آزادی ہوتی تھی اور باہمی گفت و شنید سے کرداروں کو سنوارنے اور ان کی تراش خراش اور وضع قطع کی کمزوریوں کو دور کرنے میں بڑی مدد ملتی تھی۔ غرض ان کے ڈراموں کی پروڈکشن میں مکمل طور پر جمہوریت کا طریقہ اپنایا جاتا تھا لیکن اب اس کا یہ مطلب بھی نہ سمجھا جائے کہ ہر کسی کو کھلی چھٹی تھی کہ جو چاہے کرے۔ ڈسپلن کے معاملے میں خواجہ معین بہت سخت گیر تھے۔ باہمی صلاح مشورے کے بعد جو باتیں طے ہو جاتیں' ان پر سختی سے عمل کرتے اور پھر کسی کو کسی قسم کی رد و بدل کی اجازت نہ ہوتی تھی۔

خواجہ معین الدین ایک عملی آدمی تھے۔ ان کے پیش نظر نہ صرف اپنے ناظرین کے ذوق اور پسند کا خیال ہوتا تھا بلکہ ڈرامہ کی تحریر اور پیشکش میں حائل مشکلات اور دشواریوں کا بھی انہیں بہت احساس رہتا تھا۔ مثال کے طور پر ان کے سارے ڈراموں میں عورتوں کے کردار کہیں نظر نہیں آتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں جب انہوں نے یہ ڈرامے تخلیق کیے' پاکستان میں خواتین کے اسٹیج پر کام کرنے کا رواج نہیں تھا' لہٰذا انہوں نے اپنے ڈراموں میں نسوانی کردار سرے سے رکھے ہی نہیں اور داد دینی پڑتی ہے کہ یہ کام اس خوبصورتی اور مہارت سے کیا کہ دیکھنے والوں کو کبھی اس کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ اسی طرح ان کے ڈراموں کے سیٹ بڑے سادہ اور سستے ہوتے تھے اور بطور خاص اس بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ آسانی سے تبدیل ہو سکیں اور ایک شہر سے دوسرے شہر جاتے ہوئے ساتھ لے جائے جا سکیں۔

ایک منتظم کی حیثیت سے انہوں نے اپنی ٹیم کے لیے جو مثال قائم کی' وہ قابل تحسین

ہے۔ ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ مصنف، ہدایتکار اور منتظم اعلیٰ ہونے کے باوجود خود کو ٹیم کا ایک عام رکن سمجھتے تھے اور کسی قسم کا ترجیحی برتاؤ یا طریقہ اپنے لیے قبول نہ کرتے تھے۔

مجھے یاد ہے 66-1965 میں جب میں پاکستان ٹیلی ویژن کے لاہور اسٹیشن سے منسلک تھا، خواجہ معین الدین اپنی ٹیم کے ساتھ لاہور کی آرٹ کونسل میں ڈرامہ اسٹیج کرنے کراچی سے آئے۔ ان کی ٹیم پندرہ بیس افراد پر مشتمل تھی جن میں ڈرامے کے اداکار اور پس پردہ کام کرنے والے کارکن شامل تھے۔ انہوں نے کسی ہوٹل میں ٹھہرنے کی بجائے آرٹ کونسل کی عمارت کے ایک بڑے ہال میں ٹھہرنا پسند کیا۔ چونکہ اس میں پیسوں کی بچت تھی اور وہ کم سے کم خرچ سے ڈرامہ پروڈیوس کرنے کے قائل تھے تاکہ اپنے ساتھیوں میں زیادہ سے زیادہ معاوضہ تقسیم کر سکیں۔ لاہور میں ان دنوں کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ میں شام کو ملنے کے لیے آرٹ کونسل پہنچا تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ جہاں خواجہ معین کی ٹیم قیام پذیر تھی، وہاں ہیٹروں وغیرہ کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ دیواروں میں بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں جن کی درازوں سے سرد ہوا آ رہی تھی۔ میں نے دیکھا فرش پر برابر برابر بہت سے بستر لگے ہوئے ہیں اور میرے بہت سارے جانے پہچانے دوست کمبل اور لحافوں میں لپٹے لاہور کی سردی سے نبرد آزما ہیں۔ سب سے پہلا فرشی بستر خواجہ معین الدین کا تھا۔ اس دن ان کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ دراصل لاہور آتے ہی ان کو زکام، کھانسی نے پکڑ لیا تھا۔ میں نے انہیں ساتھ لے جانا چاہا لیکن وہ کسی طرح نہ مانے۔ وہ بضد تھے کہ جہاں میری ٹیم کے باقی افراد رہیں گے، وہیں میں بھی رہوں گا۔ خود ان کے ساتھیوں نے مجھے کہا کہ آپ کسی طرح خواجہ صاحب کو اپنے گھر لے جائیں۔ ہماری بھی خواہش ہے مگر خواجہ صاحب ایسی باتیں ماننے والے کہاں تھے۔

ڈرامہ سے ان کو والہانہ عشق تھا۔ وہ نہ صرف اپنی تحریر کے ذریعہ بلکہ عملی طور پر بھی ایسا کرنا چاہتے تھے جس سے ڈرامہ اور ڈرامہ کے فن سے وابستہ فنکاروں کا وقار بلند ہو۔ انہوں نے اس ضمن میں چند اصول وضع کیے ہوئے تھے اور بڑی سختی سے ان پر عمل کرتے تھے۔ مثلاً مجھے یاد ہے 1959ء میں ایک بار میں اور وہ نئے نئے قائم ہونے والے بیورو آف نیشنل ری کنسٹرکشن میں ڈرامہ اسٹیج کرنے کے لیے کچھ رقم حاصل کرنے گئے۔ وہاں ایک بڑے افسر سے ملاقات تھی۔ یہ ایوب خان کے مارشل لاء کا زمانہ تھا اور وزارت اطلاعات و

نشریات میں قائم ہونے والا یہ نیا نیا ادارہ ثقافتی اور ادبی نوعیت کی تقریبات اور منصوبوں کے لیے مالی معاونت فراہم کیا کرتا تھا۔ سارے معاملات طے ہو جانے کے بعد اجازت چاہنے سے پہلے جب ہم نے اس بڑے افسر کا شکریہ ادا کر کے جانے کی اجازت چاہی تو چلتے چلتے خواجہ معین الدین ایک دم رکے اور اس افسر سے کہا "اور صاحب ایک بات اور نوٹ کر لیجیے۔ آپ نے مالی امداد فراہم کرنے کا جو فیصلہ کیا' اس کے لیے ہم شکر گزار ہیں مگر جب ڈرامہ اسٹیج ہو تو ہم سے مفت پاس نہ مانگیے گا۔" خواجہ معین الدین اس بات کے سخت مخالف تھے کہ ڈرامہ مفت میں دیکھا جائے۔ ان کو مفت دعوت نامے مانگنے والوں پر بہت غصہ آتا تھا۔ ایک بار کراچی کے تھیوسوفیکل ہال میں ڈرامہ گلڈ کا ایک کھیل پیش کیا جا رہا تھا۔ شام سے کچھ پہلے خواجہ معین نے جیب سے بہت سے کرنسی نوٹ نکالے اور اپنے کسی ساتھی کو دیتے ہوئے کہا کہ آج کے شو کے دس ٹکٹ خرید لاؤ۔ میں نے پوچھا معین خان کس لیے؟ کہنے لگے "ڈپٹی کمشنر اور انکم ٹیکس والوں کی طرف سے ڈرامہ دیکھنے کے لیے سخت دباؤ ہے۔ اب ظاہر ہے ٹکٹ وہ خریدنے کے عادی نہیں۔ مفت ڈرامہ دکھانے کا میں قائل نہیں ہوں۔ بس یہی ایک طریقہ ہے کہ ان کے لیے میں اپنی جیب سے ٹکٹ خریدوں۔" یہ ان کی اصول پسندی تھی ورنہ ڈرامہ کے مصنف' ہدایتکار اور ڈرامہ گلڈ کے صدر خواجہ معین الدین کے لیے یہ کیا مشکل تھا کہ ان اعلیٰ سرکاری عہدیداروں کے لیے کومپلیمنٹری پاس بھجوا دیں مگر کومپلیمنٹری پاس کے نام کی کوئی چیز تو ہمارے ڈرامہ گلڈ میں ہوتی ہی نہیں تھی اور یہ فیصلہ خود خواجہ معین کا تھا۔

خواجہ معین انسانی مساوات کے بڑے علمبردار تھے۔ چھوٹے بڑے کی تفریق کے بے حد خلاف تھے۔ غرور اور تکبر کے الفاظ ان کی لغت میں شامل ہی نہیں تھے۔ نہ وہ کسی پر رعب ڈالتے تھے اور نہ کسی سے مرعوب ہوتے تھے۔ اول تو صاحبان اقتدار اور افسران بالا سے وہ کوئی واسطہ ہی نہ رکھتے تھے مگر کبھی ایسا ہوتا تو ان کا رویہ بڑے سے بڑے اور سینئر سے سینئر افسر کے ساتھ وہی ہوتا تھا جو ایک معمولی آدمی کے ساتھ۔ خواجہ معین کو افسر شاہی سے چڑ تھی۔ ان کا خیال تھا کہ حکومت پاکستان کے زیادہ تر بڑے افسران عیش پسند' سست المزاج' مغرور اور ناقابل اعتماد ہیں۔ ان میں وہ سارے عیب ہیں جو انگریز افسروں میں ہوتے تھے مگر ان کی کوئی خوبی نہیں ہے۔ چونکہ خواجہ معین نے حیدر آباد دکن کی نیم خود مختار قسم کی

ریاست میں پرورش پائی تھی' اس لیے ان کو انگریز سرکار کا براہ راست تجربہ نہیں تھا۔ انہوں نے فرنگیوں کے طور طریقوں کے بارے میں یا تو دوسروں سے سنا تھا یا کتابوں اور رسالوں میں پڑھا تھا۔ 1948ء میں پاکستان آنے کے بعد پہلی بار جب ان کا واسطہ پاکستان کی افسر شاہی سے پڑا تو انہیں اس بات سے بڑی مایوسی ہوئی کہ جو کچھ وہ سرکار انگریزی کے بارے میں سنتے تھے' وہی کچھ اس آزاد مملکت کی حکومت کے عہدیداروں پر بھی صادق آتا ہے۔ وہ ایک مستحکم عقید کے مسلمان تھے اور مساوات محمدی ﷺ کے زبردست پیرو کار تھے۔ لوگوں کی عزت کرنا ان کا شعار تھا۔ منو بھائی نے خواجہ معین کی وفات پر اپنے کالم میں خواجہ معین کی شخصیت کے اسی پہلو کا ذکر کرتے ہوئے ایک واقعہ لکھا تھا۔

''کراچی میں ایک شام میں یاور حیات کے ساتھ ٹیلی ویژن کے مرکزی فلم یونٹ کے لیے ایک کہانی لکھوانے کے لیے خواجہ صاحب کے پاس حاضر ہوا۔ کارٹونسٹ عزیز بھی وہاں موجود تھے۔ خواجہ صاحب نے جس انداز میں ہمارا استقبال کیا اور جس قدر تواضع کی' اس نے ہمیں اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا کہ ہم کوئی بہت اہم اور بڑے آدمی ہیں اور خواجہ صاحب کو ہم سے کچھ زیادہ ہی محبت ہے مگر ہمارے وہاں بیٹھے بیٹھے کورنگی سے ایک رکشہ والا خواجہ صاحب سے ملنے آگیا۔ خواجہ صاحب نے اس کی بھی ویسی ہی خاطر مدارت کی اور اسی توجہ سے باتیں سنیں جس توجہ سے ہماری باتیں سن رہے تھے۔ تب معلوم ہوا بڑے آدمی ہم نہیں' خواجہ صاحب ہیں۔'' خواجہ معین کا عقیدہ تھا کہ خلق خدا کے ساتھ احترام اور عزت و تکریم کے ساتھ پیش آؤ اور اگر ہو سکے تو ہر ضرورت مند کی مدد کرو کہ ایسی نیکی کا اجر اس دنیا میں بھی ملتا ہے اور آخرت میں بھی۔ غریبوں اور حاجت مندوں کی مدد کرنا ان کا شعار تھا اور مجھے کئی ایسے واقعات کا علم ہے جہاں خواجہ معین نے ضرورت مندوں کی مالی معاونت کی مگر کسی کو اس کی کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔

خواجہ معین کے لکھے ہوئے سب ڈراموں میں ان کے کردار کی یہ جھلک نمایاں طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ ان کے سارے ڈراموں کا ایک منفرد پہلو یہ ہے کہ یہ سب معاشرتی' قومی اور انسانی مسائل کے موضوعات پر ہیں۔ ہر ڈرامہ کا کوئی مقصد ہے اور ہر ڈرامے میں کوئی پیغام ہے۔ کراچی کے اسٹیج پر پیش کیا جانے والا پہلا کھیل ''زوال حیدر آباد'' ہندوستان کی سب سے بڑی مسلم ریاست پر بھارتی سامراج کے ظلم و تشدد کی کہانی

ہے۔ ''لال قلعے سے لالو کھیت'' ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرنے والے لاکھوں مہاجرین اور پاکستان کے ابتدائی زمانے کی دردانگیز داستان ہے۔ ''مرزا غالب بندر روڈ پر'' پاکستان کے اس وقت کے دارالحکومت کراچی کی معاشرتی زندگی کا عکس ہے۔ ''وادئ کشمیر'' مجبور و لاچار کشمیریوں پر ڈھائے جانے والے ظلم و ستم کی کہانی ہے۔ یہ کھیل خواجہ معین نے پہلے ''نیا نشان'' کے نام سے اسٹیج کیا تھا اور نیا نشان قائد ملت لیاقت علی خان کا وہ مکا تھا جو انہوں نے دشمن کو دکھایا تھا۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ خواجہ معین الدین نے جس موضوع کا بھی انتخاب کیا' اس کا تعلق ہماری قومی زندگی سے ہے۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ خواجہ معین الدین ایک پکا مسلمان' سچا پاکستانی اور انتہا درجے کا انسان دوست تھا۔ قوم کو اجتماعی مشکلات اور مسائل میں گھرا دیکھ کر اس کا دل روتا تھا اور لوگوں کی انفرادی مصیبتوں اور دکھوں سے اس کا سکون اڑ جاتا تھا۔ اسی لیے اس نے جب بھی قلم اٹھایا' ہمیشہ ایسے ہی موضوعات پر لکھا۔

خواجہ معین نے اپنی بات کہنے کے لیے طنز کے پیرائے کو منتخب کیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جو بات مسکراہٹوں اور قہقہوں کے ریشم میں لپیٹ کر کہی جاتی ہے' اس کی چبھن کم ہو جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اللہ نے انہیں طنز و مزاح کی جو صلاحیت عطا کی تھی' اس کا استعمال نہ کرنا کفران نعمت ہوتا۔ ان کے فقروں کی کاٹ اور ان کے طنزیہ جملوں کی تراش خراش ایسی ہوتی تھی کہ انسان سن کر درد سے تڑپ اٹھتا تھا مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ برقرار رہتی تھی۔ خواجہ معین بے حد حساس انسان تھے۔ وہ پاکستان اور پاکستان کی زمین سے دیوانگی کی حد تک پیار کرتے تھے اور اسی لیے جب وہ معاشرے میں پھیلتی ہوئی خرابیوں اور اخلاقی اقدار کے انحطاط کو محسوس کرتے تو تلملا اٹھتے تھے۔ جب روز بروز بڑھتے ہوئے سیاسی انتشار اور منافقت کی گرم بازاری کو دیکھتے تو دل پر ناقابل برداشت بوجھ محسوس کرتے تھے۔ ان کی یہ کیفیت ان کے تمام ڈراموں میں صاف نظر آتی ہے۔ دور حاضر کے معروف دانشور جناب مختار مسعود نے خواجہ معین کی اسی صفت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ''خواجہ معین نے اپنی تمام عمر ایک ہی موضوع پر لکھنے میں صرف کر دی۔ ان کی پوری فنی صلاحیت بھی اسی موضوع کے حصہ میں آئی۔ یہ موضوع نظریاتی ہے اور اسباب عروج و زوال ملت سے تعلق رکھتا ہے۔ پرانی قدروں کے تحفظ کے لیے انہوں

نے ”پرانے محل“ لکھا۔ پرانی بستیوں کے لٹ جانے کی داستان ”زوال حیدر آباد“ میں بیان کی۔ نئی بستیوں کی نوید لالوکھیت کے حوالے سے سنائی۔ جنگ آزادی کشمیر کی کہانی ”نیا نشان“ کے نام سے قلمبند کی۔ لوگوں کو قومی مسائل سے لاعلم پایا تو ”تعلیم بالغاں“ کا انتظام کیا۔ لوگوں نے راہ گم کردی تو وہ سڑک پر مرزا غالب کو جن کا آبائی پیشہ سپہ گری تھا، سیاسی اور سماجی مسائل کی ٹریفک کا سپاہی بنا کر لے آئے۔ خواجہ معین اتنے بڑے فنکار تھے کہ نظریاتی وابستگی کی شدت کے باوجود ان کے ڈراموں نے ہمیشہ تکنیکی اور فنی کمالات کی بنیاد پر خاص وعام سے داد پائی۔ ان پر کبھی ناصحانہ بوجھل پن، اصلاحی مغز چاٹ یا اعصابی تھکن تقسیم کرنے والے ڈرامہ نویس کا الزام نہ آیا۔ وہ محتسب، مبلغ اور مناظر نہ تھے۔ وہ تو معلم، مورخ اور فنکار تھے۔ ادیب کی حیثیت سے خواجہ معین نے کبھی روایتی پرواز تخیل کا سہارا نہیں لیا، لہٰذا ان کے ڈرامے نہ ہوائی قلعے ہیں نہ ریت کے محل۔ نہ شیشے کے گھر، یہ تو سیدھی سادھی زندگی کی مدح میں لکھے ہوئے قصیدے ہیں جن میں نہ تشبیب ہے، نہ گریز۔ خواجہ معین نے تخیل کو روزمرہ زندگی کے لالوکھیت میں پابند کیا اور تخلیق سے سلامت روی کی ضمانت لے کر اسے صرف بندر روڈ تک جانے کی اجازت دی۔ ڈرامہ لکھتے وقت وہ حقیقت سے اس قدر قریب ہو جاتے ہیں کہ نقل میں ہوبہو اصل کی سی صورت اور حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہی زندگی کا عامیانہ پن، وہی جذب کی صداقت، وہی جذبہ کی حماقت، وہی مصلحت کی منافقت۔ عام زندگی میں انہیں قدم قدم پر کوتاہی یا محرومی کی ایک نئی داستان مل جاتی ہے اور بڑی خوبصورتی سے اسے ڈرامائی منظر یا کیفیت میں تبدیل کر کے اپنے کسی ڈرامہ کا حصہ بنا دیتے ہیں۔ محرومی کا ذکر ہو تو اس میں مزاح شامل کر دیتے ہیں تاکہ وہ دلچسپ اور قابل توجہ بن جائے۔ کوتاہی کی بات ہو تو وہ اسے طنزیہ پیرائے میں بیان کرتے ہیں تاکہ بات دل کو گھائل کرتی ہوئی اس کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ خواجہ معین کی طنز میں بلا کی تندی اور تیزی ہے۔“

خواجہ معین حتی المقدور خود کو سرکاری اور نیم سرکاری اداروں سے دور ہی رکھتے تھے۔ بدقسمتی سے ریڈیو اور ٹیلی ویژن بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ چنانچہ اس کے باوجود کہ ان دونوں محکموں میں ان کے دوستوں اور نیازمندوں کی بڑی تعداد موجود تھی، انہوں نے بڑے طویل عرصہ تک ریڈیو یا ٹیلی ویژن کے لیے کچھ نہ لکھا، نہ اپنے ڈرامے

انہیں پروڈیوس کرنے کی اجازت دی اور نہ ان کے پروگراموں میں شریک ہوئے۔
صرف ایک بار 1955ء میں جب حیدر آباد سندھ کے ریڈیو اسٹیشن کا افتتاح ہوا تو سید
ذوالفقار علی بخاری کے بے حد اصرار پر انہوں نے اپنا کھیل "لال قلعے سے لالو کھیت"
ریڈیو کے لیے اسٹیج کیا جسے براہ راست حیدر آباد اسٹیشن سے نشر کیا گیا مگر اس کے بعد پھر
انہوں نے لاتعلقی اختیار کرلی اور 1970ء تک یہ لاتعلقی برقرار رہی۔ 1970ء میں جب
میں راولپنڈی' اسلام آباد ٹیلی ویژن اسٹیشن کا جنرل منیجر مقرر ہوا تو میں نے بڑی مشکل
سے خواجہ صاحب کو اس بات پر راضی کیا کہ ان کا ڈرامہ "تعلیم بالغاں" ٹیلی ویژن سے
نشر کیا جائے۔ یہ جنرل یحییٰ خان کا دور حکومت تھا اور میں سمجھتا ہوں پاکستان میں ذرائع
ابلاغ کے لیے اس سے زیادہ آزادی کا دور کبھی نہیں آیا۔ حکومت کی طرف سے ریڈیو اور
ٹیلی ویژن کی نشریات میں کسی قسم کی مداخلت نہیں تھی اور ہم مکمل آزادی کے ساتھ
پروگرام پیش کرتے تھے۔ اس مارشل لاء کے دور میں جس طرح کے پروگرام نشر ہوئے'
جمہوری حکومتوں کے زمانے میں ان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ شوکت صدیقی کے ناول
"خدا کی بستی" کی ڈرامائی تشکیل' ملک کی تمام بڑی سیاسی شخصیات کے انٹرویو کا سلسلہ جو
Inretrospect کے نام سے پیش کیا گیا' محسن شیرازی کا "گر تو برا نہ مانے" کمال احمد
رضوی کا "چیلنج ویکلی" وغیرہ ایسے پروگرام تھے جن میں کھل کر حکومت پر تنقید کی جاتی
تھی اور معاشی اور معاشرتی مسائل کو بلاخوف پیش کیا جاتا تھا۔ خواجہ معین نے ٹیلی ویژن
کی یہ بدلی ہوئی فضا دیکھی تو "تعلیم بالغاں" کو ٹیلی ویژن کے لیے ریکارڈ کرانے پر رضامند
ہوگئے مگر انہوں نے یہ شرط لگالی کہ میں اس ڈرامے کو ٹیلی ویژن کے لیے پروڈیوس
کروں گا۔ چنانچہ خواجہ معین "تعلیم بالغاں" کی پوری ٹیم کو لے کر کراچی سے راولپنڈی
آگئے اور میں نے بڑی محنت اور جانفشانی سے اس کھیل کی عکسبندی کی۔ ڈرامے کے ابتداء
میں میں نے خواجہ معین کا ایک مختصر سا انٹرویو بھی پیش کیا جس میں ڈرامے کے مختلف
پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ اظہر لودھی نے کہ جن کو میں نے خواجہ معین کا انٹرویو کرنے کے
لیے منتخب کیا تھا' ان کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ آپ کا یہ کھیل اگرچہ پندرہ
بیس برس پہلے لکھا گیا تھا مگر آج بھی اس میں وہی تازگی ہے اور جن معاشرتی اور سیاسی
مسائل کی نشاندہی کی گئی ہے' وہ آج کے دور کے مسائل معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ڈرامہ

نگاری کا کمال ہے۔ خواجہ معین نے اس کے جواب میں مختصراً کہا "اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے۔ یہ اس ملک کی بد قسمتی ہے کہ جن مسائل کو میں نے آج سے بیس برس قبل اپنا موضوع بنایا تھا' وہ آج بھی برقرار ہیں۔"

"تعلیم بالغاں" پاکستان ٹیلی ویژن کے سارے اسٹیشنوں سے نشر ہوا اور بے حد مقبول ہوا۔ تب سے آج تک یہ کھیل بارہا پی ٹی وی پر نشر ہو چکا ہے اور ڈھاکہ اسٹیشن سے 1971ء کی جنگ کے دوران اسے تقریباً چھ بار نشر کیا گیا۔ حال ہی میں این ٹی ایم نے اس کھیل کو رنگین کیمروں کے ساتھ ریکارڈ کیا اور 1997ء میں یوم آزادی کے موقع پر پیش کیا۔ جب میں کراچی میں این ٹی ایم کے لیے اس کھیل کو ریکارڈ کروا رہا تھا تو مجھے مرحوم معین خان کا وہ انٹرویو بار بار یاد آ رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ آج کم و بیش 45 سال گزر جانے کے باوجود بھی اس کھیل میں وہی تازگی موجود ہے اور واقعی وہ سارے مسائل آج بھی اسی طرح برقرار ہیں۔ میں نے ڈرامہ "تعلیم بالغاں" اتنی بار دیکھا اور پروڈیوس کیا ہے کہ مجھے اس کے سارے مکالمے ایک زمانے میں زبانی یاد تھے مگر ایک عجیب بات اس ڈرامہ میں تھی۔ میں نے جب بھی یہ ڈرامہ دیکھا' ہر بار کوئی نہ کوئی نیا پہلو سامنے آیا۔ ایک ہی سچویشن کے مکالمے کو میں نے مختلف زمانوں میں بالکل نئے انداز میں اثر پذیر ہوتے دیکھا۔ خواجہ معین کو بلاواسطہ انداز میں طنز کرنے کا فن خوب آتا تھا۔ اس ڈرامے کے بعض مکالمے تو اس فنی کمال کے اعلیٰ ترین نمونے ہیں مثلاً مولوی صاحب اتحاد' یقین اور تنظیم کے ٹوٹے پھوٹے گھڑے اپنے مدرسہ کے طالب علموں کو دکھا رہے ہیں تو کلاس کا مانیٹر ان سے سوال کرتا ہے۔ "مولوی صاحب یہ اتحاد کے ٹکڑے ٹکڑے کس نے کر دیئے؟" مولوی صاحب تاسف سے کہتے ہیں "ارے خود ہی توڑ کر پوچھ بھی رہا ہے...... تو گدو بندر کا تو نہیں ہے۔" اس پر مانیٹر اکڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور مونچھوں پر تاؤ دے کر کہتا ہے "ارے واہ...... میں تو بانس بریلی کا ہوں بانس بریلی کا" مولوی صاحب کا غصہ اپنے عروج پر پہنچ جاتا ہے اور وہ اس کا منہ چڑا کر کہتے ہیں۔ "میں تو بانس بریلی کا ہوں' بانس بریلی کا...... کھاتے پاکستان کا گاتے بانس بریلی کا...... وغیرہ وغیرہ۔" اسی طرح تاریخ کے مضمون کی کلاس میں مولوی صاحب پوچھتے ہیں کہ بتاؤ جمہوریت کے کیا معنی ہیں؟ سارے طالب علم پریشان ہو جاتے ہیں اور کھسر پھسر کرنے لگتے ہیں۔ مولوی صاحب پھر کہتے ہیں۔ "پیارے بچو...... جمہوریت کے معنی بتاؤ...... ارے

تمہیں جمہوریت کے معنی نہیں آتے!" سارے طالب علم مل کر کہتے ہیں "نہیں" مولوی صاحب کا جو فقرہ اس کے بعد ہے' وہ غور طلب ہے۔ کہتے ہیں "ارے اتنے مل کر بیٹھے ہو' پھر بھی جمہوریت کے معنی نہیں آتے؟" ڈرامہ "تعلیم بالغاں" اس قسم کے بے شمار مکالموں سے بھرا پڑا ہے۔ ایک کے بعد ایک فقرہ ایسا ہے کہ پروڈیوسر کے لیے مشکل پیدا ہو جاتی ہے کہ کتنے مکالموں کے بعد قہقہوں اور تالیوں کے لیے وقفے رکھے۔

1970ء میں جن دنوں خواجہ معین راولپنڈی ڈرامے کی ریکارڈنگ کے لیے آئے ہوئے تھے' انہیں دنوں مجھے پاکستان ٹیلی ویژن پر عام انتخابات کے لیے خصوصی ٹرانسمیشن کا جنرل منیجر مقرر کیا گیا تھا اور میں اپنی ٹیم کے ساتھ "الیکشن 70ء" کے پروگراموں کی منصوبہ بندی اور ترتیب میں مصروف تھا۔ ایک روز خواجہ معین کھانے پر میرے گھر آئے ہوئے تھے۔ وہ تعلیم بالغاں کی ریکارڈنگ دیکھنے کے بعد بہت مطمئن اور خوش تھے۔ میں نے ان کے خوشگوار موڈ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان سے کہا۔ "یار معین خان اب کہ تمہاری ٹیلی ویژن سے کٹی ختم ہو چکی ہے۔ مجھے پی ٹی وی کے الیکشن ٹرانسمیشن کے لیے ایک نیا کھیل لکھ دو۔ جانے قبولیت کی وہ کونسی گھڑی تھی' خواجہ معین راضی ہو گئے اور اگلے ہی روز انہوں نے دفتر آکر مجھے اس ڈرامے کا خاکہ سنایا جو ان کے ایک پرانے کھیل "انجمن سٹہ بازاں" کی سچویشن کو پھیلا کر بالکل نئے انداز اور نئے ماحول میں تشکیل دیا گیا تھا۔ ڈرامہ کا موضوع خالصتاً سیاسی تھا اور اس کا نام ہم نے "جلسہ عام" تجویز کیا۔ "تعلیم بالغاں" کی طرح "جلسہ عام" بھی ایک ہی سیٹ کا کھیل تھا۔ ایک اسٹیج ہے جس پر صاحب صدر کی خالی کرسی ہے۔ ایک روسٹرم ہے جہاں سے اسٹیج سیکرٹری مجمع کو مخاطب کرتا رہتا ہے اور اسٹیج کے سامنے پنڈال میں لوگوں کا ہجوم ہے۔ 1970ء میں پاکستان کی سیاست ایک نیا رخ اختیار کر رہی تھی۔ یوں تو بڑی بڑی قد آور سیاسی شخصیات تھیں مگر جن کے گرد سیاست کی ساری بازی گردش کر رہی تھی' وہ تین لوگ تھے۔ شیخ مجیب الرحمٰن' ذوالفقار علی بھٹو اور جنرل یحییٰ خان۔ خواجہ معین نے ان تینوں کے کردار اس خوبصورتی اور مہارت سے ڈرامے میں ڈالے تھے کہ پہچاننے کے باوجود کسی کے لیے اعتراض کی گنجائش نہ تھی۔ کھیل کا مرکزی خیال بڑا سیدھا سادھا تھا۔ اسٹیج پر صدارت کی خالی کرسی کے لیے بہت سے امیدوار ہیں جو باری باری آکر مجمع سے خطاب کرتے ہیں۔ مجمع میں سے لوگ فقرے بازی بھی کرتے ہیں' ہوٹ بھی کرتے ہیں اور

امیدواروں کے حق میں یا ان کے خلاف نعرے بھی لگاتے ہیں۔ اس سارے کھیل میں مرکزی حیثیت ایک نہایت بکواسی قسم کے اسٹیج سیکرٹری کو حاصل ہوتی ہے جو موقع بے موقع اشعار بھی پڑھتا ہے اور صدارت کی کرسی کے ہر امیدوار کا تعارف کراتے وقت انتہائی مضحکہ خیز اور معنی خیز صورتیں بھی پیدا کرتا ہے۔ مثلاً ایک بڑے شعلہ بیان صدارتی امیدوار کو متعارف کرواتے ہوئے مشرقی اور مغربی پاکستان کی یکجہتی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ شاعر نے کیا خوب کہا ہے:......

"ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی"

جلسہ عام چلتا رہتا ہے۔ صدارت کے امیدوار ایک ایک کر کے عوام سے خطاب فرماتے رہتے ہیں۔ کھیل اس طرح کلائمکس پر پہنچتا ہے کہ اچانک مجمع میں کھلبلی سی مچتی ہے اور پنڈال کے پیچھے کی قناتوں کے درمیان سے ایک شخص نمودار ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک دوا کی بوتل ہے اور وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اسٹیج کی طرف جاتا ہے اور بمشکل پلیٹ فارم پر چڑھ جاتا ہے اور بلا کسی تکلف کے صدارت کی خالی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ مجمع شور مچاتا ہے' اس کے خلاف نعرے لگاتا ہے۔ نووارد کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی مائیکروفون اپنے سامنے کھینچ لیتا ہے اور مجمع کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔ "میں ان سارے امیدواروں سے زیادہ اس کرسی کا اہل ہوں۔ یہ سچ ہے کہ میں رعشہ کے مرض میں مبتلا ہوں۔ چلتے ہوئے میرے قدم لڑکھڑاتے ہیں اور ہاتھوں میں لرزہ ہے۔ مگر بھائیوں کیا آپ ایک معذور انسان کی حمایت نہیں کریں گے۔ کیا آپ کے دل میں خوف خدا نہیں ہے۔ میں آپ سے اپیل کرتا ہوں' میں جس کرسی پر بیٹھا ہوں' مجھے بیٹھا رہنے دیں۔" مجمع اس اپیل سے متاثر ہو کر اس کے حق میں نعرے لگانے لگتا ہے۔ اس موقع پر اسٹیج سیکرٹری بھی اس کی طرفداری میں رطب اللسان ہو جاتا ہے اور کہتا ہے "بھائیو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی معذور اور اپاہج اس کرسی پر بیٹھتے رہے ہیں اسے بھی بیٹھنے دو۔" مجمع اس اپیل پر بڑا جذباتی ہو کر نعرے لگاتا ہے۔ "بیٹھنے دو' بیٹھنے دو" ادھر کرسی صدارت پر متمکن امیدوار خوش ہو کر جواب دیتا ہے۔ "بیٹھا ہوں" ڈرامہ جلسہ عام اسی منزل پر آ کر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ بڑے تواتر کے ساتھ مجمع اور امیدوار ایک خاص آہنگ اور لے میں بولتے چلے جاتے ہیں

بیٹھنے دو بھئی بیٹھنے دو

بیٹھا ہوں

بیٹھنے دو

بیٹھا ہوں بھئی بیٹھا ہوں

بیٹھنے دو بھئی بیٹھنے دو

ڈرامہ "جلسہ عام" ہم نے الیکشن ٹرانسمیشن میں دس دس منٹ کی پانچ قسطوں میں نشر کیا۔ ارادہ تھا کہ بعد میں اس کو یکجا کر کے ایک ساتھ دکھائیں گے مگر اس وقت کے وزیر اطلاعات کی جانب سے اس پر سخت اعتراض ہوا اور ہم اس کھیل کو مکمل صورت میں پی ٹی وی پر نہ دکھا سکے۔ بہر حال 1970ء پی ٹی وی کے لیے اس لحاظ سے بڑا امبارک سال تھا کہ خواجہ معین کا ٹیلی ویژن سے ربط ضبط استوار ہو گیا اور اس کے بعد ان کے دوسرے دو طویل دورانیہ کے کھیل "مرزا غالب بندر روڈ پر" اور "لال قلعے سے لالو کھیت تک" بھی ریکارڈ کر لیے گئے۔

ایک بڑے تخلیق کار کی طرح خواجہ معین کو مستقبل میں دیکھنے کا وصف حاصل تھا۔ انہوں نے 1950ء کے عشرے میں "تعلیم بالغاں" میں جو کچھ لکھا اور جن آنے والے حالات کی نشاندہی کی، وہ آج ہمارے معاشرے کو درپیش ہیں۔ مثلاً اس ڈرامے میں آج سے پینتالیس برس پہلے انہوں نے شاگردوں کو "اسلحہ" لے کر کلاس اٹینڈ کرائی اور "چھری اور قینچی" کے زور پر اپنی بات منوانے کا منظر پیش کیا۔ اس زمانے میں کون تصور کر سکتا تھا کہ تیس چالیس سال بعد ہمارے تعلیمی اداروں کا یہی کلچر ہو گا۔ اسی طرح اس ڈرامہ میں انہوں نے نسلی اور علاقائی تعصب کے اس عفریت سے بچنے کی تنبیہ کی تھی جو آج کراچی کے گلی کوچوں میں سر عام ناچتا نظر آتا ہے۔ اسی طرح 1970ء میں "جلسہ عام" میں کہ جب ابھی ملک متحد تھا، اسٹیج سیکرٹری کا غلطی سے علامہ اقبال کا یہ مصرع یوں پڑھنا:

"ذرا کم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی"

یہ باتیں قوم کا درد رکھنے والا ایک ایسا حساس انسان ہی لکھ سکتا ہے جس کو اللہ نے مستقبل میں دیکھنے کی صلاحیت عطا کی ہو اور خواجہ معین الدین بے شک خدا کا وہ بندہ تھا جس میں یہ صلاحیت تھی۔

میں نے مضمون کے آغاز میں کہیں لکھا تھا کہ مجھے یاد نہیں خواجہ معین الدین سے

میری ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی۔ یہ سچ ہے، مجھے ان کا ملنا یاد نہیں مگر ان کا بچھڑنا یاد ہے۔ نومبر 1971ء کے پر آشوب زمانے میں سردیوں کی ایک شام جب میں راولپنڈی/اسلام آباد ٹیلی ویژن سنٹر میں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا، کراچی سے معروف ڈرامہ پروڈیوسر کنور آفتاب احمد کا فون آیا۔ انہوں نے بتایا "خواجہ معین الدین کا انتقال ہو گیا۔" دسمبر 1971ء کی جنگ کے بعد جب میں کراچی گیا تو میرے اور خواجہ معین الدین کے ایک مشترکہ دوست نے مجھ سے کہا "اچھا ہوا، وہ پہلے ہی مر گئے ورنہ اب مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی خبر سن کر انہیں ویسے بھی مر جانا تھا۔"
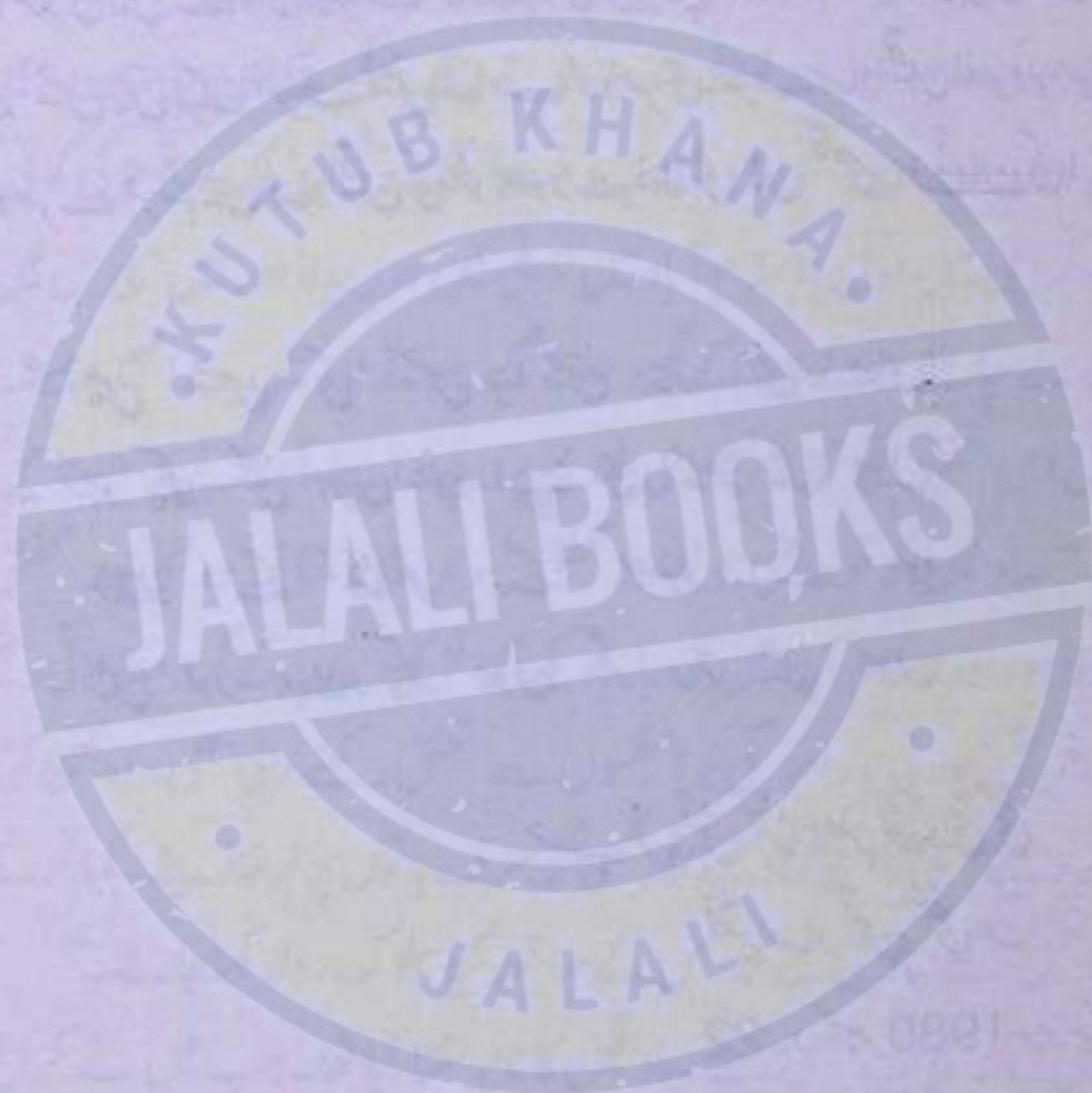
صادقین

میری اسٹڈی میں لکھنے والی میز کے سامنے والی دیوار پر دو فریم آویزاں ہیں۔ایک فریم میں تصویر ہے، جس میں ایک طرف فیض صاحب، دوسری طرف صادقین اور درمیان میں میں ہوں۔ دوسرے فریم میں صادقین کی خوبصورت خطاطی میں لکھی ہوئی ان کی اپنی ایک رباعی ہے:

میں حسن کی جس انجمن ناز میں ہوں
جو کچھ بھی ہوں خود اپنے ہی انداز میں ہوں
خطاط کے شاعر کے مصور کے سوا
میں اور بہت کچھ ہوں مگر راز میں ہوں

حسب فرمائش آغا ناصر لکھ دی گئی
فقیر صادقین عفی عنہ
22۔دسمبر 1980ء بر مکان
ڈاکٹر وحید قریشی۔اسلام آباد

میں جب بھی اس تصویر اور اس رباعی کو دیکھتا ہوں، صادقین یاد آتا ہے اور میرا جی چاہتا ہے صادقین کے بارے میں کچھ لکھوں۔ وہ جتنا بڑا فنکار تھا اور اس دنیا میں جس طرح اس کی پذیرائی ہوئی اور جیسے جیسے لوگوں نے اس کے کام کو سراہا تو اس کے بارے میں میرا کچھ لکھنا یا نہ لکھنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ مگر پھر بھی یہ میرا حق ہے اور جو کچھ میں لکھوں گا وہ اپنی ذاتی محبت اور تعلقات کے سبب لکھوں گا۔

صادقین بڑی طرح دار اور دلچسپ شخصیت کے مالک تھے۔عام لوگوں کے لیے اگرچہ

ان کی صحبت بہت پر کشش نہ تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جہاں تک ان کی کمپنی کا تعلق ہے، وہ ایک بور آدمی تھے۔ اس کے تین اسباب تھے۔ پہلا تو یہ کہ بہت کم موضوعات ایسے تھے، جن پر صادقین گفتگو کرنا پسند کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ وہ ایک خود پسند انسان تھے اور ان کا موضوع سخن عام طور پر خود ان کی شخصیت اور ان کا فن ہوتا تھا اور تیسری بات یہ کہ شام ڈھلنے کے بعد کہ جو سوشل ملاقات کا سب سے مناسب وقت ہوتا ہے، اس وقت ان کی کیفیت کچھ اور ہو چکی ہوتی تھی اور وہ ایک فقرے اور ایک بات کو بار بار دوہرانا شروع کر دیتے تھے۔ لیکن یہ تو عام آدمی کی بات ہوئی۔ ان کے چاہنے والے ان کے فن کو سمجھنے والے پہروں ان کے گرد حلقہ کیے بیٹھے رہتے تھے اور ان کی باتوں اور حرکات و سکنات یہاں تک کہ ان کی خاموشی سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ ان کے ان پرستاروں میں خواتین کی تعداد مردوں سے زیادہ تھی اور مذہب و ملت، رنگ و نسل، ملک و قوم کی کوئی تفریق نہیں تھی۔ وہ کراچی میں ہوں یا اسلام آباد میں، دہلی میں ہوں یا لاہور میں، پیرس میں ہوں یا ماسکو میں، ان کے چاہنے والے ان کے گرد حلقہ کیے ہوتے اور میں نے انہیں ہمیشہ یہی کہتے سنا: ''آج کل اس حقیر فقیر کا طالع بڑی بلندی پر ہے۔ اپنے آستانے پر حسینائیں بہت آ رہی ہیں...... ''صادقین کو خود بھی جو لطف محفل نسواں میں ملتا تھا، وہ کسی اور محفل میں نہیں۔ میں نے لاہور اور اسلام آباد میں خود بارہا دیکھا کہ لڑکیاں ان کے گرد منڈلاتی رہتیں۔ پاکستانی بھی اور افریقی، یورپی اور امریکی براعظموں سے تعلق رکھنے والی بھی۔ وہ کسی کو کاغذ پر اس کا نام لکھ کر دیتے، کسی کا اسکیچ بنا دیتے اور کسی کو صرف باتوں پر ٹرخا دیتے۔ کہا کرتے تھے: ''فقیر کی چھٹی حس اسے بتا دیتی ہے کہ کس کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا جائے۔''

میں زمانہ طالب علمی سے صادقین کا نام سنتا آیا تھا۔ جب میں نے کراچی میں ریڈیو پاکستان کی ملازمت اختیار کی تو وہاں جا کر مجھے یہ بھی علم ہوا کہ صادقین بھی ریڈیو پاکستان میں کچھ عرصہ باقاعدہ ملازمت کر چکے ہیں۔ ان کے بڑے بھائی کاظمین نقوی ان دنوں بھی ریڈیو کے خبروں کے شعبے میں تعینات تھے اور آخر تک اسی محکمہ میں کام کرتے ہوئے ترقی کی منزلیں طے کرتے رہے۔ صادقین نے تھوڑا عرصہ ملازمت کے بعد استعفیٰ دے دیا تھا اور کل وقتی مصوری کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ ان سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی، یہ تو اب یاد نہیں۔ مگر یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں لاہور کے نئے نئے قائم شدہ ٹیلی ویژن اسٹیشن

سے منسلک تھا۔ وہ غالباً کسی پروگرام میں انٹرویو کے لیے بلائے گئے تھے۔ اس کے بعد لاہور میں سوشل محفلوں میں گاہے بگاہے ان سے سلام دعا ہوتی رہی۔ لیکن قربت کا دور 1967ء سے شروع ہوتا ہے کہ جب ملک میں غالب کی ولادت کی سو سالہ تقریبات منائی جا رہی تھیں۔ میں ان دنوں لاہور ٹیلی ویژن کا پروگرام منیجر تھا اور پی ٹی وی ہیڈ کوارٹر سے مجھے حکم ملا تھا کہ میں بذات خود ان صد سالہ تقریبات کے لیے ایک خصوصی لوگو تیار کروں' جو جشن غالب کے سلسلہ میں نشر ہونے والے ہر پروگرام سے پہلے چلایا جائے۔ خواجہ شاہد حسین کہ جو نہ صرف معروف ماہر تعلیم پروفیسر خواجہ منظور کے صاحبزادے تھے' بلکہ خود انگریزی زبان میں شعر بھی کہتے تھے۔ ان دنوں پی ٹی وی کے ڈائریکٹر آف پروگرام تھے۔ ان کا خیال تھا کہ لوگو کے لیے غالب کا کوئی شعر منتخب کیا جائے' جسے موسیقی کی خوبصورت دھن میں کمپوز کر کے گایا بھی جائے اور خوبصورت خطاطی میں سکرین پر دکھایا بھی جائے۔ شعر کا انتخاب خود انہوں نے کر دیا تھا اور میرے ذمہ اب اس شعر پر مبنی ایک خوبصورت اور دلفریب لوگو پروڈیوس کرنا تھا...... بہت سے مشہور اور تجربہ کار فن کاروں کے ناموں پر غور کرنے کے بعد میں نے شعر کو موسیقی کی سنگت میں گانے کے لیے جس لڑکی کا انتخاب کیا' اس کا نام طاہرہ سید تھا۔ کچھ عرصہ پہلے ہی یونیورسٹی پروگرام میں میرے دوست محمد ادریس اس طالبہ کو شوقیہ فن کارہ کے طور پر لائے تھے۔ یہ پروگرام میں نے پروڈیوس کیا تھا اور اس ناتے سے طاہرہ کی والدہ ملکہ پکھراج سے بھی صاحب سلامت ہو گئی تھی کہ جو کل وقتی طور پر اپنی اس خوبصورت بیٹی کے ساتھ ساتھ رہتی تھیں۔ جب میں نے ملکہ پکھراج سے اس بات کا ذکر کیا کہ میں طاہرہ سے غالب کا یہ شعر گنوانا چاہتا ہوں' جو قومی سطح پر اس کی شہرت کا باعث بنے گا تو وہ تیار ہو گئیں۔ ان کی شرط صرف یہ تھی کہ اس کی دھن وہ خود بنائیں گی' جس محنت اور جانفشانی سے انہوں نے یہ کام کیا اور طاہرہ سید کو ان کی جیسی جیسی سخت ڈانٹ سننا پڑی' اس کا اظہار ممکن نہیں ہے۔ پروڈکشن کا دوسرا مرحلہ شعر کی کتابت سے تعلق رکھتا تھا۔ مجھے اس کام کے لیے صادقین کا نام مناسب لگا' حالانکہ اس وقت تک ان کی شہرت بحیثیت ایک مصور کے تھی۔ میں نے اپنے سٹیشن ڈائریکٹر جناب آغا بشیر سے کہ جو خود ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے' جس کی آرٹ اور فن کی دنیا میں بڑی شہرت تھی (آغا بشیر زبیدہ آغا اور آغا حمید کے بھائی تھے)۔ آغا بشیر بڑے مرنجا مرنج قسم کے انسان تھے۔ وہ خود

میرے ساتھ لاہور میوزیم گئے جہاں صادقین ان دنوں میوزیم کی چھت اور دیواروں کو منقش کرنے کے کام میں مصروف تھے۔ آغا بشیر کے کہنے پر وہ فوراً اس کام کے لیے راضی ہوگئے' مگر انہوں نے ایک شرط لگائی کہ مجھے اس سلسلہ میں بار بار ان کے پاس آنا ہوگا تاکہ ہر مرحلہ پر ہماری گفتگو ہوسکے۔ انہوں نے ساتھ ہی یہ فرمائش بھی کی کہ جب شعر موسیقی کی سنگت میں ریکارڈ ہوجائے تو میں انہیں اس کا ٹیپ سنواؤں جس شعر کا انتخاب خواجہ شاہد حسین نے کیا تھا' وہ غالب کے دیوان کا پہلا شعر تھا:

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

طاہرہ سید کی آواز' ملکہ پکھراج کی موسیقی اور صادقین کی خطاطی کے ساتھ جب غالب کی صد سالہ تقریبات کا یہ لوگو بن کر تیار ہوا تو سارے ملک میں لاہور ٹی وی سٹیشن کی دھوم مچ گئی۔ خود میرے لیے بھی یہ بڑی شہرت کا باعث ہوا۔ لیکن اصل فائدہ جو مجھے ہوا وہ یہ تھا اس طرح میں صادقین کے قریبی حلقے میں داخل ہوگیا اور ان سے میری دوستی کا آغاز ہوا۔ غالب کے صد سالہ جشن سے شروع ہونے والا یہ سلسلہ صادقین کی زندگی کے آخر تک جاری رہا۔ 1977ء میں اقبال کے صد سالہ جشن کے موقع پر ہم نے پھر صادقین سے رابطہ کیا اور اقبال کے مختلف اشعار کو میورئیل کی صورت میں ان سے پینٹ کرایا۔ اس موقع پر "موجزۂ فن" کے زیر عنوان ہم نے پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے صادقین کے ساتھ ایک دستاویزی پروگراموں کا سلسلہ بھی نشر کیا۔ صادقین ان دنوں لاہور میں باغ جناح میں پہاڑی پر مقیم تھے اور میں ہر ہفتہ اسلام آباد سے پروگرام کی پروڈکشن کے سلسلہ میں ان سے ملنے آیا کرتا تھا۔

صادقین کی شخصیت کو الفاظ میں بیان کرنا بڑا مشکل ہے۔ لانبے قد' کھلتی رنگت' تیکھے خدوخال کا یہ انسان اپنے اندر بہت کشش رکھتا تھا۔ ان کے چہرے پر ہمہ وقت تخلیق کا ایک کرب ہوتا' بال کبھی بہت گھنے رہے ہوں گے مگر آخر عمر تک ایک ہی انداز میں الجھے اور بکھرے رہتے تھے۔ آنکھوں پر سیاہ فریم کا دبیز شیشوں والا چشمہ جسے بار بار وہ اپنی ایک انگلی سے اونچا کرتے تھے۔ فارمل لباس کے طور پر صرف شیروانی پہنتے اور گھر سے شیروانی پہنے بغیر ہرگز نہیں نکلتے تھے۔ کپڑے عام طور پر میلے ہوتے تھے اور ان پر جا بجا رنگوں کے نشان

لگے ہوتے۔ عام طور پر قمیص کا دامن ایک دو جگہ سے سگریٹ سے جلا ہوا بھی ہوتا تھا۔ باتیں بڑے مست ہو کر کرتے تھے اور آواز میں کچھ ایسی مرکیاں ہوتی تھیں، جو عام طور پر کلاسیکی موسیقی گانے والے استادوں کی آواز میں ہوتی ہیں۔ انداز بیان ایک خاص ڈھب کا تھا اور الفاظ کا انتخاب بھی بس کچھ انہیں کا حصہ تھا۔ وہ اردو زبان کے ایسے ایسے خوابیدہ الفاظ اس روانی سے استعمال کرتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ پینٹنگ کرتے وقت فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے یا اگر بہت بڑا کینوس ہو تو تقریباً لیٹ جاتے۔ جب اپنے کام میں مصروف ہوتے تو دنیا و مافیا سے بے خبر ہو جاتے۔ کون آیا، کون گیا، نہ ان کو پروا ہوتی تھی اور نہ یہ معلوم کرنے کی خواہش۔ ایسے موقعوں پر کسی کو خاطر میں بھی نہ لاتے تھے۔ طبیعت میں ایک قسم کی خود پسندی تھی جس کا اظہار متواتر اور مسلسل جاری رہتا تھا۔ خود اپنی صفات بیان کرنا اور اپنے پرستاروں کا ذکر کرنا ان کا محبوب ترین موضوع تھا۔ برس ہا برس تصویریں بنانے کے بعد جب خطاطی کی طرف توجہ دی تو بس پھر اسی کے ہو رہے۔ اس فن اور اپنی تخلیقات کو "کیلی گرافی" کے نام سے پکارتے تھے۔ میں نے ایک روز دریافت کیا کہ صادقین بھائی آپ کی کیلی گرافیوں کی تعداد کتنی ہو گی؟

ذرا سوچ میں پڑ گئے اور پھر سگریٹ کا لمبا کش لے کر بڑے آرام سے بولے: "اتنی تو ہو گی کہ اگر لاہور سے ملتان تک بچھائیں تو پھر بھی بچ رہیں گی۔"

صادقین 1928ء میں امروہہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایسے خاندان سے تھا جو نقاشی اور خطاطی کے کام میں نامور مانا جاتا تھا۔ ان کے والد بھی خطاطی کے فن میں ماہر تھے۔ اسی بنا پر صادقین کہا کرتے تھے کہ: "خطاطی میرے خون میں شامل ہے۔" انہوں نے 1947ء میں آگرہ سے گریجویشن کیا۔ پاکستان آنے کے بعد کچھ عرصہ انہوں نے ریڈیو پاکستان میں ملازمت بھی کی۔ مگر جلد ہی ملازمت کو خیر باد کہا اور کل وقتی مصوری میں مصروف ہو گئے۔ 1954ء سے 1960ء تک انہوں نے اپنے فن پاروں کی بہت سی نمائشیں کیں اور کئی سرکاری اور غیر سرکاری عمارتوں میں میوریل بنائے۔ ان کو پہلا ایوارڈ 1960ء میں دیا گیا، جو تمغہ امتیاز تھا۔ 1961ء میں انہوں نے پیرس میں Biennale of Paris کی نمائش میں حصہ لیا اور انہیں بین الاقوامی جیوری نے Hauiate of Brenable de Paris کا ایوارڈ عطا کیا۔ 1962ء میں ان کی

مشہور عالم نمائش Maison du Culture, Le Harre منعقد ہوئی، جو فرانس کی مصوری کی دنیا میں ایک بڑا اعزاز سمجھا جاتا ہے۔ اسی سال حکومت پاکستان نے انہیں صدارتی تمغۂ حسن کارکردگی سے نوازا۔

پیرس سے وطن واپسی کے بعد انہوں نے منگلا پاور سٹیشن کے لیے بہت بڑے میورئیل تخلیق کیے اور پھر یہ سلسلہ عمر بھر چلتا رہا۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں بھی وہ کراچی کے فریئر ہال میں، جہاں صادقین گیلری قائم کی گئی تھی، اس پر شکوہ عمارت کی چھت اور دیواروں پر میورئیل بنانے میں مصروف تھے۔ لاہور کے میوزیم میں ان کا شاہکار میورئیل ''انسانیت کا ارتقاء'' اور اس کے علاوہ پاکستان کے تقریباً ہر شہر میں کسی نہ کسی عمارت میں ان کے میورئیل موجود ہیں۔ ان میں سے اکثر کا موضوع امن کے حصول کے لیے انسانی جدوجہد ہے۔ ریگستانی ماحول میں پرورش پانے والے کیکٹس نے انہیں بڑا متاثر کیا۔ ایک طویل عرصہ صرف کیکٹس ان کے اظہار کا ذریعہ بنے رہے، جنہیں وہ انسانوں اور شہروں کے مظاہر کے طور پر تخلیق کرتے تھے۔ کراچی سے 35 میل دور گڈانی کے مقام پر انہوں نے طویل عرصہ قیام کیا۔ یہ ان کی زندگی کا کیکٹس پیریڈ تھا اور ان کے اکثر میورلز میں اسی ریگستانی پودے کو قوت حیات کی علامت کے طور پر استعمال کیا گیا۔ میورئیل کے کاموں کے علاوہ صادقین نے لاتعداد تصاویر اور کیلی گرافیاں تخلیق کیں اور آج پاکستان میں اور پاکستان سے باہر بھی جہاں کہیں وہ گئے، آپ کو ایسے بے شمار لوگ ملیں گے، جن کے پاس صادقین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں ہیں۔ ہندوستان میں اپنے چھ ماہ قیام کے دوران انہوں نے لاکھوں کے حساب سے ہندو دیوتاؤں کے نام لکھ لکھ کر اپنے چاہنے والوں میں تقسیم کیے۔ ان کی پتلی پتلی انگلیاں بھی کیکٹس کے پودے کی طرح تھیں اور وہ اکثر انہیں موڑ توڑ کر ''اللہ'' کی صورت دے کر حاضرین محفل کو محظوظ کیا کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے انڈیا میں انہی انگلیوں سے وہ ''اوم'' بنا کر بھی دکھاتے تھے۔ صادقین کے فن پاروں کی بے شمار نمائشیں پاکستان میں ہوئیں، لیکن انہوں نے کبھی کسی وزیر یا سفیر یا بڑے آدمی کو ان کے افتتاح کے لیے نہیں بلایا۔ ان نمائشوں میں بھی وہ اپنے چاہنے والوں میں گھرے رہتے اور ان کی طرح طرح کی فرمائشیں پوری کرتے رہتے۔ ایک بار کسی صاحب نے صادقین سے شکایت کی کہ ان کی نمائش شہر میں ہونے والی ہے اور مجھے اس کا دعوت نامہ نہیں ملا۔ صادقین نے کہا:

"آپ تشریف لائیں فقیر خود آپ کا استقبال کرے گا۔" مگر وہ صاحب بضد رہے کہ دعوت نامے کے بغیر وہ نہیں آئیں گے۔ صادقین نے کہا کہ چھپے ہوئے دعوت نامے سارے ختم ہو چکے ہیں، مگر میں آپ کو خود مدعو کر رہا ہوں۔ ان صاحب کا اصرار پھر بھی جاری رہا تو صادقین نے ان کی ٹائی اپنے ہاتھ سے کھینچی جو ہلکے بادامی رنگ کی تھی اور اس پر مارکر سے پورا دعوت نامہ تحریر کر دیا۔ ظاہر ہے ان صاحب کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ صادقین اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ ان کا لکھا ہوا ہر لفظ اور ان کا بنایا ہوا ہر نقش فن کا حصہ ہے اور وہ اپنا یہ ورثہ بڑی تعداد میں چھوڑ کر جائیں گے۔ کتابوں کے سرورق کی صورت میں، خطوط اور رقعوں کی صورت میں، جانوروں کی کھالوں پر لکھی گئی آیات کی صورت میں اور باقاعدہ منقش خطاطی کے نمونوں کی صورت میں۔ ان کے ایک دوست کا کہنا ہے کہ صرف بسم اللہ اور کلمہ طیبہ انہوں نے لاکھوں کی تعداد میں لکھا اور اپنے چاہنے والوں میں تقسیم کیا ہے۔

صادقین نے عمر بھر شادی نہیں کی۔ انہوں نے زندگی کا سارا عرصہ اپنے فن کو بنانے اور سنوارنے میں صرف کیا۔ ان کے فن کے فروغ اور اس کے ارتقاء میں ان کی تنہائی نے بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔ آرٹ کے کسی نقاد نے صادقین کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے: "ان کے فن پاروں میں جہاں کہیں خلا موجود ہے، اس کی بنیاد تنہائی ہے۔ اگر صادقین تنہا نہ رہا ہوتا تو اس کے ہاں امید کی کرن کا نور نہ پھوٹتا بلکہ مایوسی ابہام اور شک سب مل کر اسے گھیر لیتے اور وہ تنہائی میں بیٹھا سسکیاں لیتا رہتا۔ لیکن اس کی تنہائی ہی اس کی اپنی کائنات تھی۔ اس نے اس کائنات کو فن پاروں سے سجا دیا تھا، بلکہ اس کی زندگی کے کرب نے کہانی کو ایک فن بخش دیا تھا۔"

صادقین 1987ء کے اوائل میں ہم سے جدا ہو گئے اور اس طرح کہ اس وقت بھی وہ اپنے تخلیقی کاموں میں مصروف تھے۔ ان کے نام سے قائم ہونے والی آرٹ گیلریاں اسلام آباد اور کراچی میں آج بھی ان کے مداحین اور شائقین کو اپنے محبوب نقاش اور مصور کے بنائے ہوئے شہ پاروں کو دیکھنے کا موقع فراہم کرتی ہیں۔

صادقین کسی ایک جگہ ٹک کر نہیں رہتے تھے۔ ان کی زندگی کا کوئی ٹائم ٹیبل نہیں تھا۔ انہوں نے ساری عمر بغیر کسی منصوبہ بندی کے گزار دی۔ انہوں نے اپنے وجود کو وقت کی موجوں پر بالکل ڈھیلا اور ہلکا چھوڑ دیا تھا اور یہ لہریں انہیں جدھر بہا کر لے جاتیں وہ بہتے

چلے جاتے۔ خود کہا کرتے تھے: ”میں کوئی پروگرام یا ٹائم ٹیبل نہیں بناتا ہوں۔ یہ اپنی فطرت میں نہیں ہے بس جو کچھ ہونا ہوتا ہے‘ ہوتا چلا جاتا ہے اور اسی لیے مجھے زندگی میں کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔“ وہ ملک ملک‘ شہر شہر گھومتے رہے اور جہاں جاتے وہاں طویل عرصے تک قیام کرتے۔

1970ء کے عشرے میں صادقین اسلام آباد آگئے۔ اسلام آباد میں میری پہلی ملاقات ان سے شکرپڑیاں کی طرف جانے والے راستے میں ایک بڑے سے ٹین کی چھت والے پنڈال میں ہوئی۔ اس جگہ کو اب چاند تارا چوک کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ وہ اسی شیڈ میں مقیم تھے اور سامنے چوک میں ایک بہت بڑا چاند تارا تعمیر کرانے کے کام کو سپروائز کر رہے تھے۔ وہ شدید سردی کی ایک رات تھی۔ میں اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ کہیں جانے کے لیے نکلا تھا۔ راستے میں مجھے خیال آیا کہ صادقین کافی عرصہ سے اسلام آباد آئے ہوئے ہیں‘ ان سے ملاقات کی جائے۔ جب ہم اس ٹین کی چھت والے ہال میں داخل ہوئے تو صادقین سامنے ننگے فرش پر نیم دراز ایک بڑے کینوس پر کچھ کام کر رہے تھے۔ ہال کے ایک کونے میں دور چھوٹا سا ہیٹر جل رہا تھا۔ میری بیوی کو بڑا تعجب ہوا کہ یہ اتنی سخت سردی میں اس طرح کیسے کام کر لیتے ہیں۔ مجھے دیکھ کر صادقین اپنی جگہ سے اٹھے اور ہماری طرف آئے۔ میں نے کہا ”دیکھیں مہمان آئے ہیں“ انہوں نے بڑی مسرت سے ہم سب کو دیکھا میری بیوی سے وہ واقف تھے۔ بچوں کو دیکھ کر بڑے خوش ہوئے‘ خاص طور پر بڑی بیٹی‘ جس کی عمر اس وقت پندرہ سولہ برس کی ہوگی۔ اس سے ان کو خاص دلچسپی اس لیے بھی ہوئی کہ وہ خود بھی مصوری کرتی تھی اور کالج میں فائن آرٹس اس کا مضمون تھا۔ جب انہوں نے اس کا نام دریافت کیا تو میری بیٹی نے بتایا کہ ”میرا نام ہما ہے۔“ انہوں نے اس سے ہما کے معنی پوچھے اور پھر بولے ”تم ہما اوج سعادت ہو“ اس کے بعد آخر تک جب کبھی اس کا نام لیتے یہی کہہ کر پکارتے۔

اسلام آباد کے قیام کے دوران ان کے تعلقات میرے اہل خانہ سے بہت بڑھ گئے۔ اتنے کہ ایک بار میری بیوی ان کی گیلری میں دو بہت خوبصورت کیلی گرافیاں پسند کر آئی اور دو روز بعد صادقین نے خطاطی کے وہ نادر شاہکار فریم کرا کے میرے گھر بھجوا دیئے۔ بعد میں ایک دن مجھ سے کہا ”وہ کیلی گرافیاں فقیر کسی کو کسی قیمت پر نہ دیتا‘ مگر صفیہ بیگم کی بات

اور ہے۔" پھر مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولے "اس سے تمہیں صفیہ بیگم کے لیے اپنی چاہت کا اندازہ ہو گیا ہو گا" لیکن یہ تعلق یک طرفہ نہیں تھا۔ صفیہ بھی ان کا بے حد خیال کرتی تھی۔ میں نے اکثر اسے ڈرائیور کے ہاتھ صادقین کو کھانے بھجواتے دیکھا۔ اگرچہ ان کو کھانوں سے کوئی خاص رغبت نہ تھی۔ مگر میری بیوی کے ہاتھ کی بنی ہوئی ایک ڈش جو خالص مرچوں سے بنتی تھی، بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ اس کو وہ "مرچوں کا سالن" کہتے تھے۔ جب بھی زیادہ عرصہ گزر جاتا تو میرے گھر میری بیوی کو رقعہ بھجواتے، جس میں مرچوں کے سالن کی فرمائش تحریر ہوتی "آج شام مرچوں کا سالن ہمراہ اپنے شوہر نامدار فقیر کے آستانے پر بھجوا دیا جائے۔"

میرے بیٹے بلال کو وہ ہرکارہ کہہ کر پکارتے تھے۔ چونکہ وہی اشیاء کی رسل و رسائل کا کام کرتا تھا۔ چھوٹی بیٹی شمائلہ کے حسن کی تعریف کرتے اور اپنے مخصوص انداز میں کہا کرتے "آپ کی یہ بیٹی بہت حسین ہے۔" اور پھر ذرا وقفہ کے بعد کہتے "بالکل آپ کی صورت کی ہے" یہ بھی کہا کرتے "یہ بات میں صفیہ بیگم کو جلانے کے لیے کہتا ہوں، مگر وہ تمہاری ایسی پرستار ہیں کہ اپنی بجائے تمہاری تعریف سن کر بھی خوش ہو جاتی ہیں......"

صادقین گیلری میں شام کے وقت بڑی چہل پہل رہتی تھی۔ لاہور، کراچی کے فن کار شاعر ادا کار اگر اسلام آباد آئے ہوتے تو یہ ممکن نہ تھا کہ وہ گیلری کا چکر لگائے بغیر واپس لوٹ جائیں۔ پھر ایک بڑی تعداد ان کے مستقل پرستاروں کی تھی۔ جن میں بیرونی ممالک کی "حسینائیں"۔ مقامی آرٹسٹ اور ذوق جمیل رکھنے والے بڑے سرکاری افسران شامل تھے۔ آنے والوں میں زیادہ تر مہمان اس شوق میں آتے تھے کہ وہ وقت کے اس عظیم فن کار کو اپنی آنکھوں سے نقاشی اور خطاطی کرتے ہوئے دیکھیں۔ یہ عاشقان صادقین پہروں زمین پر ان کے قریب بیٹھے، ان کو کام کرتا ہوا دیکھتے رہتے اور وہ خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہتے۔ لیکن جب ان پر گفتگو کا موڈ طاری ہوتا تو صادقین ایسے رطب اللسان ہو جاتے کہ بڑے بڑے زبان دان اور مقرران کے سامنے کم تر نظر آتے۔ وہ بڑے ذہین اور زیرک انسان تھے اور اپنے فن کے رموز پر مکمل طور پر حاوی تھے۔ ویسے تو فقیرانہ طبیعت تھی، مگر جب کسی موضوع پر اظہار خیال کرتے تو بڑے بڑے دانشوران کے سامنے ہیچ معلوم ہوتے۔

صادقین کے ایک ریڈیو انٹرویو سے یہ اقتباس ان کی حاضر جوابی' ذہانت اور اپنے فن سے ان کے لگاؤ کی غمازی کرتا ہے۔

سوال: آپ کی جو تخلیقات ہیں' ان میں سے کوئی فن پارہ جو آپ کو بے حد پسند ہو؟

صادقین: میرا خیال ہے ابھی تک وہ عالم موجود میں آیا ہی نہیں' عالم معدوم میں ہے۔

سوال: وہ کون سا فن پارہ ہے' جس کو تخلیق کر کے آپ کو یہ احساس ہوا ہو کہ یہ ایک شاہکار ہے؟

صادقین: ابھی تک میں اپنے کسی کام کو شاہکار کام نہیں کہہ سکتا۔

سوال: اپنے ہم عصر مصوروں کے بارے میں کیا خیال رکھتے ہیں؟

صادقین: یہ سوال نہ کریں تو کوئی حرج نہیں۔

سوال: کیا آپ مطمئن ہیں ان کی کاوشوں سے' جس راستے پر وہ جا رہے ہیں؟

صادقین: اگر فن کا مطلب پیسے بنانا ہے تو میں اسے فن نہیں مانتا۔

صادقین کا یہ کہنا سچ تھا۔ وہ دل سے اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ فن دولت کمانے کا نام نہیں ہے۔ پیرس میں طویل عرصہ گزارنے کے بعد' جب انہوں نے پاکستان آنے کا فیصلہ کیا تو وہ ان دنوں اپنے فن کی انتہائی بلندیوں پر تھے۔ لیکن انہوں نے مالی منفعت پر اپنے فن کو ترجیح دی اور واپس وطن لوٹ آئے۔ چونکہ وہ اپنے ملک میں' اپنی روایت کے مطابق' اپنے فن کو اپنی تہذیب میں آگے بڑھانا چاہتے تھے۔ وہ اگر واپس نہ آئے ہوتے تو شہرت دنیا اور دولت دنیا کے بام عروج پر تو ضرور پہنچ جاتے۔ مگر منگلا ڈیم' لاہور میوزیم' اسمبلی ہال' تربیلا اور کراچی فریئر ہال وغیرہ میں جو کام ہوا' وہ نہ ہوتا اور پاکستان میں فن خطاطی کے سلسلہ میں جو نشاط ثانیہ کی صورت ظہور پذیر ہوئی وہ نہ ہوئی ہوتی۔ وہ خود اپنے اس فیصلہ سے بہت خوش تھے۔ ان کو مغرب کی رنگارنگ زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ بین الاقوامی بازار فن کا جو چکر ہے' بہت پر پیچ ہے۔ انہوں نے یہ محسوس کر لیا تھا وہ عالمگیر کامیابی کی دہلیز تک پہنچ چکے تھے۔ مگر وہ سب چھوڑ کر وطن واپس آ گئے۔ یہاں آ کر کام کیا اور ان کا کہنا تھا کہ یہ میرا کام جو ایک قومی اثاثہ ہے' آگے چل کر قومی ورثہ ہو جائے گا۔"

صادقین خود کو شدید قسم کا روایت پرست آدمی کہا کرتے تھے۔ لیکن ان کے ہاں روایت پرستی کے معنی یہ نہیں تھے کہ آپ کٹر طریقے سے انہی ساری روایتوں پر عمل پیرا

رہیں۔ بدلتے وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی اور ارتقاء کا عمل جاری رکھنے کو وہ ضروری سمجھتے تھے۔ لہٰذا ان کی روایت پرستی سے یہ غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہئے کہ وہ روشن خیال نہیں تھے۔ ان کے نزدیک روایت اس وقت تک زندہ نہیں رہتی، جب تک بدلتے ہوئے سماجی اور معاشی پس منظر میں، بدلتی ہوئی جمالیاتی اقدار کے حساب سے اس میں اختراع اور ایجاد کا سلسلہ قائم نہ کیا جائے۔ روایت صرف اسی صورت میں آگے بڑھتی ہے۔ وہ کہا کرتے تھے "جو پرانی جمالیاتی قدریں ہیں، جو مطلق العنان بادشاہوں کے وقت کی روایات تھیں، ان پر اس سلطانیٔ جمہور کے زمانے میں چلنے کا قائل نہیں ہوں۔ بدلتے زمانے کے ساتھ ساتھ زمانے کے انداز بدلے گئے تو پھر اس کے ساتھ ساز بھی بدلنا چاہئیں۔ ورنہ روایت جو ہے وہ جمود کا شکار ہو جاتی ہے۔ تو اب فن خطاطی میں میں نے جو کچھ اختراع و ایجاد کی ہے، وہ زمانے کے حساب سے ہوئی ہے۔" اور اپنے اس ایجاد و اختراع کا حساب کتاب سمجھاتے ہوئے جو نقطۂ نظر وہ پیش کرتے تھے وہ یہ تھا کہ مطلق العنان بادشاہوں کے زمانے میں جو خطاطی ہوتی تھی وہ آج کل کے زمانے میں نہیں ہو سکتی۔ خطاطی میں اس دور میں لفظ کی وحدت سامنے آتی تھی، لیکن صادقین جو خطاطی کرتے تھے، اس میں لفظ کی وحدت نہیں ہے، بلکہ پورا جملہ یا پوری آیت ایک اکائی کی حیثیت سے سامنے آتی ہے۔ چونکہ بقول ان کے یہ فرد کا نہیں جماعت کا زمانہ ہے اور اس طرح روایت پھر آگے بڑھ رہی ہے وہ متحرک ہے، منجمد نہیں ہے۔

میں کچھ عرصہ پاکستان نیشنل کونسل آف آرٹس کا ڈائریکٹر جنرل بھی رہا۔ یہ دفتر صادقین گیلری سے زیادہ دور نہیں تھا۔ کبھی کبھی دفتری اوقات میں بھی وہ ٹہلتے ہوئے آجایا کرتے اور پہروں میرے پاس بیٹھے رہتے۔ کہا کرتے تھے "آپ پر اس فقیر کی عنایت خاص ہے، ورنہ بندہ افسران کو اپنی توجہ کے لائق گردانتا نہیں۔" یہ صحیح بھی ہے۔ صادقین نے مجھ پر جتنی عنایتیں کیں، میں ان کا شکریہ ادا کرنے کے قابل نہیں ہوں۔

انہوں نے میری پہلی کتاب کا جو "آغا ناصر کے سات ڈرامے" کے زیر عنوان شائع ہوئی، گرد پوش بڑی محبت سے بنا کر دیا۔ یہی گرد پوش بعد میں ایک بڑی پینٹنگ کے طور پر بھی ان کی تصاویر کے خزانے میں شامل ہو گیا۔

اسی طرح ایک روز میرے مرحوم دوست مجیب صدیقی کے گھر بیٹھے تھے اور محفل

گرم تھی۔ صادقین بڑے موڈ میں تھے' باتوں باتوں میں اسکیچ ڈرائنگ کا تذکرہ نکل آیا۔ کچھ عرصہ پہلے مجھے برادرم اقبال مہدی نے میرا ایک بہت خوبصورت انک اسکیچ بنا کر بھیجا تھا۔ کسی نے اس کا ذکر کرتے ہوئے اقبال مہدی کے کام کی بڑی تعریف کی۔ صادقین خاموش بیٹھے سنتے رہے اور پھر ان کی رگ انانیت پھڑک اٹھی۔ بولے فقیر کو بھی اگر کوئی صورت پسند آجائے تو پانچ منٹ میں اسکیچ بنا دیتا ہے۔ صرف پانچ منٹ میں۔ اگر آپ لوگوں کو یقین نہ ہو تو اس کا عملی مظاہرہ بھی کیا جاسکتا ہے...... ہم سب نے کہا یقیناً آپ ایسا کر سکتے ہیں' مگر ان کو بس کچھ دھن سوار ہوتی گئی اور ایک ہی بات کی تکرار کرتے رہے "اس کا عملی مظاہرہ بھی کیا جاسکتا ہے" آخر جب وہ یہ بات بار بار دوہرانے سے باز نہ آئے تو مجیب صدیقی نے اپنے ڈرائیور کو بازار بھیج کر بڑے ساز کے ڈرائنگ پیپر اور مارکر منگوا لیے۔ صادقین صوفے سے اتر کر زمین پر بیٹھ گئے اور مجھے اپنے سامنے بٹھا لیا۔ پانچ تو نہیں لیکن زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں انہوں نے میری شبیہ کاغذ پر اتار دی۔ پھر وہ دوسرے کاغذوں پر مختلف عبارات اور اشعار مرقوم کر کے تقسیم کرتے رہے' مگر اہل محفل میں سے کسی اور کا اسکیچ نہیں بنایا۔ مجیب صدیقی نے وہ ڈرائنگ اپنے پاس رکھ لی اور وعدہ کیا کہ مجھے باقاعدہ فریم کرا کے پیش کریں گے۔ مگر پھر جانے وہ تصویر کہاں کھو گئی اور مجیب صدیقی اب اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔

اسی طرح ایک شام میں صادقین گیلری میں ان کے ساتھ گپ شپ کر رہا تھا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے پاؤں پسارے بیٹھے تھے اور آرام سے باتیں ہو رہی تھیں۔ کچھ دن بعد میری بیٹی کی شادی ہونے والی تھی۔ صادقین بڑی دلچسپی سے شادی کے انتظامات کا احوال سنتے رہے۔ پھر اچانک جیسے کچھ یاد آگیا۔ بولے "ہما اوج سعادت کی شادی کا دعوت نامہ میں لکھوں گا......" میں نے کہا صادقین صاحب دعوت ناموں کی اشاعت کے لیے تو میرے ایک دوست نے ذمہ داری لے لی ہے۔ غالباً وہ سب کچھ طے کر چکے ہیں اور کل مجھے ڈیزائن اور متن دکھا کر پریس میں بھیج دیں گے۔ انہوں نے بڑی ناگواری سے میری طرف دیکھا' کچھ دیر سوچا اور پھر اچانک زور سے پکارا "انور"...... انور ان کے ملازم اور مصاحب خاص کا نام تھا' جو ہر دم ہر گھڑی ان کے ساتھ رہتا تھا۔ انور گھبرایا ہوا آیا تو وہ اسی انداز میں چلاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے "شیروانی لاؤ" انور لپک کر شیروانی لے آیا تو وہ مجھ سے مخاطب

ہوئے۔ آپ کے پاس گاڑی تو ہے نا۔ میں نے اثبات میں جواب دیا اور وہ شیروانی پہنتے ہوئے مجھے ساتھ لیے باہر نکل آئے۔ کار میں بیٹھنے کے بعد انہوں نے سپر مارکیٹ چلنے کے لیے کہا۔ میں نے حکم کی تعمیل کی اور سپر مارکیٹ کی جانب روانہ ہو گیا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرنے والے ہیں۔ سپر مارکیٹ پہنچ کر انہوں نے اپنی مخصوص اسٹیشنری کی دکان سے بڑے بڑے اسکیچنگ پیپرز، رنگ برنگے مارکر، پنسلیں اور مصوری کا بہت سا سامان خریدا اور واپس گیلری میں میرے ساتھ لوٹ آئے۔ اندر آکر انور کو آواز دی۔ شیروانی اتار کر اس کے سپرد کی اور زمین پر کاغذ پھیلا کر بیٹھ گئے۔ اب پہلی بار وہ مجھ سے مخاطب ہوئے "ہما اوج سعادت کی شادی کا دعوت نامہ فقیر کے سوا کوئی اور نہیں لکھے گا......" پھر انہوں نے دیگر کوائف دریافت کیے مثلاً لڑکے کا نام، لڑکے کے والد کا نام، تاریخ، وقت اور مقام وغیرہ۔ انہوں نے یہ تفصیلات نوٹ کرلیں اور مجھے دوسرے روز آنے کو کہا۔ جب میں اگلی شام ان کے ہاں پہنچا تو ایک بہت بڑے ڈرائنگ پیپر پر ہما کی شادی کا دعوت نامہ ان کی خوبصورت خطاطی میں تیار تھا۔ اوپر جلی حروف میں یہ آیت تھی "فیھما من کل فاکھة زوجین."

صادقین تو مرحوم ہو گئے، مگر ہم نے ان کے بنائے ہوئے دعوت نامے کو اپنے بقیہ دو بچوں کی شادی میں بھی استعمال کیا۔ صرف نام اور تاریخیں تبدیل ہوتی رہیں۔ دعوت نامہ وہی رہا جو صادقین نے بنایا تھا۔

صادقین کی زندگی میں کتابوں کا بڑا اہم کردار ہے۔ کتابوں سے محبت انہیں اپنے اسلاف سے ورثہ میں ملی تھی۔ ان کا خاندان امروہہ کی علمی اور ثقافتی تقریبات میں سرگرم عمل رہتا تھا اور اس لحاظ سے اس خانوادے کی وہاں کی علمی اور سماجی زندگی میں بڑی اہمیت تھی۔ ان کے گھرانے کے بزرگوں کو کتابیں جمع کرنے، پڑھنے اور خود تصنیف و تالیف سے گہری دلچسپی تھی۔ لہٰذا صادقین کو بھی یہ شوق بچپن ہی سے ہو گیا۔ ان کے بزرگوں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں دیوار دوز الماریوں میں محفوظ رہتی تھیں اور بقول ان کے خاص خاص موقعوں پر نکالی جاتی تھیں۔ مثلاً ان کے اسلاف کے لکھے ہوئے قلمی قرآن شریف کے نسخے رمضان کے مہینے میں نکالے جاتے تھے اور کربلا اور شہادت عظمیٰ کے موضوعات پر نثر پارے اور مرثیوں کے مجموعے عشرہ محرم میں۔ صادقین ایسے موقع کے منتظر رہتے اور بڑے

غور سے ان ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ کرتے' ان کی طرز تحریر' نقش و نگار' حاشیے اور کتاب کے اوراق پر مرصع طور پر جو گل کاریاں ہوتیں' انہیں بڑے شوق اور غور سے دیکھتے اور اس طرح صادقین کو کتاب سے اسی زمانے میں تعلق اور لگاؤ پیدا ہو گیا' جب انہیں کتاب پڑھنی بھی نہیں آتی تھی۔ ایک روز کسی محفل میں یہ ذکر چل نکلا تو صادقین نے ایک بڑی دلچسپ بات کہی۔ انہوں نے بتایا "مجھے یہ تو یاد ہے کہ میں پڑھنا کب سے جانتا ہوں' لیکن مجھے یہ یاد نہیں کہ میں لکھنا کب سے جانتا ہوں...... چونکہ میں بنیادی طور پر مصور آدمی ہوں تو مجھے لکھنا اس وقت آتا تھا' جب مجھے پڑھنا نہیں آتا تھا...... کسی کتاب کو دیکھ کر میں اپنے ہاتھ سے خود ویسی ہی کتاب بنا لیا کرتا تھا۔ بغیر یہ سمجھے ہوئے کہ اس میں لکھا کیا ہے۔ چونکہ میں تو حروف کی اور الفاظ کی جو شکل ہوتی تھی' اس کی نقل اتار لیا کرتا تھا۔ ان الفاظ اور حروف کے معنی سے ناآشنا رہتا تھا۔"

اہل محفل میں کسی نے ان کی بات سن کر سوال کر ڈالا "کیا اس وقت جب آپ یہ کرتے تھے تو آیندہ زندگی کا بھی کوئی تصور آپ کے ذہن میں تھا۔" صادقین نے جواب دیا "نہیں ایسا کوئی تصور نہیں تھا اپنے ذہن میں...... میں تو بس ایک عجیب سی خوشی محسوس کیا کرتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اور میرا حافظہ برا نہیں اللہ کا خاص کرم ہے۔ تو جب میں یادوں کے افق پر...... یعنی یادوں کی سرحدوں پر یادوں کے دھندلکے میں دیکھتا ہوں تو بعض اوقات یادیں خود بخود روشنی میں آجاتی ہیں اور ان یادوں کے دھندلکوں میں میں دیکھتا ہوں کہ میں اپنے ہاتھوں سے خود کتابیں بنا رہا ہوں۔ بغیر یہ سمجھے ہوئے کہ اس میں لکھا کیا ہے۔ میری کورس کی جو کتابیں ہوتی تھیں' وہ عام طور پر میری قلمی ہوتی تھیں۔ جن کتابوں میں تصویریں ہوتی تھیں تو میں وہ تصویریں بھی بنا لیا کرتا تھا...... خاص طور پر مجھے جغرافیہ کی کتابیں بنانے کا بڑا شوق تھا۔ اس میں ایٹلس بھی شامل ہوتے تھے۔ یوں ہوتا تھا کہ میں پوری پوری رات لیمپ سامنے رکھ کر اپنے نصاب کی کتابوں کی نقل بناتا رہتا تھا اور پھر ان کی جلد سازی بھی خود کرتا تھا اور پھر لکھنے کے دوران یہ ساری کتابیں مجھے زبانی یاد ہو جاتی تھیں۔ پھر کتابیں نقل کرتے کرتے مجھے خیال آیا کہ جملے میں تھوڑا سا ردوبدل کرنے سے جملے کو اپنایا جا سکتا ہے۔ تو میں یہ کرنے لگا...... اور یوں خود کچھ لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ویسے بچپن میں کتابیں بنانے کا جو شوق تھا' وہ اب بھی ہے۔ مگر اب یوں ہو گیا ہے کہ یہ سب

کتابیں طبع زاد ہوتی ہیں...... میں سمجھتا ہوں جب میں نے شاعری شروع کی تو اس کی محرک بھی یہی چیزیں تھیں۔ اپنے مجموعہ کلام کا قلمی نسخہ بنا کر مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں صاحب دیوان ہو گیا ہوں۔"

قلمی نسخے لکھنے کا شوق انہیں آخر عمر تک رہا۔ اس شغل کو انہوں نے ہمیشہ "کتابیں بنانا" ہی کہا اور سچ پوچھئے تو یہ ٹھیک بھی ہے۔ تحریر، تصویر، ترتیب اور جلد سازی سب الگ الگ نوعیت کے کام ہیں اور وہ یہ سارے کام کرتے تھے۔ لہٰذا "کتاب بنانے" کی اصطلاح بالکل مناسب معلوم ہوتی ہے۔

صادقین کی خطاطی کی بات چلی ہے تو ایک بار پھر پی ٹی وی کے لیے بنائے جانے والے لوگو کا ذکر ضروری ہو جاتا ہے، جو ہم نے صادقین سے غالب کے صد سالہ جشن کے موقع پر بنوایا تھا۔ اسی کی خطاطی کے بعد ان کو یہ خیال بھی آیا کہ کیوں نہ وہ غالب کے منتخب اشعار کو، جنہیں وہ مصور کر رہے ہیں، ساتھ ہی ساتھ خطاطی کی صورت میں بھی مرقوم کیا جائے۔ مجھے یہ بات بہت بعد میں معلوم ہوئی کہ یہی فیصلہ صادقین کے باقاعدہ فن خطاطی کا نقطہ آغاز ہے۔

اس کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے ایک بار خود اپنے مخصوص طرز بیان میں یوں کہا تھا "جس بات نے سنجیدگی کے ساتھ مجھے خطاطی کے فن کی طرف رجوع کیا، اس میں تقویم کے حساب کتاب بھی ہیں اور کچھ حالات و واقعات کی ترتیب بھی۔ جس کے تحت میں خطاطی میں داخل ہوا۔ ایک زمانہ تھا کہ میں ہر مہینے ایک نمائش کرتا تھا، یعنی ماہ گزشتہ میں جو کام ہوتا تھا، اس کی نمائش ماہ موجودہ میں ہوتی تھی اور جو کام ماہ موجودہ میں ہوتا تھا، اس کی نمائش ماہ آئندہ میں ہوتی تھی...... یہ سلسلہ جاری تھا کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب کی صد سالہ برسی کا موقع آ گیا اس موقع پر کیونکہ یہ فقیر اپنے آپ کو بندۂ مرزا اسد اللہ خاں غالب بھی کہتا تھا تو ہم نے سوچا کہ غالب کی شاعری کو خراج تحسین ہم بھی اپنی چھوٹی موٹی اوقات اور بساط کے مطابق اشعار غالب کو مصور کر کے اور ان پر مشتمل تصویریں بنا کر ادا کریں...... تو جب میں نے غالب کے اشعار پر مشتمل تصویریں بنائیں تو یہ سوچتے ہوئے کہ فقیر کا خط بھی کوئی ایسا خراب نہیں ہے، جو متعلقہ اشعار تھے، وہ بھی تصویر کے ساتھ لکھ دیئے جائیں۔ جب میں لکھ رہا تھا تو دیکھ رہا تھا کہ ہر شعر کے نقش کے بعد حروف ابجد میں پیچ و خم جو ہیں، وہ ایک

نیا طرز اختیار کرتے جا رہے ہیں...... اب ہوا یہ کہ...... یہ تو شعبان کا مہینہ تھا اس کے بعد اگلا مہینہ رمضان کا تھا اور مجھے ہر ماہ ایک نمائش کرنا ہوتی تھی۔ میں اسی مخمصے میں تھا کہ اگر تصویروں کی نمائش کرتا ہوں تو شاید رمضان کے مہینے میں مناسب نہ ہو...... اب کیا کروں۔ تو ایک رات اسی تذبذب میں تھا اور پھر اسی کیف تذبذب میں مجھے خیال آیا کہ صادقین تو نے غالب کے اشعار تو مصور کیے ہیں اور ان پر ان اشعار کی خوش خطی کی ہے تو پھر تو آیات قرآنی کی خطاطی بھی کر سکتا ہے تو میں نے اسی وقت بسم اللہ کر دی...... مؤذن کہہ رہا تھا "الصلوٰۃ خیر من النوم" اور ادھر فقیر صادقین بسم اللہ رحمٰن الرحیم لکھ رہا تھا لہٰذا میں تو یہ کہتا ہوں کہ میں قضا و قدر کی بھول بھلیوں سے نکل کر اشعار غالب کے خوش خطی کے دروازے سے چل کر مدینہ آیات قرآنیہ میں داخل ہوا۔"

صادقین کو اپنی خطاطی سے بے حد محبت تھی اور وہ اس پر بہت فخر کرتے تھے۔ اس کا احساس اس وقت ہوتا تھا جب وہ خود اپنی لکھی ہوئی رباعیاں در مدح خطاطی اپنے مخصوص انداز میں سناتے تھے۔

تجھ میں ہے جمال خوش خطی کو دیکھا
معنی سے وصال خوش خطی کو دیکھا
لوح رخ پر حروف خل و خط میں
قدرت کے کمال خوش خطی کو دیکھا

ایک اور رباعی اسی موضوع پر:

ابجد میں جمال نو کا عالم آئے
خطاطی کے میدان میں یوں ہم آئے
زلفوں کی گھنی چھاؤں میں لکھنے کے سبب
حرفوں میں نئے پیچ نئے خم آئے

صادقین مصوری، خطاطی اور شاعری کو ایک مربوط شہ تصور کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے ایک بار ان سے یہ سوال کیا گیا کہ مصوری سے خطاطی کی طرف آ کر کہیں ایسا تو نہیں کہ انہوں نے خود کو محدود کر لیا ہو تو صادقین نے جواب دیا تھا کہ ایسا نہیں ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے فن خطاطی میں اپنی تجرباتی مصوری سے بے حد فائدہ اٹھایا اور ان کی خطاطی میں

حسن جمال پیدا کرنے کے سلسلہ میں مصوری کا بڑا دخل ہے۔ وہ کہا کرتے تھے "مصوری ہو یا خطاطی ہو یا شاعری ہو' یہ تینوں فنون ہیں۔ خطاطی مصوری کی طرف لے جاتی ہے۔ مصوری شاعری کی طرف لے جاتی ہے اور شاعری پھر خطاطی کی طرف لے جاتی ہے تو اپنا فنی عمل تخلیق کارانہ عمل ہے' جو مصوری' شاعری' خطاطی کے دائرے کی صورت میں ہے۔ ایک فن دوسرے کی راہ ہموار کرتا ہے اور دوسرا تیسرے کی راہ ہموار کرتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی رباعیاں ان کے فن خطاطی کے تجربے پر مشتمل ہیں۔ اگر وہ خطاطی نہ کرتے تو رباعیاں نہ ہوتیں۔ مصوری نہ کرتے تو رباعیاں نہ ہوتیں۔ بعض رباعیاں تو ہیں ہی صرف تصویر میں تبدیل کرنے کے لیے مثلاً:

خطاطی میں اک کیف و سرور آتا ہے
وہ حسن بھی لوحوں پہ ضرور آتا ہے
مکھڑوں کے چراغوں کا تصور کر کے
لکھتا ہوں تو تحریر میں نور آتا ہے

تو بقول صادقین کے شاعری کا شوق انہیں خوش خطی کے سبب ہوا۔ یعنی شعر کہو تاکہ خوش خط لکھے جا سکیں اور خود اپنے لکھے ہوئے شعروں کو اپنی خطاطی میں ایک مجموعہ کی شکل دے سکیں۔

صادقین کو اپنی وقعت اور اپنی فن کارانہ صلاحیتوں کا بہت احساس تھا اور جیسا کہ اوپر میں نے لکھا اس کے اظہار کو وہ معیوب بھی نہیں سمجھتے تھے۔ ان میں ایک مخصوص انداز کا غرور تھا اور وہ بڑے لوگوں کو بے اعتنائی کی مار دے کر لطف اٹھاتے تھے۔ پنجاب کے تعلقات عامہ کے ایک افسر نے مجھے ایک واقعہ سنایا کہ مارشل لا کے زمانے میں وہ لاہور کی صوبائی اسمبلی کی عمارت کے اندر دیواروں کی نقش و نگاری اور مصوری پر کام کر رہے تھے۔ انہیں اسی عمارت کے ایک کھلے برآمدے میں جگہ دے دی گئی تھی' جہاں وہ رات دن اپنے کام میں مصروف رہتے۔ 1977ء میں مارشل لاگ جانے پر صوبائی اسمبلی میں مارشل لا سیکرٹریٹ کا دفتر قائم کر دیا گیا۔ اس دفتر میں صوبے کے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر' جو گورنر بھی تھے' اکثر آیا کرتے تھے۔ ایک دن گورنر صاحب نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ صادقین کا کام دیکھنا چاہتے ہیں لہٰذا گورنر بمعہ اپنے سٹاف پورے طمطراق کے ساتھ ان کا کام دیکھنے آئے۔

صادقین زمین پر لیٹے پینٹنگ کر رہے تھے۔ ہاتھ میں برش تھا۔ کپڑے رنگوں کے دھبوں سے بھرے تھے۔ فوجی گورنر نے اس دھان پان سے آدمی کو دیکھ کر کچھ عجب سا محسوس کیا۔ ان کے قریب آئے، مگر صادقین اسی طرح فرش پر لیٹے اپنے کام میں مصروف رہے۔ کسی افسر نے نیچے جھک کر ان کے کان میں آہستہ سے کہا "گورنر صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں......" صادقین نے لیٹے لیٹے گردن گھما کر اوپر کی طرف دیکھا اور پھر اسی طرح اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔ گورنر نے اسی میں عافیت سمجھی کہ ان کو مصافحہ کرنے کی تکلیف نہ دی جائے۔ تھوڑی دیر وہ ان کو پینٹ کرتا ہوا دیکھتے رہے۔ پھر چلتے ہوئے صادقین کے مجسے کو دیکھتے ہوئے بڑی خوش دلی سے بولے "صادقین صاحب کچھ کھایا پیا بھی کریں" ان کا فقرہ سن کر صادقین نے رنگوں کی ٹرے اور برش زمین پر رکھ دیے اور اٹھ کر سیدھے بیٹھ گئے۔ اپنے مخصوص انداز میں عینک کو انگلی سے ذرا ناک کے اوپر سرکایا اور بولے "گورنر صاحب کھاتا نہیں مگر پیتا خوب ہوں" گورنر صاحب ان کی بات کا مطلب سمجھ گئے اور مزید کچھ کہے بغیر مسکراتے ہوئے چلے گئے۔

صادقین کہا کرتے تھے ایسی باتیں وہ درویشی یا سادگی میں نہیں کرتے۔ بلکہ جان بوجھ کر کرتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا "فقیر اپنے وقت کا ایک بڑا شعبدہ باز بھی تو ہے...... اور یہ شعبدہ بازی ہی تو ہے جو بے علم اور جاہل لوگوں کو بھی اپنا پرستار بنا دیتی ہے"

اسلام آباد میں کئی برس ان کا قیام رہا اور وہ یہاں کی ثقافتی اور سماجی زندگی کا ایک حصہ بن گئے۔ اگرچہ وہ خود کم ہی کسی سوشل فنکشن میں شرکت کرتے تھے، مگر شہر میں ان کی موجودگی ہی پاکستان کے دارالحکومت کے لیے بڑا اعزاز تھی۔ ان کے ملنے والے اور چاہنے والے ان کی صحبت سے کسی نا کسی طرح فیض یاب ہوتے رہتے تھے۔ اسلام آباد میں ان کے عقیدت مندوں میں ہر طرح کے لوگ شامل تھے۔ بیرونی ممالک کے سفارت خانوں کے اراکین، آرٹ ادب اور فن سے تعلق رکھنے والے لوگ، افسر شاہی کے نمائندے اور ہم جیسے عقیدت مند۔ وہ خود تو کم ہی کہیں جاتے تھے۔ صرف چند گھر تھے جہاں ان کا آنا جانا تھا۔ میرے گھر کے علاوہ ہل روڈ پر نعیم الظفر کے ہاں، راولپنڈی میں پروین فنا سید کے ہاں، میرے دوست ڈاکٹر اختر حسن خان کے ہاں اور بیگم سرفراز اقبال کے ہاں جنہیں وہ "کوچے والوں" کے نام سے منسوب کرتے تھے۔ ان کا آنا جانا تھا۔ ایک دوبارہ وہ "سلسلہ" کی محفل میں بھی آئے۔ "سلسلہ"

ایک نیم ادبی قسم کی تنظیم تھی، جس کی بنیاد اسلام آباد میں ادا جعفری نے ڈالی تھی۔ اس کی محفلیں ہر ماہ منعقد ہوتی تھیں اور اس کے اراکین میں اسلام آباد کے معروف ادیب اور شاعر شامل تھے۔ جناب قدرت اللہ شہاب "سلسلہ" کے صدر نشین تھے۔ ادا جعفری سیکرٹری تھیں اور مستقل ممبران میں مختار مسعود، ضیا جالندھری، اصغر بٹ، نثار عزیز، اختر جمال، احسن علی خان، جنرل ڈاکٹر شفیق الرحمٰن، ضمیر جعفری، کرنل محمد خان، جمیل نشتر، صفیہ اور میں شامل تھے۔ دائرہ کی ممبر شپ کی شرط یہ تھی کہ میاں بیوی میں سے کوئی ایک شاعر یا ادیب ہو۔ ہم سب اس معیار پر پورے اترتے تھے۔ سوائے جمیل نشتر کے، جن کو اس شرط پر "سلسلہ" کا ممبر بنایا گیا تھا کہ وہ ہر میٹنگ میں کسی کتاب یا مضمون سے کوئی منتخب حصہ پڑھیں۔ اس تنظیم کے تحت منعقد ہونے والی ماہانہ نشستوں میں ہر رکن اپنے گھر سے ایک ڈش بنا کر لاتا۔ ہر محفل میں ابتدا کے دس منٹ غیبت کے لیے مختص تھے۔ اس کے بعد ایک نثری تحریر اور ایک شاعرانہ تخلیق پڑھ کر سنائی جاتی۔ مگر ان تخلیقات پر کوئی تنقید یا تبصرہ نہیں ہوتا تھا۔ یہ بات شاید قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہو کہ انہیں نشستوں میں، اراکین "سلسلہ" کے بے حد اصرار پر قدرت اللہ شہاب ہر دوسرے مہینے شہاب نامے کی ایک قسط لکھ کر لانے کے پابند تھے اور اس طرح ان کی مشہور کتاب بعد ازاں "شہاب نامے" کے نام سے شائع ہوئی۔ اس طرح اس کی اشاعت میں سلسلہ کا بھی بڑا حصہ ہے۔ تو صادقین بھی ایک دوبار ہمارے سلسلہ کی محفلوں میں آئے، مگر پھر انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ یہ اعلیٰ سرکاری افسروں کی انجمن ہے اور "فقیر صادقین" اس میں فٹ نہیں ہوتا۔

اسلام آباد کے شب و روز بڑی ہموار سطح پر گزر رہے تھے کہ ایک دن شام ڈھلے صادقین ہمارے گھر آئے اور انہوں نے یہ انکشاف کیا کہ وہ اسلام آباد سے کراچی منتقل ہو رہے ہیں...... مجھے اور میرے اہل خاندان کے لیے یہ بات ایک بڑے صدمے کی تھی۔ مگر فیصلہ ہو چکا تھا۔ صادقین صرف مطلع کرنے آئے تھے کہ "فقیر پرسوں صبح سویرے کراچی کے لیے کوچ کر جائے گا" اسلام آباد میں آخری رات ہم نے ان کے ساتھ گزاری۔ نہ چاہنے کے باوجود ان کی آنکھوں اور ان کے چہرے کے تاثرات میں ایک سوگواری سی تھی۔ ہم بہت سے دوست صادقین گیلری میں ان کے پاس بیٹھے تھے۔ باہر ٹرکوں پر ان کا سامان لادا جا رہا تھا۔ محفل پر ایک افسردگی سی طاری تھی۔ کسی نے کہا "صادقین آپ تو خوش ہوں

گے' اپنے شہر جا رہے ہیں" صادقین کو جیسے مہمیز سی لگ گئی۔ وہ بڑے ٹھہراؤ کے ساتھ گویا ہوئے "ہر شہر میرا شہر ہے۔ میں کسی ایک بستی کا مکین نہیں ہوں۔ کیا اسلام آباد' کیا کراچی' کیا لاہور...... سب میرے شہر ہیں...... اور یہ بھی چھوڑیئے میں تو جہاں بھی گیا...... اور میں دنیا کے ہر حصہ میں گیا ہوں۔ سارے براعظموں میں گھوما ہوں۔ مجھے تو ساری دنیا اپنی معلوم ہوتی ہے۔ میں نے جو وہ ایک رباعی کہی تھی' شاید وہ آپ نے سنی ہو:

البرز نہ الوند کا باشندہ ہوں
دلی نہ سمرقند کا باشندہ ہوں
ساری دنیا میرا وطن ہے یعنی
میں ارض خداوند کا باشندہ ہوں

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں بچپنے میں بڑے بڑے نقشے بناتا تھا اور ساری کرۂ ارض کو ایک اکائی کی حیثیت سے دیکھتا تھا۔ میں اس زمانے میں اپنی اٹلس بھی خود بناتا تھا...... اور یہ جو ملکوں کی سرحدیں ہیں یہ تو سیاسی نقشے ہوتے ہیں۔ میں طبعی نقشوں کا قائل ہوں۔ یعنی کرۂ ارض ایک اکائی ایک وحدت کے طور پر میرے سامنے آیا ہے۔ دنیا میں اکثر و بیشتر طول و بلد میں میرا قیام رہ چکا ہے اور میں نے دنیا میں کہیں خود کو اجنبی محسوس نہیں کیا۔ اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ میں ارض خداوند کا باشندہ ہوں...... صادقین جذباتی ہوتے جا رہے تھے۔ ہم سب نے محسوس کیا کہ یہ اسلام آباد شہر سے ان کی محبت ہے' جو ان کے ان لفظوں کے پیچھے کارفرما ہے۔ مگر کسی نے بھی یہ بات کہی نہیں۔ صادقین گیلری کے باہر ان کی پینٹنگز' ان کا سامان' ٹرکوں پر لادا جاتا رہا۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی اور ہم اسلام آباد کے آسمان کے نیچے آخری بار صادقین کی آواز سنتے رہے۔ اس کے کلام سے محظوظ ہوتے رہے۔ یوں وہ ہم سے اسلام آباد کے باسیوں سے رخصت ہوئے۔ لیکن اس وقت مجھے یہ احساس کہاں تھا کہ یہ صادقین سے میری آخری ملاقات ہے۔

کراچی منتقلی کے بعد صادقین سے کم ہی رابطہ ہوا۔ بس کبھی کبھار ان کے ہاتھ کا رقعہ لیے کوئی میرے پاس آجاتا' جس پر کوئی چھوٹا موٹا کام کرنے کی درخواست ہوتی۔ دراصل ان کے اسلام آباد سے جانے کے بعد سے ملک میں ایسی سیاسی تبدیلیوں کا دور شروع ہوا کہ میرے لیے ان سے کراچی میں ملاقات کرنا ممکن ہی نہ ہو سکا۔ حکومتیں بدلتی رہیں اور ہر بدلتی

حکومت کے ساتھ میرے محکمے بدلتے رہے۔ ان چار پانچ برسوں میں جب بھی حکومت بدلی۔ میرا محکمہ اور عہدہ بھی ساتھ ہی ساتھ بدلا...... ایک بار میں نے اپنے ایک بزرگ دوست سے جو بڑے اونچے درجے کے افسر رہ چکے تھے' یہ شکایت کی تو انہوں نے ہنس کر کہا "برادرم یہ مقام شکایت نہیں ہے۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہئے کہ تم اتنے اہم ہو کہ ملک کا وزیر اعظم تبدیل ہوتا ہے' تو ساتھ ہی تم کو بھی تبدیل کرنا ضروری ہو جاتا ہے" میرے ایک اور کرم فرما صفدر کاظمی صاحب' جو ان دنوں فیڈرل سیکرٹری تھے' جب بھی کسی فنکشن میں ملتے تو مجھ سے دریافت کرتے "آج کل کون سا محکمہ آپ کے نام سے پہچانا جاتا ہے" خیر یہ تو ذکر کچھ اور چل نکلا' بات صادقین سے ملاقات نہ ہونے کی ہو رہی تھی۔ میری بد قسمتی کہ ان کے کراچی قیام کے دوران میں ان سے نہ مل سکا۔ خبریں آتی رہتی تھیں کہ وہ فریئر ہال کو جس کا نام بدل کر لیاقت ہال کر دیا گیا تھا' اپنی تصویروں اور خطاطی کے نمونوں سے منقش کرنے میں مصروف ہیں اور ملک کی سب سے بڑی صادقین گیلری کی بنیادیں استوار ہو رہی ہیں۔ میں جب بھی کراچی جاتا ہر بار سوچتا کہ اس دفعہ صادقین سے ملے بغیر واپس نہیں آؤں گا' مگر افسوس اس سے پہلے کہ میں اپنے ارادے کی تکمیل کرتا' ان کی موت کی خبر آ گئی۔ اس خبر نے میرے گھر میں ایک ایسے سوگ کا ماحول پیدا کر دیا' جو کسی بہت ہی قریبی عزیز کی وفات پر ہوتا ہے......

میری بیوی' میرے تینوں بچے اور میں خود ان کی یادوں کے سحر میں ایک عرصہ تک محصور رہے۔ صادقین ایک ایسی زندہ اور طاقتور شخصیت تھے کہ مرنے کے بعد بھی ان کے مرنے کا یقین نہیں آتا تھا۔ آج بھی ان کی صورت' ان کی آواز' ان کی باتیں کچھ اس طرح یاد آتی ہیں کہ ہم یہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ انہیں ہم سے جدا ہوئے اب کتنے برس ہو چکے ہیں۔ کاش وہ کچھ عرصہ اور ہمارے ساتھ رہتے۔ اگر وہ زندہ رہتے تو شاید ہماری ثقافت اور فن کی دنیا میں کچھ اور بیش بہا اضافوں کا سبب بن سکتے۔ مجھے وہ خود کہا کرتے تھے "یہ محسوس ہوتا ہے۔ میں یہ سوچتا ہوں کہ کام تو کرنے کو بہت کچھ ہے' مگر عرصہ زندگی جو ہے وہ بہت مختصر ہے۔"

تخلیق کا دیکھا نہ ظہورہ اب تک
اک نقش بھی ہو سکا نہ پورا اب تک
ہاں وقت گزرتا ہی چلا جاتا ہے
اور میرا ہے ہر کام ادھوا اب تک

مصلح الدین

مصلح الدین کی وفات پر منعقد ہونے والے ایک تعزیتی اجلاس میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے میں نے کہا تھا "زندہ تو سب ہوتے ہیں، لیکن کچھ لوگ بہت زیادہ زندہ ہوتے ہیں۔ مصلح الدین بھی ایسے ہی لوگوں میں سے ایک تھا۔" اس بات سے میری مراد یہ تھی کہ مصلح الدین کی شخصیت، جسے اس کے دوست، آشنا، عزیز رشتہ دار سب صرف مصلح کہہ کر پکارتے تھے، ایسی تھی جس کے انگ انگ اور روئیں روئیں سے زندگی کی کرنیں پھوٹتی تھیں۔ جس محفل میں وہ آجاتا یوں لگتا تھا جیسے روشنی سی پھیل گئی ہے اور مجھے یہ بھی علم تھا یہ روشنی کس چیز کی ہے؟ اس روشنی کا منبع اس کی ایمانداری، بے خوفی، بلند ہمتی اور بے غرضی تھی۔ مصلح بڑا صحت مند انسان تھا، جسمانی طور پر بھی اور ذہنی طور پر بھی۔ جسمانی طور پر اس طرح کہ اس کی عادات اور معمولات ایسے تھے، جو انسان کو ہمیشہ تندرست و توانا رکھتے ہیں۔ اس کو پیدل چلنے کا بے تحاشا شوق تھا۔ وہ ایک دن میں میلوں پیدل چلتا تھا۔ میں نے کئی بار دیکھا وہ کسی جگہ پہنچنے کے بعد ڈرائیور کو گاڑی واپس لیجانے کے لیے کہہ دیتا تھا اور خواہ وہ جگہ کتنی ہی دور کیوں نہ ہو، وہاں سے اپنی اگلی منزل کی طرف پیدل سفر کرنے کو ترجیح دیتا تھا۔ وہ بہت کم خوراک تھا۔ اس کو اچھے اور لذیذ کھانوں کا شوق تھا۔ لیکن خود کھانے سے زیادہ دوسروں کو کھلانے میں۔ میں نے اس کے گھر پر بارہا کھانا کھایا...... اس کے ساتھ شاید ہی لاہور اور اسلام آباد کا کوئی اچھا ریسٹورانٹ ہو، جہاں ہم ساتھ نہ گئے ہوں۔ میں نے ہمیشہ یہ دیکھا کہ کھانوں کے انتخاب اور پسند اس کے اعلیٰ ذوق کی عکاسی کرتے تھے۔ لیکن میں نے کبھی اس کو ایک خاص مقدار سے زیادہ کوئی چیز پلیٹ میں ڈالتے نہیں دیکھا۔ وہ کہتا تھا بسیار خوری انسان کو گھن کی طرح چاٹ جاتی ہے۔ انسان کو کھانے کے لیے زندہ نہیں رہنا

چاہیے' زندہ رہنے کے لیے کھانا چاہیے' مگر اچھا کھانا۔ اسے کوئی ایسی لت نہیں تھی جسے مضر صحت سمجھا جاتا ہو۔ وہ سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ شراب کو ساری زندگی اس نے ہاتھ نہیں لگایا۔ چائے اور کافی کا شوق بھی چائے خانوں اور کافی ہاؤس میں بیٹھنے کے سبب تھا' ورنہ وہ چائے یا کافی کا رسیا نہیں تھا۔ اس کی زندگی بڑی منظم تھی۔ اسی لیے میں کہتا ہوں وہ جسمانی طور پر ایک انتہائی صحت مند انسان تھا۔ ان طویل برسوں کے دوران جن میں ہمارا ساتھ رہا' میں نے بہت کم اس کو بیمار ہوتے دیکھا۔

مصلح الدین میں ایک عجیب درویشی اور فقیری تھی۔ وہ حسب مراتب کا بے حد قائل تھا۔ بزرگوں کا ادب کرنا اور چھوٹوں کو عزت دینا اس کی سرشت میں شامل تھا۔ اس کے اعلیٰ اخلاق کا چرچہ سارے ٹیلی ویژن میں تھا۔ ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ اس نے کبھی دوسروں کو سلام کا موقع دیا ہو۔ افسر ہوں یا ماتحت' چھوٹے ہوں یا بڑے' سلام کے لیے اس کا ہاتھ ہمیشہ پہلے اٹھ جاتا تھا۔ بعض لوگوں کو کہ جن میں میں بھی شامل تھا' وہ مخصوص نیم فوجی سلیوٹ کے انداز میں سلام کرتا۔ یہ اس شخص کے عزت اور احترام کے ایک درجہ اور بلند ہونے کی دلیل ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ کام کرنے والے اس کے جونیئر ساتھیوں کا کہنا ہے کہ "صبح دفتر کے اوقات شروع ہوتے ہی وہ سب سے پہلے دفتر پہنچتے اور جو کوئی بھی انہیں نیوز بیورو کے کوریڈور میں نظر آتا وہ اسے سلام کرتے' مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے اور شاباش' ویری گڈ' بہت اچھے جیسے مخصوص الفاظ کہتے ہوئے اپنی دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ اپنے کمرے میں چلے جاتے۔" وہ ایک انسان دوست اور انسان ترس کردار کا مالک تھا۔ اس کے نزدیک' غریب سے غریب اور چھوٹے سے چھوٹے آدمی کی بھی وہی عزت اور وہی تکریم تھی' جو کسی شہرت یافتہ انسان یا بڑے عہدے پر فائز شخص کی۔ وہ عزت کرنا اور عزت کرانا جانتا تھا۔ میں نے اکثر اسے کہتے سنا "ہر شخص کی اپنی اپنی سوچ ہوتی ہے' سب ایک جیسے نہیں ہوتے...... فکر ہر کس بقدر ہمت اوست...... بس پروا نہیں کرنی چاہیے۔" یہ فقرہ ایک طرح سے اس کا تکیہ کلام تھا۔ مجھے کوئی پریشانی ہوتی' کوئی دفتری الجھن ہوتی تو ساری بات بڑے غور اور اطمینان سے سن کر کہتا "آغا صاحب پرواہی نہ کیا کریں۔" دوسری ایک عادت اس کی یہ بھی تھی کہ جب بھی ملاقات کے بعد جدا ہوتا یہ فقرہ ضرور کہتا "میرے لیے دعا کیجیے گا۔" اپنے ملنے والوں اور اپنے ساتھ کام کرنے والوں سے اس کا ذاتی حسن سلوک اس کی بلند اخلاقی کا منہ بولتا ثبوت

تھا۔ وہ بلا امتیاز ہر کسی کے ساتھ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتا' خواہ ملنے والے سے اس کا رشتہ دفتری ہو' خاندانی ہو' دوستی ہو یا بالکل اجنبیت ہو۔ اس کی شفاف دلی' خلوص اور انکسار نے اس کے لیے اپنوں اور غیروں کے دل میں ایسے جذبات پیدا کیے کہ سب ہی اس کو اپنا مشفق اور ہمدرد سمجھتے تھے۔ اس کے ساتھ کام کرنے والے ایک نائب قاصد کا کہنا ہے کہ "مصلح صاحب بڑے نیک آدمی تھے اور اپنے کام کا بڑا تجربہ رکھتے تھے۔ جب کبھی ملک سے باہر جاتے مجھ سے پوچھتے میں تمہارے لیے کیا لاؤں۔ صبح جب دفتر آتے تو اس سے پہلے کہ میں سلام کروں' وہ خود آگے بڑھ کر سلام کرتے اور ہاتھ ملاتے۔"

میں نے مصلح کو کبھی کسی آدمی کو "صاحب" کا لاحقہ لگائے بغیر مخاطب کرتے نہیں دیکھا' خواہ وہ عہدے' رتبے یا عمر میں مصلح سے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو۔ میں اس کے بہت سے قریبی ساتھیوں کو ذاتی طور پر جانتا ہوں' جنہوں نے برس ہا برس اس کے ساتھ کام کیا' مگر اختر وقار عظیم' اختر صاحب' نوید ظفر' نوید صاحب' ممتاز حمید راؤ' راؤ صاحب' شکور طاہر' شکور صاحب' اسلم خاں' اسلم خاں صاحب یہاں تک کہ اپنے سیکرٹری اور نائب قاصد کو بھی وہ سلطان صاحب اور گل محمد صاحب ہی کہہ کر پکارتا تھا۔ یہ سارے لوگ اور ان کے علاوہ بے شمار لوگ' جنہوں نے مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر مختلف حیثیتوں میں اس کے ساتھ کام کیا' اس کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔ کیونکہ وہ اپنے ساتھ کام کرنے والے ساتھیوں اور دوستوں کا خاص خیال رکھتا تھا۔ اگر ان کے مسائل کو حل نہ بھی کر سکے اور ان کے دکھوں کا علاج نہ بھی کر سکے' پھر بھی وہ اپنی موجودگی سے' اپنی باتوں سے انہیں حوصلہ دیتا تھا۔ اس کا کوئی دوست بیمار ہو جائے' کسی جاننے والے کے یہاں کوئی فوتگی ہو جائے' اسے خبر لگے کہ کسی شناسا کو کوئی حادثہ درپیش آیا ہے' کسی مشکل کا سامنا ہے' مصلح الدین وہاں ضرور جاتا۔ وہ مشکلوں اور غموں میں کام آنے والا اور ساتھ رہنے والا انسان تھا۔ اپنے دوستوں کو اچھے مشورے دینے' ان کے حالات معلوم کرنے اور ان کو ہمت و حوصلہ عطا کرنے میں اس نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ وہ ایک صحت مند' تخلیقی اور روشن ذہن کا مالک تھا اور اس کے پاس نئے آئیڈیاز اور شاندار منصوبوں کی کبھی کمی نہ ہوتی تھی۔ ٹیلی ویژن میں پروگراموں کی تدوین و ترتیب اور نئے نئے منصوبوں پر عملدر آمد کے سلسلہ میں میرے خیال میں جتنے گرانقدر مشورے مصلح نے مجھے دیے' پروگرام کے شعبوں سے تعلق

رکھنے والے لوگوں نے بھی نہیں دیئے۔ اس کے کہنے پر ہم نے صفدر میر سے ''آخر شب'' کے زیر عنوان ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے حالات پر ڈراموں کا ایک سلسلہ لکھوایا۔ اس کے ایما پر ہم نے شبیر شاہ کے ناول ''جھوک سیال'' پر مبنی ڈرامہ سیریز پیش کی۔ اس کے مشورے پر ہم نے بزرگ مشاہیر شخصیات کے انٹرویوز ریکارڈ کیے تاکہ ان کی وفات پر تعزیتی پروگرام تشکیل دیئے جا سکیں۔ غرض بے کل ہے چین مصلح ہر دم' ہر گھڑی نئے نئے منصوبوں کی سوچ میں لگا رہتا۔ جب میں پہلی بار پی ٹی وی کا مینجنگ ڈائریکٹر بنا' تو اس نے ایک دن مجھے کہا ''سر آپ آئے ہیں تو کوئی بڑا کام کر کے جائیں تاکہ یاد رہے۔ اچھے برے پروگرام تو ہوتے ہی رہتے ہیں' پھر اسی نے مجھے صبح کی نشریات کا آغاز کرنے کا مشورہ دیا۔ ہم نے دو تین مہینے کی تیاری کے بعد فروری 1988ء میں ڈیلی مارننگ ٹرانسمیشن کا آغاز کیا' جواب بہت بہتر صورت اختیار کر چکا ہے۔

مصلح طبعاً ایک شرمیلا آدمی تھا۔ وہ اپنے گھر میں اکیلے بیٹھ کر مطالعہ کرنے کو بے مقصد اور فضول کھیل تماشوں' استقبالیوں اور رت جگوں والی محفلوں پر ترجیح دیتا تھا۔ اول تو وہ کھانے کی دعوتوں اور تقریبات سے دور ہی رہنا پسند کرتا مگر کبھی مجبوراً اسے ایسی کسی تقریب میں شرکت کرنا ہی پڑتی تو وہ ساری خلقت سے الگ' حسن اخلاق کا ایک پیکر بنا نظر آتا۔ خواتین کے ساتھ بطور خاص وہ جس احترام اور عزت سے پیش آتا تھا' وہ قابل دید ہوتا۔ دونوں ہاتھ آگے کی طرف باندھے وہ مؤدب کھڑا نگاہیں نیچے کیے گفتگو کرتا۔ میری بیوی کے ساتھ اس کے بڑے بے تکلفانہ تعلقات تھے اور اسلام آباد میں میرا گھر بھی ان چند گنے چنے گھروں میں شامل تھا' جہاں وہ کسی تقریب یا محفل میں شرکت کی دعوت قبول کر لیتا تھا۔ میری بیوی کا کہنا ہے کہ مصلح بڑا شرمیلا اور پرائیویٹ قسم کا انسان تھا۔ نہ وہ غیر ضروری باتیں کرتا تھا' نہ غیر ضروری لوگوں سے ملنا پسند کرتا تھا۔ وہ زندگی کے طویل عرصہ تک بالکل تنہا رہا۔ حالانکہ انواع واقسام کی لڑکیاں اس کے گرد منڈلاتی رہیں۔ لاہور کے زمانے میں تو آئے دن اس کے رومانس اور شادی کی افواہیں پھیل جاتی تھیں' مگر جب وہ ملتا اور میں اس سے پوچھتا کہ یہ کس حد تک صحیح خبر ہے...... تو وہ بے اختیار ہنس دیتا اور کہتا کہ ''افواہیں صحیح ہیں' مگر خبر ابھی تک غلط ہے۔ اور جب کبھی افواہ نے خبر کی صورت اختیار کی تو آپ ان لوگوں میں سے ہوں گے' جنہیں سب سے پہلے علم ہو جائے گا۔ اور مہمانوں

کی فہرست میں بھابی کا اور آپ کا نام سر فہرست ہو گا۔" پھر ایک طویل عرصہ گزر گیا' لاہور پیچھے رہ گیا۔ عہد شباب گزر گیا۔ سب کو یقین ہو گیا کہ اب مصلح شادی نہیں کرے گا۔ لیکن ایک دن اچانک اس نے مجھے بتایا کہ اس کی شادی ہو رہی ہے۔ اسے اپنی پسند کا جیون ساتھی مل گیا تھا۔ نویدہ بخاری کالج میں تاریخ پڑھاتی تھیں اور بقول مصلح الدین اسے نویدہ میں وہ ساری خوبیاں نظر آئیں' جن کی تلاش میں اس کی عمر گزری تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ میری ہونے والی بیوی ایک نہایت کلچرڈ خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اور ماں باپ دونوں کی جانب سے علم و فضل اسے ورثہ میں ملا ہے۔ میں بہت خوش ہوا' چونکہ مصلح کو ایسی ہی شریک حیات کی ضرورت تھی۔ پھر ایک شام اسلام آباد کے ایک ہوٹل میں بڑے گنے چنے مہمانوں نے اس کی شادی کے استقبالیہ میں شرکت کی اور مصلح الدین شادی شدہ ہو گیا۔ مگر کمال کی بات یہ ہے کہ شادی کے بعد بھی دوستوں کے لیے اس کے رویہ اور طریقوں میں کوئی خاص فرق نہیں آیا' نہ ہی اپنے پیشہ اور کام سے والہانہ محبت میں کوئی کمی واقع ہوئی۔ وہ ایسا ہی رہا جیسا تھا۔ البتہ شیزان میں اس کا وقت پہلے سے کم گزرنے لگا۔ اس کا شرمیلا پن' اخلاقی اقدار و ضع داری کی ناقابل بیان صفت مزاج کی لطافت طرز تکلم اور تکلف اور رکھ رکھاؤ سب کچھ اسی طرح برقرار رہے۔ حتیٰ کہ اپنی بیوی کے ساتھ بھی اس کا رویہ ایسا ہی رہا۔ اس کی موت کے بعد نویدہ مصلح الدین نے ایک دن میری بیوی سے کہا "ان تمام برسوں میں مصلح نے مجھے اپنے گھر میں ایسے تکلف کے ساتھ رکھا' جیسے کوئی مہمان کو رکھتا ہو۔" جو لوگ مصلح کو جانتے ہیں وہ اس بات کی سچائی کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ کسی نے اس کے بارے میں کہا تھا کہ وہ تو ایسے وضع دار آدمی ہیں کہ ناگواری کا اظہار بھی نرم اور ملائم لہجے میں کرتے ہیں اور کسی بات پر کبھی "نا" نہیں کہتے۔ لیکن سمجھنے والے خود سمجھ جاتے ہیں کہ کس "ہاں" میں "نا" پوشیدہ ہے۔

مصلح الدین کا تعلق جالندھر سے تھا۔ اس کی ابتدائی تعلیم جالندھر کے سکول میں ہوئی۔ پھر آزادی کے بعد اس کا خاندان ہجرت کر کے پاکستان آ گیا۔ مصلح نے گورنمنٹ کالج لاہور سے تاریخ کے مضمون میں ایم اے کیا۔ تاریخ اس کا پسندیدہ مضمون تھا اور چونکہ صحافت بھی عصر حاضر کی تاریخ ہی ہوتی ہے' اس لیے اس پیشہ سے اس کی دلچسپی بالکل فطری تھی۔ اس کے پرانے دوست بتاتے ہیں کہ طالب علمی کے زمانے میں بھی اگر کوئی اس سے

دریافت کرتا کہ تم تحصیل علم کے بعد کیا بننا پسند کرو گے تو وہ بلا توقف جواب دیتا "صحافی" مولانا ظفر علی خاں اس کے آئیڈیل تھے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے اپنے حسب منشا صحافت کے پیشے کو اپنایا اور "نوائے وقت" سے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ مصلح کے ایک قریبی ساتھی نوید ظفر نے، جنھوں نے ایک طویل عرصہ ٹیلی ویژن میں اس کے ساتھ کام کیا۔ مصلح الدین پر کسی اخبار میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں اس کی ابتدائی ملازمت کے سلسلہ میں کچھ یوں لکھا ہے "نوائے وقت میں ملازمت سے مصلح الدین کی صحافت کے شعبہ سے وابستگی کا آغاز تو ہو گیا، مگر نیوز روم میں بیٹھ کر گپ بازی میں وقت ضائع کرنا انہیں پسند نہیں تھا، اس لیے اپنی سٹوری فائل کر کے یعنی اپنی لائی ہوئی خبریں متعلقہ شعبے کے ایڈیٹر کو دے کر وہ وقت گزاری کے بہتر مواقع کی تلاش میں دفتر سے غائب ہو جایا کرتے۔ ان غیر حاضریوں سے اخبار کے منتظمین نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ اپنے کام سے انصاف نہیں کر رہے ہیں۔ لہٰذا ان کو انتظامیہ کی جانب سے ایک خط ملا، جس میں ان کی جواب طلبی کی گئی تھی اور حکم دیا گیا تھا کہ وہ ساری نیوز سٹوریز، جو انہوں نے لکھی ہیں مع سارے کوائف کے یعنی فی انچ کے حساب سے اشاعت کے لیے دی جانے والی خبروں کا حجم فی کالم کتنا بنتا ہے، اپنے انچارج کی خدمت میں پیش کریں۔ مصلح نے حکم کی بجا آوری کرتے ہوئے اپنی حاصل کردہ ساری خبروں کی نقول انچوں اور کالموں کے حساب کے ساتھ انتظامیہ کو پیش کر دیں اور ساتھ ہی ایک مختصر سا خط بھی لکھا کہ خبروں کو انچوں اور کالموں کے پیمانے سے ناپنا غیر مناسب بات ہے اور اس بنا پر وہ ملازمت سے استعفیٰ دینے کو تیار ہیں۔ مگر انتظامیہ نے جواب طلبی کا خط واپس لے لیا۔

مصلح کی ابتدائی پیشہ ورانہ تربیت "نوائے وقت" ہی میں ہوئی، جہاں اس نے مجید نظامی اور ظہور عالم شہید کے زیر سایہ اپنے صحافتی سفر کا آغاز کیا۔ "نوائے وقت" کے بعد وہ کچھ عرصہ سول اینڈ ملٹری گزٹ سے وابستہ رہا اور پھر اے پی پی میں آ گیا۔ 1965ء میں لاہور میں پاکستان ٹیلی ویژن کے خبروں کے شعبوں میں بحیثیت سینئر رپورٹر ملازم ہونے سے قبل اے پی پی ہی میں کام کرتا رہا۔ مصلح الدین کا شمار ٹیلی ویژن کے بانیوں میں کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ اس نے خبروں کے شعبے میں جیسے جیسے کارنامے سرانجام دیئے اور تجربے کیے، وہ کسی اور کو نصیب نہ ہو سکے۔ تاریخ کے مضمون سے اپنے لگاؤ کی تسکین کے لیے ٹیلی ویژن میں اسے

بہت مواقع ملے۔ اسے تاریخی موضوعات اور شخصیات پر مختصر دورانیہ کے دستاویزی پروگرام پروڈیوس کرنے کا بے حد شوق تھا۔ اس نے حضرت نظام الدین اولیاؒ' داتا گنج بخشؒ' سلطان ٹیپو شہیدؒ' علم الدین شہیدؒ' چودھری رحمت علی' مولانا محمد علی جوہر' حضرت امیر خسرو' بہادر شاہ ظفر' مولانا رومؒ' شیخ سعدیؒ اور دوسری بہت سی تاریخی شخصیات پر بڑی موثر فلم رپورٹ اور مختصر دورانیہ کے پروگرام بنائے۔ وہ دنیا کے جس شہر میں بھی جاتا' وہاں کی تاریخ' ثقافت' شعر و ادب اور موسیقی کے بارے میں معلومات جمع کرتا۔ اردو شاعروں سے اس کی خاص محبت تھی۔ ابن انشا' ناصر کاظمی اور مجید امجد وغیرہ پر اس نے خود تعزیتی پروگرام ترتیب دیئے اور پیش کیے۔

سپورٹس سے مصلح الدین کو گہرا جذباتی لگاؤ تھا۔ وہ اگر صحافی نہ بنتا تو سپورٹس کے میدان میں ایک کھلاڑی کی حیثیت سے شہرت پاتا۔ شہرت تو اس نے یوں بھی کھیلوں کے حوالے سے بہت پائی' مگر کھلاڑی کی حیثیت سے نہیں' ٹیلی ویژن کے مبصر اور پروڈیوسر کی حیثیت سے۔ اس نے ٹیلی ویژن کی ملازمت کے دوران تقریباً سارے ہی اولمپکس میں شرکت کی اور ان کے علاوہ ایشیائی کھیلوں' ہاکی اور کرکٹ کے ورلڈ کپ اور بے شمار ٹیسٹ میچوں کی ٹی وی نشریات کی نگرانی کے فرائض انجام دیئے۔ کھلاڑیوں اور کھیلوں کے تبصرہ نگاروں میں اس کی بڑی اہمیت اور عزت تھی۔ تقریباً سارے ہی مشہور کھلاڑی اور کمنٹیٹرز اس کے ذاتی دوست تھے' مگر مجال ہے جو پیشہ ورانہ معاملات میں وہ ان میں سے کسی کی سفارش یا مداخلت برداشت کرتا ہو۔ مجھے یاد ہے 1972ء میں جب پیپلز پارٹی کی پہلی حکومت بنی تو کرکٹ کے مشہور کھلاڑی عبدالحفیظ کاردار' جو پنجاب میں صوبائی وزیر بھی تھے' کرکٹ کنٹرول بورڈ کے صدر مقرر ہوئے۔ مصلح الدین پی ٹی وی میں سپورٹس کا انچارج تھا۔ انہی دنوں کرکٹ ٹیسٹ کھیلنے کوئی ٹیم پاکستان آئی۔ میں نیا نیا پی ٹی وی کا ڈائریکٹر پروگرام مقرر ہوا تھا۔ مجھے کاردار صاحب کا فون آیا' جنہوں نے کرکٹ کمنٹری کے لیے کچھ نام تجویز کیے اور یہ بھی دریافت کیا کہ کن کن شہروں میں کون کون سے کمنٹیٹر بک کیے جا رہے ہیں۔ میں نے مصلح کو فون کیا کہ حفیظ کاردار صاحب کی یہ خواہش ہے۔ حسب عادت مصلح کا پارہ ایک دم چڑھ گیا اور اسے اپنے پیشہ ورانہ کام میں یہ مداخلت بالکل پسند نہ آئی۔ حالانکہ جتنی عزت وہ کاردار صاحب کی کرتا تھا' اتنی شاید ہی کسی اور کرکٹر کی کرتا ہو۔ لیکن یہ اس کے اپنے پیشہ کی

عصمت کا معاملہ تھا۔ اس نے اپنے مخصوص ترش طنزیہ لہجے میں کہا "سر کاردار صاحب کو کہہ دیں کہ پی ٹی وی نے تو کرکٹ بورڈ کی انتظامیہ سے یہ دریافت نہیں کیا کہ کون کون سے شہر میں کون سے کھلاڑی میچوں میں حصہ لے رہے ہیں۔ پھر کرکٹ بورڈ والے ہمارے کمنٹیٹروں کی بکنگ کے سلسلہ میں مداخلت کیوں کر رہے ہیں" ظاہر ہے اتنا سخت جواب کاردار صاحب کو دینا میرے لیے بڑا مشکل کام تھا۔ مگر غالباً مصلح کا یہ تبصرہ کسی اور ذریعہ سے ان تک پہنچ گیا اور مجھے ان کے دفتر سے پیغام آ گیا کہ کاردار صاحب نے جو معلومات حاصل کرنے کے لیے کہا تھا' اس کی ضرورت نہیں ہے۔

مصلح کو کھیلوں کی دنیا میں نہ صرف پاکستان بلکہ عالمی سطح پر شہرت حاصل تھی۔ بعض بین الاقوامی کھلاڑیوں سے جو عالمی شہرت رکھتے تھے' اس کے تعلقات اس قدر قریبی تھے کہ وہ ان کو پہلے نام سے پکارتا تھا۔ وہ کھلاڑیوں کے ساتھ اور ان کی محفلوں میں بے حد مسرور رہتا تھا۔ مجھے ایک واقعہ یاد ہے۔ لاہور میں کرکٹ کا ٹیسٹ میچ ہو رہا تھا۔ پورے دن ظہیر عباس وکٹوں پر جما رہا اور کھیل کا وقت ختم ہونے تک ہندوستانی کھلاڑیوں کی پٹائی کرتا رہا۔ رات کو انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں ہندوستانی ٹیم کے کپتان بشن سنگھ بیدی نظر آئے تو مصلح نے دور ہی سے آواز لگائی اور پنجابی میں کہا "بیدی صاحب! صبح ظہیر عباس کی عدالت میں آپ کی حاضری کس وقت ہے؟"

مصلح کو کھیلوں اور کھلاڑیوں پر پروگرام کرنے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ ان تمام شعبوں میں جو مختلف اوقات میں اس کے سپرد رہے اور اس سے چھینے جاتے رہے اسے سپورٹس سب سے زیادہ عزیز تھا۔ میں نے اس دن اسے بے حد افسردہ اور ملول پایا' جس دن سپورٹس کا شعبہ اس سے لے کر کسی اور کو دیا گیا۔

ذہنی طور پر بھی وہ اتنا ہی صحت مند تھا' جتنا جسمانی طور پر۔ اپنے غصہ' ناراضگی' ناپسندیدگی اور خفگی کے اظہار کے لیے وہ ساری بھڑاس تند و تیز فقروں اور طنز و مزاح سے بھرپور کالموں کے ذریعے نکالتا تھا۔ صاف گوئی اور تنقید اسکے کردار کا سب سے اہم جز تھے۔ وہ دل میں بات رکھنے کا قائل نہیں تھا۔ کسی کے خلاف سازش کرنا اسکا شعار نہیں تھا۔ پیٹھ پیچھے جو باتیں وہ کسی کے بارے میں کہتا تھا' وہ ان کے سامنے بھی اسی طرح دہرا دیتا تھا اور اس کے اس رویے میں کسی کے لیے کوئی رعایت نہیں تھی' خواہ اس کے افسر ہوں یا ماتحت'

دوست ہوں یا غیر' ادارے ہوں یا سرکار عالی مدار' منہ پر آیا ہوا فقرہ روکنے کی اس کو عادت ہی نہیں تھی۔ حالانکہ اس عادت کے سبب زندگی میں اس نے بار بار' بڑے بڑے نقصان اٹھائے مگر اس نے کبھی اس بات کی پروا نہ کی۔ وہ اپنے دوستوں سے بھی یہی کہتا تھا "پروا نہ کیا کریں" اور خود بھی اسی اصول پر عمل کرتا تھا۔ لیکن جس دن وہ مرا اور جس طرح اس کی موت واقع ہوئی' تو میں نے پہلی بار سوچا کہ اس نے تو اپنے دل پر جانے کتنا بڑا بوجھ اٹھایا ہوا تھا۔ جانے وہ کتنے زخم چھپائے پھرتا تھا۔ دوسروں کو "پرواہی نہ کریں" کی تلقین کرنے والا مصلح ظاہراً پروا نہیں کرتا تھا' مگر اندر ہی اندر اس کے حساس دل میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل متواتر اور مسلسل جاری تھا یہ اور بات کہ خود دار اور پر اعتماد مصلح الدین نے کبھی کسی کو اس کی خبر نہ دی اور جب یہ بوجھ اتنا بڑھ گیا کہ برداشت نہ ہو سکے تو ایک دن اچانک اس دنیا سے رخصت ہو گیا' بالکل اسی طرح جیسے وہ بغیر کسی کو بتائے تقریبوں اور محفلوں سے غائب ہو جایا کرتا تھا۔

اس کے ایک پیشہ ور ساتھی اور دوست برہان الدین حسن نے اس کے انتقال پر لکھا تھا:
"مصلح الدین جس نے ساری عمر خبریں بنانے میں گزاری بالآخر خود خبر بن گیا۔ میرے خیال میں مصلح الدین کی موت میں بھی خبر کا بڑا دخل ہے۔ انہوں نے ایک بڑا عرصہ "خبر" کی حرمت کو پامال ہوتے دیکھا۔ یہ بات کسی بھی دیانتدار اور مخلص صحافی کے لیے بڑے کرب کا باعث ہوتی ہے۔ جب بھی کوئی سچی خبر روک لی جاتی ہے' جھوٹی خبر دی جاتی ہے یا نان نیوز کو نیوز بنا کر پیش کیا جاتا ہے تو صحافی کے دل پر ایک چھوٹا سا زخم لگ جاتا ہے' پتا نہیں ایسے کتنے زخم مصلح الدین کے دل پر لگتے رہے اور وہ انہیں برداشت کرتے رہے۔ مجھے جب کبھی ان سے اس موضوع پر بات کرنے کا اتفاق ہوا میں نے محسوس کیا کہ بظاہر پرسکون مسکراتے شخص کے اندر ایک طوفان بپا ہے۔"

مجھے برہان الدین حسن کی اس بات سے مکمل اتفاق ہے۔ اپنے پیشہ کی حرمت کو برقرار رکھنے کے لیے مصلح نے جیسے جیسے کڑے وقت جھیلے میں ان سے واقف ہوں' مگر اس نے کبھی ہار نہیں مانی۔ وہ ساری زندگی جنگ کرتا رہا۔ ایک سرکاری محکمہ سے تعلق رکھنے کے سبب ظاہر ہے وہ سب وہ کر تو نہ سکا جو کرنا چاہتا تھا' لیکن اس نے اس بات کا اظہار برملا کیا کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط ہے۔ ایک دن کسی محفل میں جہاں ملک کے بڑے بڑے جگادھری

صحافی جمع تھے' پی ٹی وی کے خبرنامہ پر بے تحاشا تنقید ہو رہی تھی اور اس تنقید کا نشانہ مصلح الدین تھا۔ اس محفل میں جو ایک بات اس نے کہی وہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہ خبرنامہ میں نشر کی جانے والی خبریں سرکار کی پالیسی کے مطابق ہوتی ہیں اور ان میں بے شمار ایسی خبریں بھی شامل کرنا پڑتی ہیں' جو دیانت اور معیار کے صحافتی پیمانوں پر پوری نہیں اترتیں۔ اس نے کہا "مجھے تسلیم ہے کہ آپ کو بہت سی خوشامدانہ' غلط جھوٹے الزامات سے ملوث خبریں دیکھنا پڑتی ہیں اور میں اپنے اس جرم کو تسلیم کرتا ہوں کہ ہمیں جانتے بوجھتے یہ کرنا پڑتا ہے' مگر ذرا کسی دن ٹی وی نیوز روم میں آ کر ان لاتعداد خبروں کے ڈھیر کو بھی دیکھیں جنہیں میں نشر کرنے سے روک دیتا ہوں۔ کم از کم یہ کریڈٹ تو مجھے ملنا چاہئے کہ جھوٹی اور ناجائز خبروں کا کچھ حصہ ہی آپ تک پہنچتا ہے' بڑا حصہ نیوز روم کی کوڑے کی ٹوکریوں میں چلا جاتا ہے۔" جو لوگ سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کے طریقوں سے واقف ہیں' وہ بخوبی یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ غلط بیانیوں کو روکنا بذات خود کتنا مشکل کام ہے۔ مصلح ساری زندگی یہ مشکل کام کرتا رہا اور بار بار اس کو اس کی سزا بھی ملتی رہی۔

مصلح الدین سے میری ملاقات 1965ء میں لاہور میں ہوئی' جہاں ہم دونوں نئے نئے قائم ہونے والے پاکستان کے پہلے ٹیلی ویژن سٹیشن سے منسلک تھے۔ تین مہینے کی تجرباتی نشریات کے بعد جب حکومت نے مستقل بنیاد پر ملک میں ٹیلی ویژن نشریات کا نظام قائم کرنے کا فیصلہ کیا تو لاہور کے چھوٹے سے ٹیلی ویژن سٹیشن پر نئے لوگوں کی بھرتیاں شروع ہو گئیں۔ ورنہ ابتدائی تین مہینے تو صرف گنتی کے چند لوگوں پر ہی گزارا تھا۔ مصلح بھی انہی دنوں خبروں کے شعبے میں آیا تھا' جس کے انچارج اس کے پرانے دوست ظفر صمدانی تھے۔ ویسے براہ راست تو میرا خبروں کے شعبے سے کوئی تعلق نہیں تھا' مگر چونکہ ہم گنتی کے چند آدمی تھے اور سب کے سب ریڈیو یا اخباروں سے آئے تھے' اس لیے ذہنی ہم آہنگی اور مشترک دلچسپیوں کے سبب پروگرام' نیوز' انجینئرنگ یہاں تک کہ ایڈمنسٹریشن کے شعبوں سے تعلق رکھنے والے بھی ایک دوسرے کے دوست آشنا بن گئے تھے۔ لاہور کا ٹیلی ویژن سٹیشن ایک طرح سے ہمارا گھر تھا اور اس میں کام کرنے والے سارے لوگ ایک خاندان کی طرح تھے۔ ڈرائیور' ٹائپسٹ' کلرک سے لے کر پیشہ ور کارکنوں تک جن میں انجینئر' سیٹ ڈیزائنر' میک اپ آرٹسٹ' کیمرہ مین' فلم ایڈیٹر' پروڈکشن اسٹنٹ'

اناؤنسر، پروڈیوسر، نیوز رپورٹر، ایڈیٹر اور نیوز کاسٹر سب ہی شامل تھے۔ اگرچہ یہ افراد کام کی نوعیت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے قطعی مختلف تھے، مگر سب ایک دوسرے کو جانتے تھے اور یوں نئے نئے رشتے اور نئی نئی دوستیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ مجھے یہ تو یاد نہیں کہ مصلح سے میری دوستی کا آغاز کب ہوا، مگر اتنا جانتا ہوں کہ جب مجھے اس دوستی کا احساس ہوا تو یہ بے حد مضبوط بنیادوں پر استوار ہو چکی تھی۔ میں کراچی سے تبادلہ ہو کر لاہور آیا تھا اور اکثر لوگوں کے لیے اجنبی تھا، مگر ٹیلی ویژن کے ماحول میں یہ اجنبیت بہت ہی عارضی ثابت ہوئی۔ اور جلد ہی دوستوں کا ایک حلقہ پیدا ہو گیا۔ مصلح میرے ان نئے دوستوں کے حلقے میں شامل تھا، بلکہ اس حلقہ کا بہت اہم فرد تھا۔

ہمارا یہ رشتہ کم و بیش 25 برسوں پر محیط ہے۔ ہم نے مختلف حیثیتوں میں ساتھ کام کیا ہے۔ جب میں لاہور میں پروگرام منیجر تھا تو مصلح نیوز رپورٹر کے طور پر کام کرتا تھا۔ راولپنڈی اسلام آباد سٹیشن پر جہاں میں جنرل منیجر بن کر آیا تو مصلح الدین وہاں کافی عرصہ میرا نیوز ایڈیٹر رہا۔ پھر پی ٹی وی ہیڈ کوارٹر میں ہمارا ساتھ رہا اور 1986ء میں جب میں پاکستان ٹیلی ویژن کا ایم ڈی مقرر ہوا تو مصلح الدین ان دنوں ڈائریکٹر نیوز کے عہدے پر فائز تھا۔ میں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں اپنے کام سے اتنی محبت کرنے والے اور اس قدر انتھک محنت کرنے والے لوگ کم دیکھے ہیں۔ وہ اپنے پیشہ کو عبادت کا درجہ دیتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ جب اسے کوئی ایسے احکامات ملتے تھے، جو صحافتی اقدار کے منافی ہوں یا ناجائز ہوں تو وہ بلبلا اٹھتا تھا۔ ایسے احکامات کی تعمیل اس کے لیے شاید زندگی کا سب سے بڑا عذاب تھی۔ لیکن بحیثیت سرکاری ملازم اسے بار بار اس عذاب سے گزرنا پڑتا تھا۔ ظاہر ہے سرکاری پالیسیوں کی تعمیل کے سلسلے میں اسے غیر پیشہ ور افسروں کی بات ماننا پڑتی تھی۔ ایسے موقعوں پر وہ جس کرب اور ذہنی دباؤ کا شکار ہوتا، اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں، جنھوں نے اس کے ساتھ کام کیا ہے۔ بعض اوقات وہ غصہ سے تلملا اٹھتا اور کبھی کبھی جب اس کا ذہن کسی بھی صورت میں حکم کی تعمیل کرنے کو تیار نہ ہوتا وہ دفتری آداب کی پروا کیے بغیر اس کام کو خود چھوڑ دیتا اور کسی اور کے سپرد کر دیتا۔ میں نے ایسی کئی وارداتیں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ اس وقت وہ کسی کی نہ سنتا وہ ایک مختلف مصلح الدین ہوتا۔ آزاد، خود مختار اور اپنے فیصلے خود کرنے والا۔ دو ایک بار اس کو اپنے اس رویہ پر کڑی سزائیں بھی بھگتنا پڑیں۔ ایک دفعہ تو

اس طرح ہوا کہ ایک بھری میٹنگ میں، جس کی صدارت وزارت اطلاعات کے سیکرٹری اور پی ٹی وی کے چیئرمین کر رہے تھے، جو فوجی جنرل بھی تھے۔ اس نے کسی فیصلے سے اختلاف کیا اور اپنی رائے کے حق میں دلائل پیش کیے۔ مگر مارشل لا کے اس دور میں دلائل کی پروا کون کرتا تھا۔ لہٰذا بات بڑھتی گئی اور مصلح الدین کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا، وہ دفتری آداب و لحاظ کو بالائے طاق رکھ کر میٹنگ سے یہ کہتے ہوئے اٹھ کر چلا گیا: "جنرل صاحب سوئیز کے اس طرف ایک ہی مصلح الدین ہے۔" ظاہر ہے دفتری ڈسپلن کی خلاف ورزی کی سزا کے طور پر اسے اس کے عہدے سے ہٹا دیا گیا اور کافی عرصہ وہ بہت پریشانی اور ذہنی کوفت میں گرفتار رہا۔ میں ان دنوں نیف ڈیک کا ایم ڈی تھا۔ اس سہ پہر میٹنگ سے اٹھ کر وہ سیدھا میرے دفتر آیا۔ وہ بے حد مضطرب اور جذباتی ہو رہا تھا۔ میں نے مصلح کو زندگی میں اتنا پریشان کم دیکھا تھا۔ میں اسے سمجھاتا رہا کہ دیکھو جس چیئرمین کی تم بات کر رہے ہو وہ تم کو حقیقتاً بہت پسند کرتا ہے اور تمہاری پیشہ ورانہ مہارت اور ملک و قوم سے وفاداری کا بہت قائل ہے۔ تم کچھ عرصہ کے لیے سب کچھ بھول جاؤ۔ تھوڑے دن بعد سب ٹھیک ہو جائے گا اور ہوا بھی یہی۔ تھوڑے دن بعد سب ٹھیک ہو گیا۔ مگر بظاہر ہنستے مسکراتے، پرسکون مصلح کے دل پر جو کاری زخم لگا وہ شاید مرتے دم تک مندمل نہ ہو سکا۔

مصلح طبیعتاً بڑا بے چین، مضطرب اور ہر دم ہیجانی کیفیت سے دوچار رہنے والا انسان تھا۔ لیکن یہ سب کچھ صرف اس کے پیشے اور اس کے کام کے حوالے سے تھا۔ جب اس کو اپنے پیشہ پر کوئی زد پڑتی نظر آتی تو وہ ایک خون خوار شیرنی کی طرح ہو جاتا، جو اپنے بچوں کی حفاظت کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے۔ جب میں 1986ء میں ٹیلی ویژن کا ایم ڈی مقرر ہوا تو مجھے خبرنامہ سے وابستہ مشکلات کا زیادہ بہتر طور پر علم ہوا۔ تقریباً روزانہ ہی خبرنامہ کے نشر ہونے کے بعد سرکار کے سینئر ارکان میں سے کسی نہ کسی کی طرف سے کوئی اعتراض اور تنقید ضرور آتی، جو مجھے مصلح تک پہنچانا پڑتی۔ وہ ہنس کر کہتا "سر پرواہی نہ کیا کریں۔ یہ ٹی وی سکرین پر اپنے چہرے دیکھنے والے سارے لیڈران قوم اس قابل نہیں ہیں کہ آپ اور میں ان کے ذاتی نوعیت کے اعتراضات اور شکایتوں پر غور کریں۔" اس کا کہنا تھا اگر آپ نے ان کے دباؤ میں آنا شروع کر دیا تو پھر بڑی مشکلات پیدا ہو جائیں گی، اس کی باتوں سے میں تھوڑا سا ہراساں بھی ہوتا مگر جو کچھ میرا ڈائریکٹر نیوز مجھے کہہ سکتا تھا، ظاہر ہے میں وہ حکومت کے

ارباب حل وعقد کے سامنے تو نہیں دہرا سکتا تھا۔ مگر مصلح کی موجودگی میرے لیے ایک بڑا سہارا تھی۔ اس دور میں ہماری قربت بہت زیادہ بڑھ گئی چونکہ حکومت کو سب زیادہ تعلق خبرنامہ سے ہی تھا اور سب سے زیادہ مطالبات خبروں کے حوالے سے ہی سے ہوتے تھے۔ اس لیے دن میں کئی بار ہمیں ایک دوسرے سے گفتگو کرنا ہوتی۔ کبھی کبھی مذاق میں مصلح مجھے کہتا "سر! یہ آپ کا خیال ہے کہ آپ پی ٹی وی کے ایم ڈی ہیں۔ دراصل آپ ایم ڈی پی ٹی وی نیوز ہیں۔"

مصلح کو اپنے پیشہ سے والہانہ محبت تھی۔ وہ صبح سے شام تک انتھک محنت سے کام کرتا۔ وہ بلا کا پروفیشنل تھا۔ اس نے پی ٹی وی کے خبروں کے شعبے میں وہ سب کچھ کیا، جو دنیا کے بڑے بڑے نیٹ ورک پر کیا جاتا ہے۔ جب 1965ء کی جنگ ہوئی تو وہ کیمرہ مین کو لے کر محاذ جنگ پر پہنچ گیا۔ مصر اسرائیل جنگ میں وہ سویز کے کنارے موجود تھا۔ 1971ء میں وہ پوری پوری رات جاگ کر مغربی اور مشرقی پاکستان کے محاذوں سے خبریں حاصل کرتا تھا۔ اوجڑی کیمپ کا سانحہ ہوا تو نڈر اور جرأت مند مصلح الدین، دہکتے شعلوں کے ڈپو میں اتنا اندر تک چلا گیا کہ بڑی مشکل سے اسے واپس لایا گیا۔ مصلح الدین نے دنیا اور خصوصاً پاکستان کی تاریخ کو بہت قریب سے بنتے اور بگڑتے دیکھا۔ عالمی سطح پر اور قومی سطح پر اس نے بے شمار کانفرنسوں میں شرکت کی، جن میں اسلامی سربراہی کانفرسیں، غیر جانبدار ملکوں کی سربراہی کانفرنسیں، سارک ممالک، آر سی ڈی اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجتماعات شامل ہیں۔ قومی تاریخ کے ہر موڑ پر میں نے اسے موجود پایا۔ ایوب خان کا زوال ہو، یحییٰ خان کی ڈکٹیٹر شپ کا خاتمہ ہو، ذوالفقار بھٹو کی فتح ہو، ضیاء الحق کے مارشل لا کا آغاز ہو، بھٹو صاحب کا تختۂ دار کی طرف سفر ہو، بہاولپور کے آسمان پر سی 130 کا دھماکہ ہو، سیلاب ہوں، الیکشن ہو، یادگار عمارتوں، فیکٹریوں، بڑے بند اور عظیم شاہراہوں کی افتتاحی تقریبات ہوں۔ وہ ہر جگہ موجود ہوتا تھا۔ اس لیے نہیں کہ یہ اس کی ڈیوٹی میں شامل تھا، وہ چاہتا تو اپنے جونیئر ساتھیوں پر یہ کام چھوڑ سکتا تھا، مگر ان چیزوں میں اس کی ذاتی دلچسپی تھی۔ میں بھی تاریخ کا طالب علم ہوں اس لیے میری دلچسپیاں بھی اسی قسم کی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ایسے موقعوں پر مجھے اپنا ساتھی بنانا بے حد پسند کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ تقریباً نصف شب کے بعد وہ میرے گھر آیا۔ ظاہر ہے اس بے وقت آمد سے ہم سب پریشان ہو گئے۔ اس نے مجھے کہا "بھابی سے

معافی مانگ لوں گا آپ جلدی سے تیار ہو جائیں۔" "کیوں؟" میں نے دریافت کیا۔

"ہم شاہراہ ریشم کی افتتاحی تقریب میں جا رہے ہیں۔" اس نے کہا۔ "مجھے ابھی ذرا دیر پہلے کتاب پڑھتے پڑھتے خیال آیا کہ اس اتنی بڑی تاریخی تقریب کو خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھنا کیسی بڑی زیادتی ہو گی۔ لہٰذا میں اٹھا' دفتر سے گاڑی منگوائی اور آپ کی طرف آ گیا۔" میں ہنس پڑا اور تیار ہو کر اس کے ساتھ چل دیا۔ صبح کاذب کے وقت ہم ایبٹ آباد پہنچے جہاں پی ٹی وی نیوز کا عملہ ممتاز حمید راؤ کی قیادت میں پہلے سے موجود تھا' جسے صبح سویرے افتتاحی تقرب کے لیے روانہ ہونا۔ یہ مصلح کی سرکاری ذمہ داری کے سبب نہ تھا' بلکہ اس کے اندر جو تاریخ کا طالب علم چھپا بیٹھا تھا' یہ سب وہی کرتا تھا۔

تاریخ کے بعد اس کا پسندیدہ موضوع گفتگو شعر و ادب تھا۔ مصلح کو بے حساب شعر یاد تھے۔ اردو کے بھی اور فارسی کے بھی۔ کبھی کبھی تو حیرت ہوتی تھی کہ ایک آدمی کی یادداشت اتنی اچھی کیسے ہو سکتی ہے کہ پوری پوری رات وہ شعر سناتا رہے اور ذخیرہ ختم نہ ہو۔ اس کی عادت تھی جب ملک سے باہر جاتا تو اکثر پکچر پوسٹ کارڈ اپنے دوستوں کو بھیجتا۔ زیادہ تر ان رنگین پکچر پوسٹ کارڈوں پر وہ اپنی مخصوص خطاطی میں نئے یا پرانے خوبصورت اشعار لکھ کر بھیجتا تھا۔ میرے پاس اس کا بھیجا ہوا ایسا ایک کارڈ شاید اب بھی کہیں ہو' جو اس نے ایک طویل عرصہ ملک سے باہر گزارنے کے بعد مجھے یورپ کے کسی شہر سے بھیجا تھا۔

ان دنوں رسم و رہ شہر نگاراں کیا ہے
قاصدا قیمت گلگشت بہاراں کیا ہے
کوے جاناں ہے کہ مقتل ہے کہ میخانہ ہے
آجکل صورت بربادی یاراں کیا ہے

اپنے عہد کے شاعروں میں فیض' مجید امجد اور ناصر کاظمی اس کے پسندیدہ شاعر تھے اور اساتذہ میں وہ غالب اور اقبال کا عاشق تھا۔ کلاسیکل فارسی کلام اور صوفی پنجابی شاعروں کے اشعار کا بھی اس کے پاس ایسا خزانہ تھا جو کبھی خالی نہیں ہوتا تھا۔ اچھے شعر سننا اور سنانا اس کی سب سے بڑی تفریح تھی۔ یادداشت ایسی تھی کہ کوئی اچھا شعر چاہے کسی بالکل غیر معروف شاعر کا کیوں نہ ہو اسے یاد ہو جاتا تھا۔ مصلح الدین کے بہت ہی قریبی دوست حمید علوی نے

جوان کے ہم شہر اور ہم مکتب تھے' اپنے مضمون میں مصلح کی ابتدائی زندگی کے بارے میں لکھا ہے: ''مصلح کو ادب اور شاعری کی طرف راغب کرنے کا سہرا مولانا عزیزالدین احمد عزامی کے سر ہے' جو جالندھر میں مصلح کے اردو اور فارسی کے استاد تھے۔ مصلح عزامی صاحب کا سب سے چہیتا شاگرد تھا۔ انہوں نے نہ صرف مصلح میں شعر شناسائی کا ذوق پیدا کیا' بلکہ اس کو خطاطی کی تربیت بھی دی۔'' مولانا عزامی خود بھی فارسی کے شاعر تھے وہ علامہ عبدالقادر گرامی کے شاگرد تھے اور علامہ اقبال کے قریبی دوستوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے مصلح نے اپنے استاد کے فارسی کلام کی بیاض کی اشاعت انہی کے ہاتھ سے مرقوم اشعار کی صورت میں کرائی تھی۔ مجھے بھی اس کتاب کی ایک کاپی اس نے اپنے ہاتھ سے کچھ لکھ کر پیش کی تھی۔ میں یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ مصلح اور علامہ عزامی کی طرز تحریر تقریباً بالکل ایک جیسی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے کس محنت سے اپنے استاد گرامی سے یہ تربیت لی تھی۔

فارسی شعراء میں شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی مصلح کے سب سے پسندیدہ شاعر تھے۔ دراصل اس کا نام انہی کے نام پر رکھا گیا تھا۔ مصلح کہا کرتا تھا کہ جب میں پیدا ہوا ان دنوں میرے والد گلستان سعدی کا مطالعہ کر رہے تھے۔ لہٰذا انہوں نے میرا نام مصلح الدین قرار دیا۔ پھر اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے وہ یہ بھی کہتا ''میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ گلستان سعدی ہی ان دنوں والد صاحب کے زیر مطالعہ تھی۔ اگر وہ گرنتھ صاحب پڑھ رہے ہوتے تو میں کیا کر سکتا تھا۔''

جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا اچھے شعر سننا اور سنانا مصلح کی خاص عادت تھی۔ جب کبھی موڈ میں ہوتا وہ نئے پرانے شاعروں کے ایسے ایسے شعر سناتا کہ طبیعت خوش ہو جاتی۔ سردیوں کی دھوپ میں' گرمیوں کی شاموں میں اسلام آباد کی سڑکوں پر ہم گھنٹوں ایک ساتھ ٹہلتے اور وہ چن چن کر ایسے شاعروں کے اشعار سناتا رہتا جو میرے بھی پسندیدہ تھے۔ مصطفیٰ زیدی' فیض احمد فیض' ناصر کاظمی' منیر نیازی' احمد فراز' پروین شاکر' افتخار عارف اور دوسرے بہت سے شعراء۔ افتخار عارف کو مصلح سے اس کے کراچی کے قیام کے دوران بڑی قربت ہو گئی تھی۔ مصلح 1971ء کی جنگ کے بعد ایک خصوصی پروگرام کی نگرانی کے لیے کراچی ٹیلی ویژن مرکز پر متعین ہو گیا تھا۔ حالات حاضرہ کے اس ہفتہ وار پروگرام کے

میزبان فرہاد زیدی تھے، جو مصلح کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ کراچی میں بھی شعر و سخن کی سرگرمیاں اسی طرح جاری رہیں۔ افتخار عارف نے مجھے ایک دلچسپ قصہ سنایا کہ ایک روز وہ مصلح اور فرہاد زیدی، طارق روڈ پر کیفے نگارو میں نہاری کھا رہے تھے۔ تینوں میں یہ طے پایا کہ مرغے کے لفظ کو کسی مشہور شعر میں اس طرح فٹ کیا جائے کہ شعر کی کیفیت میں بھی فرق نہ آئے اور مزہ بھی دوبالا ہو جائے۔ سب سے بہتر طور پر "مرغے" سے لفظ تبدیل کرنے والا، وہ مقابلہ جیت جائے گا۔ تینوں نے تبدیل شدہ شعر سنائے اور مقابلہ مصلح نے جیت لیا۔ اس نے مرغے کا استعمال اس طرح کیا تھا۔

آخر شب دید کے قابل تھی "مرغے" کی تڑپ
صبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

حاضر جوابی اور فقرہ بازی مصلح الدین پر ختم تھی۔ ہر موضوع پر اس کا ذہن اس قدر رواں تھا کہ کوئی نہ کوئی ایسا فقرہ ضرور ہو جاتا جو شوخی، شرارت اور شگفتگی سے پر ہوتا۔ انگریزی زبان میں ایک اصطلاح استعمال کی جاتی ہے One Liner۔ اگر ہم اردو میں اس کا ترجمہ "یک سطری فقرہ" کریں تو معلوم نہیں صحیح سمجھا جائے گا یا نہیں۔ بہرحال کوئی بھی نام حس مزاح کی اس صنف کو آپ دے لیں، جو بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ مصلح اس کا ماہر تھا۔ اس کو لمبی لمبی حکایتیں سنانے یا عام طور پر بیان کیے جانے والے لطیفوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا تو اپنا فقرہ ہوتا تھا جو اس کے ذہن رسا کی تخلیق ہوتا تھا اور اس وقت اور موضوع گفتگو کے تعلق سے ایسا ہوتا تھا کہ اٹھائے نہ اٹھے۔ پھر ایک بات یہ کہ جب اسے فقرہ سوجھ جاتا تھا تو اس کو روکنا اس کے بس کی بات نہ تھی وہ بلا لحاظ رتبہ اور عمر فقرہ ضرور کہتا تھا۔ لیکن یہ یاد رہے کہ اس کی زبان سے کبھی کسی نے کوئی فحش یا اخلاقیات سے گری ہوئی بات نہیں سنی۔ اس کے فقرے ہمیشہ برجستہ ہوتے اور ذہانت اور لطافت ان کا خاصہ ہوتی۔ اب تو بہت عرصہ بیت گیا، مگر مجھے ایسے کچھ واقعات یاد ہیں، جہاں اس کا ادا کیا ہوا فقرہ ابھی تک یاد آتا ہے تو ہونٹوں پر خود بخود مسکراہٹ آ جاتی ہے۔ شاید یہ چند نمونے ایسے قارئین کے لیے جو مصلح سے واقف نہیں تھے، میری بات کی وضاحت کر سکیں۔

یہ ٹیلی ویژن کے ابتدائی دور کی بات ہے، جب ٹیلی ویژن پروموٹرز کمپنی نئی نئی پاکستان ٹیلی ویژن کارپوریشن میں تبدیل ہوئی تھی اور اس کے پہلے مینجنگ ڈائریکٹر کے طور پر اے

ایم ایس موسیٰ احمد کا تقرر ہوا تھا' جن کا تعلق پولیس سروس سے تھا۔ وہ اس وقت کے وزیر اطلاعات و نشریات خواجہ شہاب الدین کے داماد تھے۔ مصلح نے محکمہ کے پہلے مینجنگ ڈائریکٹر کے لیے IGTV انسپکٹر جنرل ٹیلی ویژن کا نام تجویز کیا تھا۔

اسی زمانے کا قصہ ہے کہ ایک میٹنگ میں بڑی لے دے ہوئی کہ صدر ایوب کی ٹی وی کوریج مناسب طریقے سے نہیں ہو رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بالکل ابتدائی دور تھا۔ بے سروسامانی کا عالم تھا۔ کیمروں' لائٹوں' ریکارڈنگ مشینوں اور دیگر ضروری آلات اور وسائل کی کمی تھی۔ اس میٹنگ کی صدارت ایم ڈی کر رہے تھے اور غالباً انہیں اوپر سے تازہ تازہ ڈانٹ پلائی گئی تھی۔ لہٰذا ان کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے جونیئر سٹاف کی سرزنش کرتے ہوئے خفگی سے کہا: "یہ سب کہنے کی باتیں ہیں کہ ساز و سامان کی کمی ہے اور آلات اور مشینیں کم ہیں۔ اگر حب الوطنی کا جذبہ ہو اور کام کرنے کی لگن ہو تو سب کچھ کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے میں صدر صاحب کی ناراضگی کو بالکل جائز سمجھتا ہوں۔" بڑی میز پر دور کونے میں بیٹھے ہوئے مصلح الدین نے جو ان دنوں بہت جونیئر افسر تھا' اپنے مخصوص انداز میں ایم ڈی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "سر آپ کو اور صدر صاحب کو بھی یہ معلوم ہونا چاہئے کہ فلم کی شوٹنگ ایمان کی روشنی میں نہیں کی جاسکتی۔"

ایک بار جنرل مینجر کانفرنس کے لنچ بریک میں ٹی وی کے ایک افسر' جو اپنی شیخی اور خود نمائی کے لیے مشہور سمجھے جاتے تھے' بار بار اپنے نائب سے ایسے کام لے رہے تھے جو عام اصولوں کے نقطۂ نظر سے نامناسب تھے۔ مثلاً وہ کھانا کھاتے ہوئے اس اسسٹنٹ سے با آواز بلند کہتے: "بھئی ذرا میری پلیٹ میں سلاد تو اور ڈال کر لے آؤ یا۔ بھئی زحمت تو ہوگی ایک گرم روٹی پکڑ لو یا بھئی دیکھنا جگ میں پانی کچھ ٹھنڈا ہے۔ یہ میرے گلاس کا پانی تو گرم ہو چکا وغیرہ۔ ظاہر ہے وہ بے چارہ شریف انسان ہر بار اپنے افسر کے حکم کی بجا آوری کے لیے اٹھتا۔ دور سجے ہوئے بوفے لنچ کی میز پر آجاتا اور مطلوبہ چیز لے جا کر ان کی خدمت میں پیش کر دیتا۔ جب کھانا ختم ہوا تو افسر اعلیٰ نے اپنے اسسٹنٹ سے کہا: "بھئی ذرا ایک قاب میں میرے لیے شاہی ٹکڑے لے آئیں۔ میں ابھی غسل خانہ سے ہاتھ دھو کر آتا ہوں۔" اس پر مصلح سے نہ رہا گیا اس نے بڑے مؤدب انداز میں افسر اعلیٰ سے جو خود اس کے بھی افسر تھے کہا: "سر آپ کیوں زحمت کرتے ہیں اپنے ہاتھ بھی اپنے اسسٹنٹ کو دے دیجئے وہ دھو کر لا دے گا۔"

جس زمانے میں مصلح الدین ڈائریکٹر آف نیوز تھا۔ اُسے ہر روز ہی وزارت اطلاعات میں میٹنگ میں شرکت کرنا ہوتی تھی۔ جسے Media Cheaf میٹنگ کہا جاتا تھا، مگر مصلح نے ہمیشہ ان میٹنگوں کو Media Thives کے نام ہی سے پکارا۔ میڈیا چیف کی میٹنگوں میں زیادہ وقت خبرنامہ پر گفتگو ہوا کرتی تھی۔ ظاہر ہے مصلح ہی تختہ مشق بنتا اور طرح طرح کی بے جا تنقید، ناجائز شکایتوں اور مضحکہ خیز مشوروں کے جواب دینا اس کی ذمہ داری تھی۔ کبھی نرم اور شیریں لہجہ میں، کبھی تند و تیز انداز میں۔ اب مجھے صحیح یاد نہیں کہنے والا کون تھا، مگر مشورہ یہ دیا گیا کہ: "خبرنامہ میں Entertanmint Values کا ہونا بھی ضروری ہے اور اس طرف بھی توجہ دینی چاہئے۔" مصلح نے ترت جواب دیا: "یہ مشکل حل ہو سکتی ہے آپ مجھے اجازت دیں کہ میں ملکہ ترنم نور جہاں سے خبریں پڑھنے کی درخواست کروں۔"

پیپلز پارٹی کی پہلی حکومت کی بڑی شان و شکوہ تھی۔ بھٹو صاحب جیسا سجیلہ وزیر اعظم اور ان کے خوش شکل، خوش لباس وزراء کرام ہر محفل میں ان دنوں موضوع گفتگو بنے رہتے تھے۔ ایک ایسی ہی محفل میں کسی نے کہا: "بھئی یہ پیپلز پارٹی کا مسئلہ کیا ہے آخر۔ مولانا کوثر نیازی کچھ کہتے ہیں اور حفیظ پیرزادہ کچھ کہتے ہیں۔" مصلح نے زیر لب تبسم کے ساتھ کہا: "کوئی مسئلہ نہیں، صرف اردو اور انگریزی میڈیم وزیروں کا مسئلہ ہے۔"

مصلح الدین کے ایک اور دوست خالد حسن نے مصلح پر تعزیتی کالم لکھتے ہوئے اسی قسم کا ایک اور قصہ درج کیا تھا۔ خالد حسن ان دنوں غالباً بھٹو صاحب کے پریس سیکرٹری تھے۔ یہ 1973ء کی بات ہے۔ افواہ اڑی کہ بھٹو حکومت میں پھوٹ پڑ گئی ہے اور پیپلز پارٹی دو گروپوں میں بٹ گئی ہے۔ مصلح سے جب کسی نے اس خبر کی تصدیق چاہی تو اس نے جواب دیا: "جی یہ بالکل صحیح خبر ہے، پیپلز پارٹی دو گروپوں میں بٹ گئی ہے۔ ایک ٹویوٹا مارک ون گروپ اور دوسرا ٹویوٹا مارک ٹو گروپ۔"

مصلح کے ایک اور بے حد قریبی دوست حمید علوی نے، جن کا تذکرہ اوپر بھی کہیں آچکا ہے، اس آخری شام کا ذکر اپنے مضمون میں کیا تھا۔ جو مصلح الدین نے ان کے ساتھ گزاری۔ اپنی زندگی کی آخری شام 17 ستمبر مصلح اور ان کی بیگم نویدہ یونہی گپ شپ کے لیے ہمارے گھر آئے۔ میں نے مصلح سے دریافت کیا "How PTV is doing" (پی ٹی وی کیسا چل رہا ہے) بلا توقف مصلح کا جواب آیا It has been hijaked by the.

(novice you will soon hear the sound of crash.(اس کو اناڑیوں نے اغوا کرلیا ہے' بہت جلد آپ دھماکے کی آواز سنیں گے)۔

اوپر مصلح کی موت پر لکھے کالموں سے کچھ حوالے میں نے درج کیے تو مجھے ایک اور کالم کا خیال آیا جس کا عنوان تھا "مصلح الدین کے لیے ایک غیر جذباتی کالم۔" یہ منو بھائی کی تحریر ہے جو ان دنوں روزنامہ "مساوات" سے منسلک تھے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اس کالم سے چند قتباسات اپنی اس تحریر میں شامل کرلوں۔ منو بھائی نے لکھا:

"جس روز مصلح الدین فوت ہوئے موسم میں کوئی تبدیلی نہیں آئی' سورج اپنے مقررہ وقت پر غروب ہوا۔

لوگوں کے معمولات میں کوئی فرق نہیں پڑا
جس روز مصلح الدین فوت ہوئے
حالات وواقعات پر مختصر ترین تبصروں
خیال افروز شعروں' شگفتہ باتوں
اور بے شمار دلچسپ یادوں کا ایک مجموعہ کھو گیا
ایک دل نواز مسکراہٹ غائب ہوگئی
اور ایک حاضر دماغی گم ہوگئی
مصلح الدین نے کہا تھا
تم ہر کسی کے مرنے پر جذباتی ہو جاتے ہو
میں نے ان سے وعدہ کیا تھا
آپ کی موت تک زندہ رہا تو
ایک غیر جذباتی کالم لکھوں گا
جس روز مصلح الدین فوت ہوئے
میں نے یہ سوچتے سوچتے
صبح کے ساڑھے چار بجا دیئے
کہ غیر جذباتی کالم کیا ہوتا ہے
اور پھر سو گیا

مجھے اپنے آپ پر یا اپنی تحریر پر منو بھائی کی طرح اس قدر اختیار نہیں ہے کہ مصلح کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے یا لکھتے ہوئے غیر جذباتی رہ سکوں۔ ہم دونوں زندگی میں بڑی دیر بعد ملے، مگر پھر بھی میں اسے اپنے بہت قریبی دوستوں میں شمار کرتا ہوں۔ میرے نزدیک دوستی اور محبت نیند کی طرح ہوتی ہے۔ نیند کی ایک لمبائی ہوتی ہے اور ایک گہرائی۔ کبھی کبھی آپ بہت دیر تک سوتے ہیں، مگر اگر نیند میں گہرائی نہ ہو تو بیداری کے بعد تھکن اور واماندگی محسوس کرتے ہیں اور کبھی کبھی بڑے مختصر دورانیہ کی گہری نیند آپ کو ہشاش بشاش کر دیتی ہے۔ یہی حال دوستی کا ہے۔ بعض اوقات برس ہا برس کی قربت کے باوجود آپ کی دوستی میں وہ تپش نہیں ہوتی، جو کبھی کبھی کسی کے ساتھ ایک بہت ہی مختصر وقت کی رفاقت سے پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی پیمانے پر پرکھتے ہوئے میں مصلح اور اپنی دوستی کو ناپتا ہوں۔ مجھے معلوم نہیں مصلح کیا سوچتا تھا۔ اس کا حلقہ احباب بے حد وسیع تھا۔ اس کے جاننے والوں، اس کے ساتھ کام کرنے والوں، اس کے ملاقاتیوں اور اس کے دوستوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ میں اگر شمار کرنا بھی چاہوں تو نہیں کر سکتا۔ چونکہ بہت سے شاید ایسے بھی ہوں گے، جنہیں میں نے کبھی دیکھا نہیں۔ جنہیں میں جانتا نہیں، پھر میں کس طرح کوئی فیصلہ صادر کر سکتا ہوں۔ میں تو ان میں بھی شامل نہیں ہوں جو مصلح الدین کو "پپو" کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ لیکن مجھے اوروں سے کیا، مجھے مصلح کی رائے سے بھی کوئی غرض نہیں۔ محبت اور دوستی تو بے غرض ہوتے ہیں۔ میں صرف اتنا یاد رکھنا چاہتا ہوں کہ وہ میرا دوست تھا۔ لاہور میں ہماری ملاقات ہوئی، ہم وہاں ساتھ رہے۔ ہم نے کئی بار اکٹھے مختلف شہروں اور علاقوں کے سفر کیے اور پھر اسلام آباد میں ہم نے بڑا طویل عرصہ ایک ساتھ گزارا۔ اس شہر کے چپہ چپہ سے اس کی یادیں وابستہ ہیں۔

وہ مجھے یاد آتا ہے۔ کبھی واقعات کے حوالوں سے، کبھی مقامات کے حوالوں سے، کبھی موسموں کے حوالوں سے، کبھی اپنی ذاتی پریشانیوں اور مسئلوں کے حوالوں سے۔ وہ مجھے یاد آتا ہے جب مون سون کے موسموں میں مارگلہ کی سرسبز پہاڑیاں کالے کالے بادلوں کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں چھپ جاتی ہیں۔ جب خزاں کی نرم گرم دھوپ میں شفاف ہموار فٹ پاتھ زرد پتوں سے ڈھک جاتے ہیں۔ جب مہاوٹوں کی تیز بارشوں میں گھن گرج کی آوازوں کے ساتھ بجلی کوندتی ہے۔ جب گرمیوں کے اندھیرے میں نیلے آسمان پر ان گنت

ستارے چمکتے ہیں۔ جب سردیوں کی ٹھنڈی طویل راتوں میں کوہ مری کی برف میں بھیگی یخ ہوائیں شہر کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہیں۔ وہ مجھے یاد آتا ہے جب میں زیرو پوائنٹ کے پاس چیڑ کے درختوں کے اس جھنڈ کو دیکھتا ہوں جہاں سے کھڑے ہو کر ہم دونوں نے جنرل ضیاء الحق کے جنازے کا ماتمی جلوس دیکھا تھا۔ جب میں پرانی کتابوں کی اس دکان پر جاتا ہوں' جہاں اکثر وہ مجھے بغیر کسی اپائمنٹمنٹ کے مل جاتا تھا۔ جب اسلام آباد کی طویل و عریض شاہراہوں پر پیدل چلتے چلتے میں کسی ایسے موڑ پر پہنچ جاتا ہوں' جہاں سے کئی بار ہم نے ساتھ چہل قدمی کرنے کے بعد ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا تھا۔

وہ مجھے یاد آتا ہے جب ملک میں یا دنیا میں کوئی بڑا واقعہ ہوتا ہے۔ جب میں پاکستان کے کسی سربراہ کے بین الاقوامی دورے کی کوریج کرتے ہوئے' ٹیلی ویژن سکرین پر کسی اور کی تصویر دیکھتا ہوں۔ جب کوئی اچھا شعر سنتا ہوں' جب کوئی خوبصورت لباس دیکھتا ہوں۔ وہ مجھے یاد آتا ہے جب میں کسی ذاتی پریشانی کا شکار ہوتا ہوں' جب کسی کاروباری یا سرکاری مسئلہ سے دوچار ہوتا ہوں۔ اب کوئی نہیں ہے' جو مجھ سے کہے ''سر پرواہی نہ کیا کریں۔''

وہ کہاں کہاں اور کیسے یاد آتا ہے' میرے لیے یہ بیان کرنا آسان نہیں ہے۔ کبھی کبھی مجھے ایسا گمان بھی ہوتا ہے جیسے کسی روز مجھے اس کے مخصوص رسم الخط میں لکھا ہوا' چمکدار نیلے' عنابی اور گہرے نارنجی رنگوں سے مزین ایک پکچر پوسٹ کارڈ ملے گا۔

''آج کل صورت بربادی یاراں کیا ہے''

یہ سب یادیں مصلح کی ذات سے وابستہ ہیں۔ تب ہی تو میں نے اس کی وفات پر ہونے والے ریفرنس میں اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا تھا: ''زندہ تو سب ہوتے ہیں لیکن کچھ لوگ بہت زیادہ زندہ ہوتے ہیں۔'' مصلح اتنا زیادہ زندہ تھا کہ مرنے کے بعد بھی زندگی سے اس کے رشتے ٹوٹ نہ سکے۔ تب ہی تو اس کے دوستوں کو اس کے چاہنے والوں کو اپنے چہار اطراف اس کی یادوں کے عکس آج بھی منڈلاتے نظر آتے ہیں۔ ناصر کاظمی نے کہا تھا:

گلی گلی تری یاد بچھی ہے پیارے رستہ دیکھ کے چل

ناصر کاظمی اس کے پسندیدہ شاعروں میں سے تھا۔ لاہور میں ناصر کاظمی کی موت پر مصلح نے اس کی شاعری اور شخصیت کے حوالے سے ٹیلی ویژن کے لیے ایک بڑا اچھوتا سا پروگرام بھی پروڈیوس کیا تھا۔ اب جب وہ دونوں مر چکے ہیں تو مجھے لگتا ہے ان دونوں میں

بہت قدریں مشترک تھیں۔ وہ دونوں تنہا لوگ تھے۔ فطرت سے محبت کرنے والے' ادب اور شاعری کا اعلیٰ ذوق رکھنے والے۔ خود میں گم اپنے اپنے آدرش کے طلسم میں گرفتار' بلا تفریق روز و شب کوچہ گردی کرنے والے۔ ان دونوں کے جسموں میں مضطرب روحیں تھیں۔ وہ کہیں ٹکتے نہ تھے' کبھی یہاں کبھی وہاں۔

مصلح کا تو یہ خاص انداز تھا۔ کسی تقریب' کسی دعوت میں آتا' اپنی موجودگی کا احساس اہل محفل کو دلاتا اور پھر بغیر کسی سے کچھ کہے سنے خاموشی سے نکل جاتا۔ جب میرے ساتھ وہ ایسا کرتا تو مجھے اس حرکت پر بہت غصہ آتا اور جب میں اور خاص طور پر میری بیوی اپنی خفگی کا اظہار کرتے تو وہ ایک خاص انداز سے ہاتھ جوڑ کر' گردن کو ذرا بائیں جانب جھکا کر مؤدب کھڑا ہو جاتا۔ یہ اس کا معافی مانگنے کا طریقہ تھا۔ ہم سمجھتے بس آج کے بعد کم از کم ہمارے ساتھ وہ ایسا نہیں کرے گا مگر یہ ہماری خام خیالی تھی۔ یہ سب تو اس کے کردار اس کی ذات کا حصہ تھا' جو وہ زندگی میں بار بار دہراتا رہا۔ ایک دن میں نے اس سے کہا تھا: "مصلح مجھے کبھی کبھی تمہارے انداز و اطوار دیکھ کر ناصر کاظمی کا یہ شعر یاد آتا ہے:

گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا کدھر گیا وہ
عجب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیران کر گیا وہ

حاضر جواب مصلح نے اپنی دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ فوراً ہی جواب دیا "سر" اس وقت کی فکر کیجئے جب آپ کو میرے حوالے سے ناصر کاظمی کا یہ شعر یاد آئے گا:

وہ ہجر کی رات کا ستارہ وہ ہم نفس ہم سخن ہمارا
سدا رہے اس کا نام پیارا سنا ہے کل رات مر گیا وہ

سلیم احمد

سلیم احمد سے میرا تعلق اور رشتہ کچھ اور طرح کا ہے۔ میں حلقۂ نیاز مندان سلیم احمد کا رکن نہیں تھا' میری ان کے ساتھ ادب' شاعری' مذہب' سیاست اور فلسفہ کے موضوعات پر بحثیں بھی نہیں ہوتی تھیں۔ میں لکھنے والوں کے اس قبیلہ سے بھی تعلق نہیں رکھتا تھا' جو اپنی نثری یا شعری تخلیقات بغرض اصلاح سلیم احمد کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔ میں کسی ادبی انجمن یا ادبی گروہ کا ممبر بھی نہیں تھا کہ ادبی معرکوں میں سلیم احمد کے طرف داروں یا ان کے مخالفین میں شمار ہوتا ہوں۔ میں سلیم احمد سے دوستی کا دعویدار بھی نہیں تھا۔ چونکہ وہ عمر میں مجھ سے بڑے تھے اور میرٹھ میں میرے بڑے بھائی کے کلاس فیلو رہ چکے تھے' اسی لیے میں نے کہا کہ سلیم احمد سے میرا تعلق اور رشتہ کچھ اور طرح کا تھا۔ ہماری جان پہچان' شناسائی' قربت اور محبت کم و بیش پچیس' چھبیس برسوں پر محیط ہے۔ ان کے شاگردوں' دوستوں' دفتری ساتھیوں اور نیاز مندوں کی طرح میں نے کبھی انہیں سلیم بھائی کہہ کر نہیں پکارا' حالانکہ وہ جگت سلیم بھائی تھے۔ میں نے انہیں ہمیشہ سلیم احمد یا سلیم کہہ کر ہی مخاطب کیا۔ ریڈیو پاکستان کی ملازمت اختیار کرنے سے پہلے میں ان سے بالکل واقف نہیں تھا۔ میری اور ان کی پہلی ملاقات 1955ء میں ہوئی' جب میں ریڈیو پاکستان کراچی میں پروگرام پروڈیوسر کی حیثیت سے ملازم ہوا۔ یہ بات میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ پہلی ہی ملاقات میں' میں نے ان کو اور انہوں نے مجھے پسند کیا اور پھر رفتہ رفتہ یہ پسندیدگی ایک اپنائیت اور پھر محبت میں تبدیل ہوگئی' مگر ان کی محبت میں شفقت کا پہلو بھی تھا۔ اگر میں کہوں کہ انہوں نے ہمیشہ مجھے شمیم احمد کی طرح اپنا چھوٹا بھائی تصور کیا تو شاید غلط نہ ہوگا۔ ویسے ہمارا دفتری رشتہ اس طرح کا رہا کہ ڈراما سیکشن کا انچارج ہونے کے حوالے سے میں ان

کا افسر تھا۔ ان کی حاضری کا رجسٹر' ان کی چھٹی کی درخواست' ان کی سالانہ کارکردگی کی رپورٹس' میری ذمہ داریوں میں شامل تھیں۔ لیکن ہمارے تعلقات اس طرح کے رہے کہ جب وہ آتے میں احتراماً کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو جاتا۔ اگر دو دو' تین تین روز وہ دفتر کا پھیرا نہ لگاتے تو میں کبھی ان سے غیر حاضری کی جواب طلبی نہ کرتا' وہ اگر کبھی مجھ سے کسی کام کے لیے کہتے تو میرے نزدیک ان کے کہے کی اہمیت ریڈیو کے بڑے سے بڑے افسر کے حکم سے زیادہ ہوتی۔ محبت' انسیت اور عقیدت کے علاوہ ان کی شخصیت کا ایک خاص قسم کا رعب بھی مجھ پر طاری رہتا تھا اور یہ رعب صرف مجھ پر ہی نہیں تھا' ان کے ارد گرد کے سارے لوگ ان سے مرعوب تھے۔ خواہ بڑے بڑے ادیب اور شاعر ہوں' ان کے پرانے اور نئے احباب ہوں' محکمہ کے افسران کرام ہوں۔ وہ کوئی بہت لحیم شحیم' بلند قامت' پر شکوہ قسم کے آدمی نہیں تھے کہ ان کے سامنے جا کر انسان احساس کمتری کا شکار ہو جائے' وہ کسی بڑے عہدے پر فائز نہیں تھے' کوئی رئیس اور مال دار شخص بھی نہیں تھے' حسن و جمال کا مرقع بھی نہیں تھے کہ ان کے سامنے دوسروں کی شخصیت ماند پڑ جائے' یہ صرف اور صرف ان کی علمیت اور تخلیقی صلاحیتوں کا رعب تھا۔

لوگ سلیم احمد کے علم و فضل کے معترف تھے۔ ویسے دیکھا جائے تو سلیم احمد کی رسمی تعلیم کچھ بہت زیادہ نہیں تھی۔ وہ تقسیم ہند کے وقت میرٹھ میں اپنی کالج کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر پاکستان آ گئے تھے' مگر دانشوری اور علمیت کالج اور یونیورسٹی کی ڈگریوں کی محتاج نہیں ہوتی۔ بلاشبہ سلیم احمد جتنے پڑھے لکھے آدمی تھے' اتنے پڑھے لکھے لوگ اس دور میں کم ہی ملیں گے۔ ان کے رعب علم کا ذکر چل نکلا ہے تو اپنے اور ان کے تعلقات کے موضوع کی جانب پلٹنے سے قبل اردو کے نامور محقق اور نقاد فتح محمد ملک کے ایک مضمون سے چھوٹا سا اقتباس پیش کرتا چلوں' جس سے اوپر بیان کیے گئے میرے بیان کی وضاحت ہو جائے گی۔ فتح محمد ملک نے لکھا ہے کہ: ''اسلام آباد ہوٹل کے ایک کمرے میں احمد ندیم قاسمی کے پاس ادیبوں کا ہجوم لگا تھا۔ جائے تنگ و مرداں بسیار کی صورت درپیش تھی۔ لوگ آتے اور جہاں جگہ پاتے ٹک جاتے' سلیم احمد تشریف لائے تو میں نے بمشکل انہیں اپنی کرسی پر بٹھایا اور خود ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔ سلیم احمد کے رخصت ہونے پر' پریشان خٹک میرے اس طرز عمل پر معترض ہوئے' کہنے لگے ''میں ایک یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہوں' صدیق سالک

صدر مملکت کے پریس سیکرٹری ہیں، ہم دونوں خوبصورت، لمبے تڑنگے جوان ہیں، ہم نے تھری پیس سوٹ پہن رکھے ہیں، جب ہم داخل ہوئے تو ملک صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے، لیکن جب میلی سی شیروانی میں ملبوس ایک شخص آیا تو انہوں نے بصد اصرار اسے اپنی کرسی پیش کر دی۔ میں اور سالک پلنگ کی پائنتی پر سکڑتے رہے۔ میں اپنی اور سالک کی طرف سے اس رویہ پر احتجاج کرتا ہوں۔" اس پر احمد ندیم قاسمی نے حیرت کے ساتھ پوچھا "پریشان صاحب! آپ واقعی اس اجلی اور منور شخصیت سے متعارف نہیں، یہ سلیم احمد تھے۔" "اچھا تب ہی آپ بھی ہم سب کو بھول کر صرف انہی کے ساتھ باتوں میں محو ہو گئے۔" پریشان خٹک کی تشفی ہو گئی۔ یہ تھا سلیم احمد کی شخصیت کا سحر اور ان کی علمیت کا رعب۔

میرا سلیم احمد کا جو رشتہ تھا اس کے دو پہلو تھے۔ ایک پیشہ ورانہ اور دوسرا ذاتی۔ مجھے ڈرامے سے دیوانگی کی حد تک عشق تھا اور صرف یہ ڈرامے کی محبت ہی تھی، جس کی بنا پر میں نے سی ایس پی افسر بننے پر پروگرام پروڈیوسر ہونے کو ترجیح دی۔ خوش قسمتی سے ریڈیو کی دنیا میں مجھے ایسے لائق، فائق اور خوبصورت دل و دماغ رکھنے والے لوگ ملے کہ اپنے فیصلہ پر مجھے ساری زندگی کوئی پچھتاوا نہیں ہوا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے جو نام اور شہرت بہت ہی کم عمری میں اپنی ملازمت کے ابتدائی تین چار برسوں میں مل گئی، وہ میرے کالج کے دوسرے ساتھیوں کو اپنے کیریئر کے اختتام تک حاصل نہ ہو سکی۔ ریڈیو پاکستان کا ایک پروڈیوسر ہونے کی حیثیت سے میری جان پہچان میل ملاقات اس دور کی عظیم ادبی، سماجی، دینی، سیاسی اور سرکاری شخصیتوں سے ایسی تھی، جس کے لیے بڑے بڑے امیر کبیر اور حکومت کے اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز افسران ترستے تھے، چونکہ ڈرامے کے شعبے کے علاوہ میں آؤٹ سائیڈ براڈکاسٹ کے پروگرام بھی پروڈیوس کرتا تھا لہٰذا سارے سربراہان حکومت، وزیر، سفیر اور اعلیٰ عہدیدار سب سے واقفیت تھی اور ان میں سے اکثر مجھے میرا نام لے کر پکارتے تھے۔

سوچتا ہوں تو اللہ تعالیٰ کے اس فضل سے آنکھیں بھر آتی ہیں کہ اس نے زندگی میں کس قدر عزت اور بے پناہ شہرت عطا کی۔ اگرچہ مالی نقطۂ نظر سے میری ملازمت اور پیشہ کسی صورت بھی منافع بخش نہیں تھا، مگر جب کسی بازار میں، کسی میلہ میں، کسی یونیورسٹی یا کالج میں، کسی استقبالیہ اور شادی کی تقریب میں، دنیا کے کسی ملک کے ایئرپورٹ پر کسی کو سرگوشیوں میں، کسی کو بلند آواز میں اپنا نام لیتے سنتا ہوں تو وہ ساری مالی مشکلات جو اس

ملازمت کے دوران پیش آتی رہیں، بالکل حقیر اور بے معنی نظر آتی ہیں۔ زندگی کی یہ اتنی بڑی دولت صرف اپنے پیشہ سے محبت اور انتھک محنت اور لگن کے ساتھ کام کرنے کے سبب میسر آئی۔ ڈرامے سے والہانہ محبت ہی تھی، جس نے سلیم احمد کے ساتھ پیشہ ورانہ رشتے کو مستحکم کیا۔ میں نے ریڈیو پاکستان کراچی سے وابستگی کے زمانے میں سلیم احمد کے لکھے ہوئے ان گنت پروگرام پروڈیوس کیے، جن میں فیچر، غنائیے، تمثیلچے اور خاکے شامل تھے، لیکن میرا ان کا ساتھ، جس نے اس دور میں ہم دونوں کی شہرت اور مقبولیت کو بام عروج پر پہنچایا، وہ سٹوڈیو نمبر 9 میں نشر ہونے والے ڈرامے تھے۔

سٹوڈیو نمبر 9 ایک ہفتہ وار پروگرام کا عنوان تھا، جس میں ہر اتوار کی رات نو بجے ایک گھنٹے کا اردو ڈرامہ پیش کیا جاتا تھا۔ ڈراموں کا یہ سلسلہ ریڈیو کے ایک بہت ہی باصلاحیت اور قابل پروڈیوسر شمس الدین بٹ نے شروع کیا تھا۔ 55-1954ء میں شمس الدین بٹ امریکہ سے براڈکاسٹنگ کے مضمون میں ایم اے کی ڈگری لے کر آئے تھے، وہ برصغیر کے پہلے براڈکاسٹر تھے، جس نے یہ ڈگری حاصل کی تھی۔ میں نے جب ریڈیو کی ملازمت شروع کی تو بٹ صاحب ان دنوں ڈرامہ سیکشن کے انچارج تھے اور میرا خیال ہے کہ میری سب سے بڑی خوش نصیبی یہ ہوئی کہ مجھے انہی کے سیکشن میں لگایا گیا۔ اس طرح میں انہیں اپنا استاد سمجھتا ہوں۔ میں نے ریڈیو پروڈکشن میں تکنیک کے حوالے سے بہت کچھ انہی سے سیکھا۔ ڈرامہ سیکشن ریڈیو اسٹیشن کا اہم ترین شعبہ سمجھا جاتا تھا۔ دراصل تفریحی پروگراموں کا سارا دارومدار موسیقی اور ڈرامے کے شعبوں پر ہوتا تھا، اسی لیے بہترین تخلیقی ذہن رکھنے والے اور زیادہ باصلاحیت پروڈیوسروں اور پروگرام لکھنے والوں اور پیش کرنے والوں کو ان دو شعبوں میں بھیجنے پر ترجیح دی جاتی تھی۔ کراچی ریڈیو کے ڈرامہ اور فیچر پروگراموں کے شعبے میں پروگرام پروڈیوسروں کے علاوہ اور بہت سے لوگ بھی تھے، جن کو سٹاف آرٹسٹ کہا جاتا تھا، یہ پکے ملازم نہیں ہوتے تھے۔ ہر سال ان کے کنٹریکٹ کی تجدید کی جاتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر سال میں کسی کی کارکردگی مقررہ معیار سے نیچی رہی ہو تو اس کے کنٹریکٹ کی تجدید نہ کی جائے، یہ بڑی تکلیف دہ بات تھی۔ یعنی ملازمت کے ہوتے ہوئے بھی سر پر تلوار لٹکتی رہتی تھی کہ خدا جانے سال کے بعد افسرانِ بالا ملازمت کو برقرار رکھنے کا فیصلہ کرتے ہیں یا نہیں۔ یہ طریقہ کار انگریز کے زمانے سے رائج تھا، جو خدا خدا کر کے 1973ء میں ختم

ہوا کہ جب ریڈیو پاکستان کو سرکاری محکمہ کے بجائے ایک خود مختار کارپوریشن کا درجہ حاصل ہوا اور سارے سٹاف آرٹسٹ، جن میں میوزک کمپوزر، شاعر، سکرپٹ رائٹر، صداکار، گلوکار، سازندے، اناؤنسر اور نیوز ریڈرز وغیرہ شامل تھے، مستقل ملازمت کے حقدار گردانے گئے۔

جن دنوں کی میں بات کر رہا ہوں یعنی جب ریڈیو پاکستان کراچی کے ڈرامہ سیکشن میں بحیثیت پروڈیوسر میرا تقرر ہوا۔ ان دنوں ڈرامہ سیکشن میں جو سٹاف آرٹسٹ متعین تھے ان میں صداکاروں میں ایس ایم سلیم، عبدالماجد، محمود علی، امیر خان، ریحان غزنولی، ظفر صدیقی، عرش منیر، فاطمہ خانم، اختری بیگم، صفیہ معینی اور آغاحشر کے تھیٹر کے مشہور فن کار عبدالرحمن کابلی اور مغل بشر وغیرہ شامل تھے۔ سکرپٹ رائٹرز میں مولانا ارشد تھانوی، شعیب حزیں، انتصار حسین اور سلیم احمد کے نام قابل ذکر ہیں کہ جو ہمہ وقت، سلسلہ وار پروگرام، فیچر، خاکے اور ڈرامے لکھنے میں مصروف رہتے تھے۔ ریڈیو کے لیے لکھنے والوں میں اور صلاحیتوں کے علاوہ ''زود نویسی'' ایک لازمی وصف سمجھا جاتا ہے۔ اچھا لکھنا وقت کے دورانیے کے مطابق لکھنا اور جلدی لکھنا ایک ریڈیو سکرپٹ رائٹر کی کامیابی کے لیے بے حد ضروری ہے۔ سلیم احمد میں یہ تینوں خصوصیات موجود تھیں۔ میں نے ان کو ایک گھنٹے کا سکرپٹ ایک گھنٹے میں مکمل کرتے دیکھا ہے، کبھی کبھی تو یہاں تک ہوا کہ کسی خاص موضوع پر ایمر جنسی میں لکھنا پڑ گیا تو سلیم احمد نیچے دفتر کی میز پر بیٹھے ایک ایک صفحہ لکھتے جا رہے ہیں اور ہم اوپر سٹوڈیو میں اس فیچر کی لائیو براڈکاسٹ کرنے میں مشغول ہیں۔ اس طرح کہ نئے لکھے ہوئے صفحات نیچے سے آتے رہے اور پروگرام نشر ہوتا رہا، لیکن اس طرح سکرپٹ لکھنا فیچروں اور پروپیگنڈا پروگراموں کی حد تک تو ممکن تھا، مگر ڈرامہ لکھنے کے لیے سلیم احمد کو سکون اور لمبے وقت کی ضرورت ہوتی تھی۔ اور یہ کام وہ گھر پر ہی کرتے تھے۔ جب میں نے سٹوڈیو نمبر 9 کے لیے ڈرامے پروڈیوس کرنا شروع کیے تو سلیم اور میرے پیشہ ورانہ رشتے کا آغاز ہوا۔ انہیں میرے پروڈیوس کیے ہوئے کھیل پسند آئے اور ڈرامے کے ساتھ میری رغبت کو انہوں نے بے حد سراہا۔ آخر آخر تو یہ ہوا کہ وہ سٹوڈیو نمبر 9 کے لیے ڈرامہ لکھتے ہی اس شرط پر تھے کہ میں اسے پروڈیوس کروں۔ اس طرح میرا خیال ہے چند ہی برسوں میں، میں نے سلیم احمد کے کم از کم پچیس، تیس ڈرامے پروڈیوس کر دیئے ہوں گے۔ ان میں طبع زاد ڈراموں کے علاوہ عالمی شہرت یافتہ مصنفوں سوفوکلیز، یوریپی ڈیز، ابسن، آسکر وائلڈ،

سارتر' پراندلو' برنارڈشا' یوجین اونیل اور دوسرے امریکی اور یورپی جدید ڈرامہ نگاروں کے کھیلوں سے ماخوذ ڈرامے بھی شامل تھے۔ تاریخ سلیم احمد کا پسندیدہ مضمون تھا اور میں خود بھی تاریخ کا طالب علم تھا' لہٰذا سب سے زیادہ لطف ہم دونوں کو تاریخی ڈراموں کی تحریر و پیشکش میں آتا تھا۔ اس ضمن میں چنگیز خان' تیمور' 1857ء' جھوٹا دیوتا' صلاح الدین ایوبی' البرامکہ جیسے معرکتہ الآرا ڈرامے انہوں نے لکھے۔ ان کے دیگر ڈراموں میں چند ایک کے نام مجھے اب بھی یاد ہیں' جن میں موسم اور محبت' شاہراہ حیات' خودکشی' یہ کس کی لاش ہے' ایسا کچھ کر کے چلو' کفارہ' چکر اور نغمانہ وغیرہ کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔

ہمارا پیشہ ورانہ رشتہ وقت کے ساتھ مستحکم سے مستحکم تر ہوتا گیا اور چونکہ ان سے ڈرامہ لکھانے کے لیے مجھے بار بار ان کے گھر جانا پڑتا تھا تاکہ ہر مرحلہ پر سکرپٹ دیکھتا رہوں' اپنی رائے دیتا رہوں اور اگر ضروری ہو وہ مجھ سے گفتگو کے بعد ترمیم بھی کرتے رہیں۔ اس مستقل آنے جانے نے ان سے ذاتی تعلقات کی بنیاد ڈالی۔ ان کا گھر مجھے اپنا گھر معلوم ہونے لگا۔ ان کے بھائی شمیم احمد' ان کے کزن افضال احمد' ان کی بہن زاہدہ اور ان کی والدہ جنھیں ان کے ساتھ میں بھی آپا کہا کرتا تھا' مجھے اپنے گھر کے افراد معلوم ہونے لگے۔ ایک رشتہ یہ بھی نکل آیا کہ میری پیدائش میرٹھ کی تھی اور سلیم احمد کا تعلق بھی یوپی کے اسی مشہور شہر سے تھا۔ ویسے پیدا تو وہ ضلع بارہ بنکی کے کھیولی نامہ قصبہ میں ہوئے تھے' لیکن ابتدائی تعلیم کھیولی اور اس کے بعد لکھنو میں حاصل کر کے وہ 1943ء میں میرٹھ آگئے تھے' جہاں انہوں نے فیض عام انٹر کالج میں داخلہ لے کر میٹرک کیا اور اس کے بعد ایف اے کے لیے میرٹھ کالج میں آگئے' مگر بی اے کی ڈگری حاصل کرنے سے قبل ہی میرٹھ چھوڑ کر کراچی آنا پڑا۔

سلیم احمد نے اپنے ادبی سفر کا آغاز میرٹھ سے کیا اور اسی شہر میں انہیں ایسے ادیبوں اور دانشوروں کا ساتھ نصیب ہوا' جو تاحیات ان کے قریبی حلقہ احباب میں شامل رہے۔ محمد حسن عسکری' پروفیسر کرار حسین' ڈاکٹر جمیل جالبی اور انتظار حسین جیسے نامور لکھنے والے' سب سلیم احمد کے میرٹھ کے ساتھیوں میں سے ہیں۔ جمیل جالبی' جنہوں نے سلیم احمد کو بالکل ابتدائی دور میں دیکھا' لکھتے ہیں "میرٹھ میں میری اور سلیم احمد کی ملاقات ہوئی۔ ہم دونوں فرسٹ ایئر کے طالب علم تھے اور ادب کی دنیا میں کچھ کر گزرنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔

دن رات یہی اوڑھنا بچھونا تھا۔ یہی موضوع سخن تھا اور یہی مقصد زندگی تھا۔ ہم دونوں نئی نئی کتابیں پڑھتے، تبادلہ خیال کرتے اور گھنٹوں انہی مسائل میں گم رہتے تھے۔ وہ اقبال کے رنگ میں شعر کہتے تھے۔ مجھے یاد ہے، اپنی زندگی کے اس زمانے میں سلیم احمد اور میں روز ایک افسانہ لکھتے تھے۔ کبھی کرشن چندر کے رنگ میں، کبھی عصمت چغتائی اور منٹو کے رنگ میں اور کبھی ناصر علی دہلوی کے رنگ میں ادب لطیف تخلیق کرتے۔ دو تین سال کے عرصے میں ہم نے سینکڑوں افسانے لکھے اور بے شمار کتابیں پڑھیں، اس کاوش سے لکھنے کی مشق ہو گئی اور ادب کا ذوق سنور گیا۔"

لکھنے کی اس مشق نے، جس کا ذکر جالبی صاحب نے کیا، زندگی میں سلیم احمد کو بڑا فائدہ پہنچایا۔ 1950ء میں انہوں نے ریڈیو پاکستان کراچی میں بحیثیت سکرپٹ رائٹر ملازمت اختیار کی۔ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے۔ ریڈیو کے سٹاف سکرپٹ رائٹر میں دیگر صلاحیتوں کے علاوہ دنیا کے ہر موضوع پر تیز رفتاری سے لکھنے کی صلاحیت بہت ضروری ہے، خاص طور پر سرکاری ریڈیو میں تو پروگراموں کی ترتیب و پیشکش کا دارومدار ہی اس پر ہے، پروگراموں کے موضوعات اور ان موضوعات پر حکمت عملی کے فیصلے کہیں اور ہوتے ہیں۔ پروگرام لکھنے اور پیش کرنے والوں کو تو صرف یہ بتایا جاتا ہے کہ فلاں موضوع پر ایک تقریر، فیچر یا تمثیلچہ لکھنا ہے اور فلاں تاریخ اور فلاں وقت نشر کرنا ہے۔ اب یہ ساری ذمہ داری پروگرام بنانے والوں کی ہے کہ وہ اس موضوع کو حکومت کی پالیسی کے مطابق کس رنگ اور کس ڈھنگ میں ریڈیو پروگرام کے سانچے میں ڈھالتے ہیں، سلیم احمد اس فن کے بڑے ماہر تھے۔

وہ بلا کے زود نویس تھے اور ساتھ ہی زبان و بیان کے سلسلہ میں کم سے کم معیار سے نیچے نہیں اترتے تھے۔ اپنے طویل عرصہ ملازمت میں انہوں نے ہزارہا سکرپٹ لکھے ہوں گے اور لاکھوں کروڑوں لفظ، جو انہوں نے لکھے ریڈیو سے نشر ہونے کے بعد فضا میں تحلیل ہوتے رہے، لیکن میرا چھ سات برس کے ساتھ کا تجربہ یہ ہے کہ ان کی ایسی تحریروں میں بھی، جنہیں مغرب میں Hack Writing کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ سلیم احمد کا مخصوص اسلوب اور طرز بیان انہیں دوسرے لکھنے والوں سے ممتاز کرتا ہے، خاص طور پر ڈرامے کو انہوں نے کبھی ان سرکاری قسم کے پروگراموں میں شامل نہیں سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ریڈیو اور بعد ازاں ٹیلی ویژن کے لیے جتنے کھیل یا ڈرامہ سیریز لکھیں، ان سب کا

اردو ادب میں ایک مقام ہے۔ اس کام میں وہ پالیسی یا وقت کی پابندی کرنے کے قائل نہیں تھے۔ مجھے یاد ہے میں نے ٹیلی ویژن کے لیے ان سے ”تعبیر“ کے نام سے ایک ڈرامہ سیریل لکھوایا‘ جو تحریک آزادی اور جدوجہد پاکستان کے موضوع پر تھا۔

میں چاہتا تھا کہ جلد از جلد یہ سیریل ٹیلی ویژن پر پیش کیا جائے‘ چونکہ مجھ پر سرکاری حلقوں کی طرف سے شدید دباؤ تھا‘ میں کراچی جا کر ان سے ملا اور انہیں یہ سلسلہ وار ڈرامہ لکھنے پر راضی کیا اور جلد مکمل کرنے کا مطالبہ کیا۔ سلیم احمد نے مجھ سے تو کچھ نہیں کہا‘ مگر افتخار عارف کے ذریعے‘ جو ان دنوں کراچی ٹیلی ویژن کے سکرپٹ ایڈیٹر تھے‘ بعد میں مجھے پیغام بجھوا دیا کہ ”آغا خان کو کہہ دو‘ یہ کام میں اپنی مرضی سے کروں گا اور اتنا وقت لوں گا‘ جس قدر درکار ہے۔“ ساتھ ہی انہوں نے سیاست‘ معاشیات اور تاریخ کی بہت سے کتابوں کی فہرست بھی پیش کی‘ جن کا مطالعہ ڈرامہ سیریل کی تصنیف و تہذیب کے لیے ضروری تھا۔ میں نے افتخار عارف سے مشورہ کرنے کے بعد سلیم احمد کی بات تسلیم کر لی اور جب انہوں نے اپنی مرضی کے مطابق تحقیقی کتب کے مطالعہ کے بعد ”تعبیر“ کے سکرپٹ لکھے اور اس دور کے ہونہار پروڈیوسر محسن علی نے پیش کیے تو ہر طرف دھوم مچ گئی۔ سلیم احمد نے ٹیلی ویژن کے لیے چند ایک اور ڈرامے اور سلسلہ وار ڈرامائی پروگرام بھی لکھے‘ جن میں نسیم حجازی کے ناول ”آخری چٹان“ اور ”شاہین“ بھی شامل ہیں۔ یہ سارے سلسلہ وار پروگرام بے حد مقبول ہوئے اور اس طرح سلیم احمد شاعر‘ نقاد اور محقق کے علاوہ ملک کے ایک بڑے ڈرامہ نگار بھی تسلیم کیے جانے لگے۔

سلیم احمد کی شخصیت میں ایک عجیب سا رچاؤ تھا‘ ان کے چہرے میں ایک خاص قسم کی جاذبیت تھی۔ ان کی آنکھوں میں ذہانت‘ نجابت اور شرارت کی ملی جلی چمک ہوتی اور انداز گفتگو میں بے پناہ دل ربائی ہوتی تھی۔ وہ ایک بے حد من موہنی شخصیت تھے۔ ان کا چہرہ ہمیشہ کھلا رہتا اور ایک دائمی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں سے ہمیشہ پیوستہ رہتی‘ وضع قطع اور لباس کے اعتبار سے سلیم احمد سادگی اور لاپروائی کا نمونہ تھے۔ کرتا پاجامہ اور شیروانی کے علاوہ میں نے کبھی انہیں کسی اور لباس میں نہیں دیکھا‘ لیکن اس سادگی کے باوجود ہر ملنے والے کو ایک غیر معمولی کشش اور جاذبیت کا احساس ہوتا تھا۔

سلیم احمد کا سراپا بیان کرنا میرے بس کا کام نہیں۔ یہ کام تو میرا دوست ریاض فرشوری

بھی نہیں کر سکا، جس نے سلیم کے پہلے شعری مجموعہ "بیاض" کے دیباچہ میں یوں لکھا تھا:
"اس جنگل میں آپ سلیم احمد کو کہاں تلاش کریں گے، سلیم احمد جو ایک بڑا غزل گو شاعر ہے، جو بہت اچھا ڈرامہ نگار ہے، جو تنقید میں اصولی معاملات پر امام غزالیؒ کی طرح ہنٹر کھینچے بیٹھا رہتا ہے، جو ایک بڑے خاندان کا تنہا کفیل ہے، جس نے دوستوں سے ایذا اٹھانے کے بعد بھی انہیں دعائیں دی ہیں، جو نروان کی تلاش میں جس درخت کے نیچے جا کر بیٹھا اس کی تپش سے درخت ہی جل اٹھا، بہت مجبور ہو کر اب وہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے پاس جا بیٹھا ہے، جہاں نہ کوئی صحرا ہے، نہ کوئی درخت، ہر طرف آگ ہی آگ ہے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے میں نے اسے مشورہ دیا کہ "بیاض" کے ساتھ تصویر شائع نہ کراؤ، کیونکہ تمہاری ہر تصویر جھوٹی ہوگی۔ اس نے کہا "لفظوں میں تو سما سکتی ہے۔" میں نے سوچا تیس بتیس سال کا تیکھے خطوط کا شیروانی پہنے، ہنستا ہنساتا، اچھا خاصا معتدل آدمی ہے۔ لفظوں میں تصویر آ تو سکتی ہے، لیکن اب جب یہ تصویر کھینچے بیٹھا ہوں تو خیال آ رہا ہے کہ جس طرح خوشبو کو، روشنی کی کیفیت کو، ابلتے ہوئے سمندروں کی جھلاہٹ کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح سلیم احمد کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔"

میں تقریباً سات سال ریڈیو پاکستان کراچی کے ڈرامہ سیکشن کا انچارج رہا۔ جب ریڈیو میں میرا تقرر ہوا ان دنوں شمس الدین بٹ ڈرامہ کے انچارج تھے۔ ریڈیو پاکستان کے ایک بہت بڑے کنبے میں ڈرامہ سیکشن ایک چھوٹے سے خوشحال خاندان کی طرح تھا۔ بٹ صاحب کبھی کبھی اپنے سیکشن سے منسلک پروڈیوسرز، سٹاف آرٹسٹ اور باہر سے بک کیے جانے والے صداکاروں سے ایک ایک روپیہ جمع کرتے اور کھارادر میں ایک ہندو حلوائی کی دکان پر سب کو لے کر جاتے، جہاں کراچی کی لذیذ ترین حلوہ پوری اور مٹھائی دستیاب تھی۔ اسی طرح جب شہر کے کسی سینما گھر میں کوئی اچھی انگریزی فلم لگتی، وہ ٹکٹ کے پیسے جمع کرتے اور کسی ایک شو میں ساری پارٹی کی پارٹی فلم دیکھنے پہنچ جاتی۔ سلیم احمد بھی اسی خاندان کے رکن تھے، اور اس طرح کی آؤٹنگ میں کبھی کبھی وہ بھی حصہ لیتے تھے۔ مگر ان کے شوق کھانے پینے کی حد تک مختلف تھے۔ مثلاً ان کو بھنے ہوئے چنے، نمک، مرچ کے ساتھ کھانے میں جس قدر مزہ آتا تھا، وہ ناقابل بیان ہے۔ چنوں کے آگے وہ دنیا کی لذیذ سے لذیذ نعمت چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں سگریٹ اور چائے کا بھی بے حد

شوق تھا۔ ان کا روز کا یہ معمول تھا کہ دوپہر کے بعد دفتر آتے' سیدھے میرے کمرے کا رخ کرتے' کچھ دیر میرے پاس بیٹھتے' اگلے چند دنوں کے کاموں کا پتا کرتے' چائے پیتے اور جتنے لوگ بھی اس وقت کمرے میں موجود ہوتے' ان سب کو چائے پلاتے اور اس کے بعد ریڈیو کے دوسرے افسروں اور دوستوں کے ساتھ کچھ وقت گزارتے اور واپس چلے جاتے۔ سلیم احمد ہمیشہ ایک جلوس کی صورت میں ریڈیو سٹیشن کے گیٹ میں داخل ہوتے' اس طرح کہ ان کے دائیں بائیں ان کے پرستاروں' شاگردوں اور دوستوں کا ایک گروہ ہوتا۔ اس گروہ کے مستقل ممبران میں اطہر نفیس' جمال پانی پتی' شمیم احمد' عزیر ہاشمی' افضال احمد' صہبا اختر' ساقی فاروقی اور کبھی کبھی قمر جمیل' احمد ہمیش' نگار صہبائی' عبید اللہ علیم' جمال احسانی اور عالم تاب تشنہ وغیرہ بھی ہوتے۔ میرے دفتر کے علاوہ جہاں ان کو اپنی آمد کی رپورٹ کرنا ضروری ہوتی تھی' جن اور لوگوں کے کمروں میں وہ جاکر گپ شپ کرتے' ان میں محمد عمر مہاجر' احمد ہمدانی' حمید نسیم' ریاض فرشوری' قمر جمیل' حمید زمان اور عزیز حامد مدنی شامل تھے۔ وہ جس کمرے میں بھی ہوتے دور ہی سے ان کی موجودگی کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ بلند آواز میں گفتگو' قہقہے اور چائے کی پیالیوں کی کھنکھناہٹ' سلیم یہ سارے لوازمات اپنے جلو میں لے کر چلتے تھے۔ آپ کمرے میں داخل ہوں تو ان کے اردگرد بہت سے اہل قلم اور اہل علم کا جمگھٹا ہوتا اور وہ درمیان میں کرسی پر دونوں پاؤں اوپر کیے بیٹھے ہوتے' سگریٹ سے سگریٹ سلگتا رہتا اور سلیم احمد علم کے موتی بکھیرتے رہتے۔

پھر ایک روز یوں ہوا یہ 1963ء کی بات ہے کہ وہ اپنے مخصوص انداز میں میرے دفتر میں میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھے تھے۔ جب وہ دونوں پاؤں اوپر رکھنے کے بجائے زمین پر رکھتے تو ایک پاؤں مستقل ہلاتے رہتے۔ اسی طرح ان کے ہونٹ بھی ہلکے ہلکے کانپتے رہتے۔ جیسے دانتوں سے آہستہ آہستہ کچھ چبا رہے ہوں۔ یہ سب ایک بے چینی اور اضطراب کا اظہار ہوتا تھا۔

سلیم احمد کے جسم میں ایک بے چین اور مضطرب روح تھی اور ایک دن جس کا میں ذکر کررہا ہوں' یہ روح چیخ پڑی' میرے عین سامنے کرسی پر بیٹھے ہوئے سلیم احمد اپنی پوری قوت سے چلائے۔ ان کی آنکھیں لہو کی طرح سرخ ہوگئیں' ان کا سارا بدن کانپنے لگا اور وہ بلند آواز میں چیختے رہے۔ ساتھ کے کمروں سے اور کوری ڈور سے لوگ دوڑتے ہوئے میرے کمرے

میں آئے۔ سلیم احمد نے میز سے ایک پیپر ویٹ اٹھایا اور پوری طاقت سے سامنے کھڑکی پر کھینچ مارا' شیشہ چکنا چور ہونے کی آواز دور تک گئی اور ریڈیو سٹیشن پر شور مچ گیا "سلیم احمد پاگل ہوگئے ہیں۔" میں ان کے سامنے بیٹھا ایک شدید ذہنی صدمہ سے دوچار تھا۔ وہ مسلسل چلاتے رہے' ایک لفظ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں' کیا چاہتے ہیں' گفتگو مکمل طور پر بے ربط تھی اور آواز انسانی اختیار سے زیادہ بلند تھی۔ وہ شدید جلال کے عالم میں تھے۔ لوگوں نے بہ مشکل انہیں قابو کیا اور ریڈیو سٹیشن سے لے گئے۔ یہ سلیم احمد کی اس مشہور بیماری کا آغاز تھا' جس میں وہ طویل عرصے مبتلا رہے اور جس سے ان کی فکر اور شخصیت کے دیگر پہلوؤں پر اہم اثرات مرتب ہوئے۔ ان کے حلقہ یاراں میں شامل اصحاب نے ان کے رویہ اور حالت کو ابن عربی کے مطالعہ سے منسوب کیا۔ عزیز رشتہ داروں نے علاج معالجہ کے لیے ہسپتالوں اور سپیشلسٹ ڈاکٹروں کی طرف رجوع کیا اور بالآخر وہ طبی ماہرین کے مشورے پر کچھ عرصہ کے لیے کوئٹہ چلے گئے' جہاں قیام کے دوران ان کا علاج ہوتا رہا اور پھر وہ کچھ نیم صحت مند حالت میں واپس آئے۔ اب وہ ایک بدلے ہوئے سلیم احمد تھے۔ جسمانی اور ذہنی' دونوں طرح۔ میری بھی اس اندوہناک واقعہ کے بعد ان سے وہ پرانی ربط وضبط کی کیفیت نہ رہی۔ میں کچھ عرصہ بعد انگلستان ٹیلی ویژن کی تربیت کے لیے چلا گیا اور واپس آکر لاہور میں قائم ہونے والے ٹیلی ویژن سٹیشن سے منسلک ہو گیا۔

کراچی چھوڑنے کے بعد سلیم احمد سے کم کم ملاقات ہوتی رہی۔ میں نے لاہور ٹی وی سے جب سٹوڈیو تھیٹر کے زیر عنوان پروگرام میں طویل دورانیئے کے ڈرامے پیش کرنا شروع کیے تو سلیم احمد کے کئی ریڈیائی ڈراموں کو مناسب ردوبدل کے بعد ٹیلی ویژن سے نشر کیا۔ ان کھیلوں میں سب سے زیادہ مقبولیت ان کے ڈرامے "ایسا کچھ کر کے چلو" کو ملی' جسے میں نے "مجرم" کے عنوان سے نشر کیا اور پہلی بار طارق عزیز نے اس کھیل میں مرکزی کردار ادا کر کے بحیثیت اداکار شہرت پائی۔ یوں سلیم احمد سے پیشہ ورانہ رشتہ کسی نہ کسی صورت میں برقرار رہا۔ انہوں نے بھی جب ریڈیو پاکستان کراچی کے جشن تمثیل کے لیے ایک نیا کھیل لکھا تو بصد اصرار مجھے لاہور سے پروڈیوس کرنے کے لیے بلوایا۔ مجھے یاد ہے اس ڈرامے کا نام "زندگی" تھا اور یہ سلیم احمد کا آخری ڈرامہ تھا' جو میں نے ریڈیو کے لیے پروڈیوس کیا۔ پھر 1970ء کے انتخابات ہوئے' ملک تقسیم ہوا اور میں پی ٹی وی کے

ہیڈ کوارٹر میں ڈائریکٹر پروگرام کے عہدے پر مقرر کردیا گیا' جہاں میں تقریباً نو برس ٹیلی ویژن کے پروگراموں کے شعبے کی سربراہی کے فرائض انجام دیتا رہا۔ سلیم احمد کا قلمی تعاون اس سارے عرصے میں مجھے حاصل رہا۔ اگرچہ ان سے ملاقات خال خال ہی ہوتی' مگر افتخار عارف کی کراچی ٹیلی ویژن میں موجودگی اور ان کی پیغام رسانی کے سبب میں اور سلیم احمد ایک دوسرے سے بے خبر کبھی نہیں رہے۔

1977ء کے مارشل لا کے بعد جب وہ مختصر عرصہ کے لیے وزارت اطلاعات کے مشیر مقرر ہوئے تو ہماری تفصیلی ملاقات ہوئی۔ میں کراچی دورے پر گیا ہوا تھا کہ سلیم کا پیغام ملا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں ان سے ملنے گیا۔ یہ ان کے انچولی والے مکان میں میری پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ میں نے از راہ مذاق ان سے کہا کہ اب تو آپ ہمارے افسر ہو' مشیر اطلاعات کا حکم ہمارے لیے وزیر اطلاعات کے حکم کے برابر ہے۔ بڑے پیار سے میرے گالوں کو تھپتھپایا اور مجھے سینے سے لگالیا کہ آغو تم میرے لیے ہمیشہ چھوٹے بھائی کی طرح رہے۔ اس وقت بھی جب تم میرے افسر تھے اور اس وقت بھی جب میں اس وزارت کا مشیر ہوں۔ پھر بہت دیر ہم ٹیلی ویژن کے حالات' پروگراموں کی پالیسی اور مستقبل کی منصوبہ بندی پر بات کرتے رہے۔ چلتے وقت انہوں نے کہا ہمیں جلدی جلدی ملتے رہنا چاہئے۔ میں نے کہا ضرور' جب آپ چاہیں۔ مگر سلیم ...... میں کہتے کہتے رک گیا۔ انہوں نے خوش دلی سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا بولو...... کیا کہنا چاہ رہے تھے۔ میں نے کہا یہ مشاورت کا عہدہ بڑے عرصہ قائم نہیں رہے گا' میں اسلام آباد میں رہتا ہوں اور وہاں کی سیاست کو قریب سے دیکھتا ہوں' یہ فیصلے جو ہو رہے ہیں' نیک نیتی اور خلوص پر مبنی نہیں ہیں۔ سلیم ہنس پڑے اور ان کے چہرے کے تاثرات سے صاف عیاں تھا کہ پھر کیا...... یہ عہدہ رہے نہ رہے' میرا اس عہدے نے کیا بنانا اور بگاڑنا ہے۔ میرا قیاس غلط نہیں تھا' کچھ عرصہ بعد جنرل ضیاء الحق نے پی این اے کے نامزد وزیروں کو کابینہ سے برطرف کردیا اور جماعت اسلامی کے وزیر اطلاعات محمود اعظم فاروقی کی وزارت کے ساتھ ہی سلیم احمد کی مشاورت بھی ختم ہوگئی' کچھ دن بعد مجھے بھی ٹیلی ویژن سے تبادلہ کرکے نیف ڈیک کا مینجنگ ڈائریکٹر بنادیا گیا۔ ویسے سلیم احمد کے لیے مشیر ہونا کوئی باعث افتخار بات نہ تھی۔ اس عہدے نے ان کے رہن سہن پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔ وہ ویسے ہی سلیم احمد رہے' جیسے مشیر ہونے

سے پہلے تھے اور بعد میں بھی ویسے ہی سلیم احمد رہے' جو مشیر ہونے کے زمانے میں تھے۔
یوں بھی زندگی سے سلیم احمد کے کچھ بہت زیادہ مطالبے نہیں تھے۔ دنیاوی نقطہ نگاہ سے ان میں وہ عیب اور وہ کمزوریاں نہیں تھیں' اگر تھیں تو بہت کم تھیں' جن کے باعث لوگ بدنام ہوتے ہیں۔ کھانا پینا' لباس' گھریلو رہن سہن غرض کسی معاملے میں بھی ان کی ضروریات زیادہ نہیں تھیں۔ صحیح معنوں میں درویش صفت انسان تھے' جو مل گیا وہ کھالیا' جو دیا وہ پہن لیا۔ ہاں شوق تھا تو شعروادب کا' ادبی معرکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا' مشاعروں میں شرکت کرنا' مذہبی اور فلسفیانہ مباحثوں میں شامل ہونا۔ غرض اگر یہ کہیں تو نامناسب نہ ہوگا کہ شاعری' ادب اور تنقید ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھے۔ دن میں کسی بھی وقت اور رات میں نصف شب کے بعد تک ان کے گھر پر لوگوں کی ایک بھیڑ ہوتی' جن میں شہر کے ادیب' شاعر اور نقاد شامل ہوتے۔ کچھ ان کے ہم عمر' کچھ بزرگ اور بڑی تعداد میں نوجوان اور نئے لکھنے والے۔ سلیم احمد کو گفتگو کرنے کا بے حد شوق تھا۔ وہ بلند آواز میں بولتے اور ان کے احباب' نیاز مند اور ملاقاتی حلقہ کیے ان کے چاروں طرف بیٹھے رہتے۔ ہر شب یہی صورتحال ہوتی اور نتیجتاً سلیم احمد بہت دیر سے سوتے' دیر سے جاگتے اور دیر سے ناشتہ کرتے۔ یہ تاخیر ان کی زندگی کا معمول بن گئی تھی' جو نہ صرف اپنے گھر تک محدود تھی' بلکہ جب کبھی وہ کسی دوسرے شہر جاتے تو وہاں بھی صورتحال ایسی ہی رہتی۔ سلیم کے ایک قریبی دوست نظیر صدیقی صاحب ہیں۔ سلیم جب بھی اسلام آباد آتے' ہمیشہ ان کے گھر قیام کرتے۔ ہوٹلوں اور سرکاری مہمان خانوں میں ان کا دل نہیں لگتا تھا۔ اپنے دن بھر کے پروگرام سے فارغ ہو کر وہ گھر لوٹتے تو پھر رات گئے تک مختلف موضوعات پر بحث مباحثہ کرتے رہتے۔ نظیر صدیقی سے ان کی دوستی ایک طویل عرصہ صرف قلمی نوعیت کی رہی۔ سلیم کراچی میں تھے اور نظیر ڈھاکہ میں۔ انہوں نے سلیم احمد کی شاعری اور نثر پر بہت کچھ لکھا اور ایسا لکھا جو سلیم احمد کو پسند آیا۔ سلیم اور نظیر میں خط وکتابت کا ایک طویل سلسلہ جاری رہا اور صرف تحریروں کے ذریعے ان کے تعلقات بے تکلفی کی حدود میں داخل ہوگئے۔ رفتہ رفتہ وہ ایک دوسرے کو آپ کے بجائے تم کہہ کر مخاطب کرنے لگے۔ حتیٰ کہ جب 1969ء میں نظیر صدیقی ڈھاکہ سے ہجرت کر کے کراچی آئے اور پہلی بار سلیم احمد سے ملے تو دونوں کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ

جنم جنم سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔

سلیم احمد کے بارے میں کچھ لکھنا اور ان کی شاعری کا ذکر نہ کرنا ممکن نہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتا کہ ان کی شاعری کے اسالیب، محاسن اور مقاصد پر تبصرہ کر سکوں۔ یہ کام اردو ادب کے نقادوں اور شعر و سخن سے تعلق رکھنے والے دانشوروں کا ہے اور سلیم احمد یقیناً ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں کہ جن پر ان کے ہم عصروں نے موافقت اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا بھی ہے۔ میرا تعلق تو شعر و شاعری سے صرف اچھے شعروں کو پسند کرنا اور ان سے لطف اندوز ہونے تک ہے۔ رہی سلیم احمد کی شاعری تو میں نے انہیں بار ہا ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے مشاعروں میں سنا ہے۔ نجی اور ادبی محفلوں میں اپنا کلام پیش کرتے ہوئے دیکھا ہے اور ادبی رسالوں میں شائع ہونے والی ان کی تخلیقات کو ایک ایسے قاری کی حیثیت سے پڑھا ہے، جو خود بھی ان کے حلقہ احباب میں شامل رہا ہو، میں نے ان کے مجموعہ ہائے کلام کی ورق گردانی بھی کی ہے۔ جن میں بیاض، اکائی، چراغ نیم شب اور مشرق شامل ہیں۔ ایک قاری کی حیثیت سے میں صرف اتنا کہوں گا کہ وہ پاکستان کے بہت اچھے شاعروں میں سے ایک ہیں اور ان کے بہت سے اشعار دل میں اتر جانے والے ہیں۔

میرا جی چاہتا ہے کہ ان کے کچھ شعر اپنی اور اپنے پڑھنے والوں کی خاطر پیش کروں۔ لیکن اس سے پہلے سلیم احمد کے اپنے الفاظ میں ان کے پہلے مجموعہ کلام کے دیباچہ سے ایک اقتباس کہ وہ خود اپنی شاعری کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔

''شعر و ادب کے پڑھنے والے کو بالغ ہونا چاہئے اور نڈر ہونا چاہئے۔ اس مجموعہ میں شاعری کتنی ہے اور ہے بھی کہ نہیں، اس بارے میں مجھ سے زیادہ آپ کو فیصلہ کرنا ہے۔ لیکن ایک بات ضرور کہوں گا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے بڑی بے خوفی سے کہا ہے۔ میں اپنے پڑھنے والوں سے بھی اسی بے خوفی کی امید کرتا ہوں۔ میں نے شاعری نہ ہونے یا کم ہونے کی بات انکسار کے طور پر نہیں کی۔ انکسار کے معنی میری لغت میں یہ کبھی نہیں رہے کہ کسی انسان پر وحی آئے اور ابو جہل کی دل جوئی کی خاطر انکسار سے انکار کرے، جس پر وحی آئے اسے وحی کا دعویٰ کرنا چاہئے۔ انکسار کے صرف ایک معنی ہیں، اپنی حیثیت کو پہچاننا۔ آدمی کچھ لوگوں سے بڑا اور کچھ لوگوں سے چھوٹا ہوتا ہے، اسے جاننا چاہئے کہ کس سے بڑا ہے اور کس سے چھوٹا۔ پھر ان کے حسب مراتب کے مطابق ان

سے سلوک کرنا چاہئے۔ شاعری کے بارے میں ایک اور بات مجھے کہنی ہے کہ میں چاند' بادل اور دریا کے الفاظ استعمال کرنے کو شاعری نہیں سمجھتا۔ بعض لوگ' جنہیں صرف اس قسم کے الفاظ پر وجد آتا ہے' ان کا نظریہ صحیح ہو یا غلط' میں اس نظریہ کو تسلیم نہیں کرتا۔ یہ کتاب جیسی بھی ہے' میری شعوری کاوش کا نتیجہ ہے۔ ویسے بھی میں شاعری کو شعور کی اولاد سمجھتا ہوں۔''

اور اب سلیم احمد کی غزلوں سے چند ایسے شعر جو مجھے پسند ہیں اور شاید میری طرح اور بہت سوں کو بھی پسند ہوں' یہ انتخاب ان کی چالیس برسوں کی تخلیقات سے بلا کسی لحاظ کیا گیا اور اس میں ہر زمانے کے شعر شامل ہیں۔

دل حسن کو دان دے رہا ہوں
گاہک کو دکان دے رہا ہوں

شاید کوئی بندہ خدا آئے
صحرا میں اذان دے رہا ہوں

خود اپنی آگ سے تو جی اٹھے شرر کی طرح
یہ معجزہ ابھی اے کائنات باقی ہے

اس آنکھ میں خواب ناز ہو جا
اے ہجر کی شب دراز ہو جا

اے نغمہ نواز آخر شب
آہنگ شکست ساز ہو جا

کس انجمن گل کی لگن ہے کہ چمن میں
نکلتا ہی نہیں پاؤں نسیم سحری کا

اتنی کاوش بھی نہ کر اپنی اسیری کے لیے
تو کہیں میرا گرفتار نہ سمجھا جائے

اسے سنبھال کے رکھو خزاں میں لو دے گی
یہ خاک لالہ و گل ہے کہیں ٹھکانے لگے

غنیم وقت کے حملے کا مجھ کو خوف رہتا ہے
میں کاغذ کے سپاہی کاٹ کر لشکر بناتا ہوں

برا لگا مرے ساقی کو ذکر تشنہ لبی
کہ یہ سوال میری بزم میں کہاں سے اٹھا

ہر انقلاب تازہ اسی بزم سے اٹھا
نام اس کا ہوگیا یہ نصیب آسماں کے تھے

وہ چوب خشک ہوں محروم آتش سوزاں
کہ بن جلائے جسے قافلہ روانہ ہوا

دل تھا اداس عالم غربت کی شام تھی
کیا وقت تھا کہ تجھ سے ملاقات ہوگئی

سب مجھ کو جلا کے سو گئے ہیں
میں ایک چراغ نیم شب ہوں

یہ سلیم کی غزلیات کے چند منتخب اشعار تھے۔ انہوں نے بہت سی نظمیں بھی لکھی ہیں

اور بہت اچھی نظمیں لکھی ہیں۔ لیکن اس خاکے میں طوالت کے خوف سے میں نظموں کے اقتباسات پیش نہیں کر رہا ہوں۔

اسی طرح سلیم کی نثر کے نمونے شامل کرنا بھی ممکن نہیں، حالانکہ انہوں نے تنقید و تحقیق کے موضوعات پر بڑی معرکتہ الآرا کتابیں تصنیف کی ہیں، جن میں نئی نظم اور پورا آدمی، غالب کون، ادبی اقدار، ادھوری جدیدیت، محمد حسن عسکری، آدمی یا انسان وغیرہ شامل ہیں۔

اس کے علاوہ مختلف النوع موضوعات پر مضامین اور اخباری کالم بھی ان کی نثری تخلیقات میں ایک گراں قدر سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ڈراموں کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ البتہ ان کی ذہنی کیفیت اور زندگی کے متعلق رویوں کا اجمالی سا اندازہ لگانے کی غرض سے میں ان کے ایک دو خطوں سے مختصر اقتباسات پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ انہوں نے جن چند لوگوں کو خطوط لکھے، ان میں ساقی فاروقی، احمد جاوید، نظیر صدیقی اور چھوٹے بھائی شمیم احمد کے نام قابل ذکر ہیں۔ سب سے زیادہ مراسلے پروفیسر نظیر صدیقی کے نام ہیں، جن میں ادب کے مختلف پہلوؤں پر سلیم احمد نے اظہار خیال کیا ہے اور بحث و تمحیص کے نت نئے نکات اٹھائے ہیں۔ ان خطوط میں ذاتی تعلقات کے عکس بھی نظر آتے ہیں۔ مثلاً یہ ہے جولائی 1963ء کے ایک خط کا ابتدائی حصہ:

"نظیر بہت دنوں سے تمہیں خط نہیں لکھا، تمہیں کیا کسی کو بھی، وجہ کچھ بھی نہیں۔ بس دل نہیں چاہا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ہر چیز بے معنی معلوم ہونے لگتی ہے۔ اپنی زندگی بھی، پھر خدا کی مار کہ اس بے معنی پن میں بھی معنویت ڈھونڈنی پڑتی ہے۔ معلوم نہیں تم کیسے ہو، خفا ہو گے شاید...... دو خطوں کا جواب نہ ملنے کا برا مانا ہو گا، نہ جانے کیا سوچتے ہو گے یا شاید کچھ بھی نہ سوچا ہو۔ اور یہ سب میری خوش فہمی ہو۔ بہر حال خفا ہو تو من جاؤ، برا مانا ہو تو معاف کر دو۔ کچھ سوچا ہو تو بھول جاؤ اور کچھ نہ ہو تو مجھے خفا ہونے کی اجازت دو۔"

خط میں جس انداز سے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے، اس کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ اور اب ایک نظر ایک مشکل موضوع پر ان کے تاثرات اور خیالات۔ یہ نظیر صدیقی کو لکھے گئے اپریل 1967ء کے ایک خط کا اقتباس ہے:

"تمہارے خیالات کو جہاں تک میں سمجھا ہوں' ان کا خلاصہ یہ ہے کہ قدیم و جدید زمانے کے انسان میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ انسان اپنے بنیادی خصائص میں جیسا پہلے تھا' ویسا ہی اب بھی ہے۔ اس لیے جدید انسان اور جدید زمانے کے خلاف جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ مبنی بر حقیقت نہیں ہے اور اسی لیے نئے انسان کی بے حسی کے بارے میں میرے خیالات کو تم نے ماضی پرستی کا نتیجہ سمجھا ہے۔ میں ماضی پرستی کے الزام سے کچھ زیادہ ڈرتا نہیں ہوں۔ لیکن ماضی اور حال کی بحث میں نے نہیں چھیڑی' انسان پہلے کیسا تھا اور اب کیسا ہے؟ یہ میرا موضوع گفتگو نہیں ہے۔ میں نے تو ساری بحث سے ہٹ کر یہ خیال تمہارے سامنے پیش کیا کہ انسان اور انسانیت اپنے بنیادی خصائص کے ساتھ ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ لیکن کسی خاص زمانے میں کسی ایک خصوصیت کا احساس' خاص شدت اختیار کر لیتا ہے۔ مثلاً نئے ادیبوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے جنس اور بھوک کو دریافت کیا۔ اس کا مطلب یہ تو کسی صورت سے نہیں ہے کہ انسان کو اس سے پہلے جنسی خواہش نہیں ہوتی تھی یا بھوک نہیں لگتی تھی۔ لیکن ان مسائل کا جو احساس اس زمانے میں پیدا ہوا ہے' ویسا پہلے نہیں تھا۔ بالخصوص ادب اور شعر میں اس کا اظہار اس طرح نہیں ہوا تھا۔ غم دوراں انسان کو کب نہیں رہا' مگر غم دوراں کو جو اہمیت ہمارے دور میں ملی' وہ کبھی نہیں ملی تھی۔ ادبی تخلیقات خواہ وہ تحریکوں کی صورت میں ہوں یا انفرادی کوشش اور کاوش کا نتیجہ ہوں۔ بعض ایسے نفسیات سے پیدا ہوتی ہیں' جنہیں کوئی ایک نسل یا فرد اپنے اندر دریافت کرتی ہے اور اس کے بعد انہیں کسی کلیہ کی شکل دے دیتی ہے۔"

اور یہ ہے ان کے ایک اور خط سے اقتباس' جس میں انہوں نے ادیب اور ادب کے سلسلے میں اپنا منشور بیان کیا ہے:

"ہم اپنی زندگی اور حالات کے خالق نہیں ہیں۔ جیسے حالات اور جیسی زندگی ہمیں دی گئی ہے' چار و ناچار اسی کو بسر کرنے پر مجبور ہیں اور اب بسر کرنے میں بھی کتنی دیر باقی ہے۔ بہت گزر گئی' تھوڑی رہ گئی ہے' ہنس کر اسے گزار کہ رو کر گزار دے۔ ایک بات البتہ کہتا ہوں ذرا سوچو کہ اگر ادیب نہ ہوتے تو یہ زندگی کچھ آسان نہ ہوتی؟

دیکھو کتنے ادیب ہیں کہ لکھ پتی بن گئے' ادب نے انہیں روکا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ معاشرے کو اپنی شرط پر قبول کرنا چاہتے ہو یا معاشرے کو اس کی شرائط پر ماننے کو تیار

ہو؟ معاشرہ تمہیں سب کچھ دینے کو تیار ہے اور دے سکتا ہے، مگر اس کے لیے تمہیں اس کے شرائط نامے پر دستخط کرنا ہوں گے۔ ادب کو میں نے کبھی صرف لکھنا لکھانا نہیں سمجھا۔ ادب ایک طرز حیات ہے اور اپنی تکمیل کے لیے صوفیوں جیسی ریاضتوں اور مجاہدوں کا طالب ہے۔ زندگی میں کامیابی کا راستہ ادب کا راستہ نہیں ہے۔ یہ دو مختلف منزلیں ہیں اور دونوں راستے جدا جدا ہیں اور دونوں کے درمیان انتخاب کا مسئلہ ہے بہت سے لوگوں نے ادب کو طرز حیات بنانے کے بجائے کاروبار بنایا اور اس میں کامیاب ہوئے۔''

سلیم احمد نے ادب کو کاروبار نہیں بنایا' حالانکہ ان کی روزی کا ذریعہ تاحیات ان کا قلم ہی رہا۔ انہوں نے زندگی بھر سرکار کی نوکری کی۔ سرکاری اداروں کے لیے سرکاری پالیسیوں کے مطابق لکھا۔ مگر اوپر بیان کیے ہوئے اپنے منشور سے کبھی بے ایمانی نہیں کی۔ انہوں نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے بھی جو کچھ لکھا' وہ اپنے فلسفہ حیات اور اپنے موقف سے متضاد نہیں تھا اور پھر جہاں بھی بحثیت ایک شاعر اور نثر نگار ان کو اپنے خیالات کے اظہار کا موقع ملا' وہاں انہوں نے ہمیشہ آزادانہ انداز میں کھل کر اپنے دل کی بات کی۔ ان کا یہی رویہ اور طرز حیات ان کی شہرت اور عزت کا باعث ہے۔ سلیم احمد نے ادب کی دنیا میں دوست اور ہمنوا بھی پیدا کیے اور مخالفین بھی۔ مگر دوست دشمن نے ہمیشہ ان کی جرأت اور بے باکی کا یکساں اعتراف کیا۔ انہوں نے جو کچھ لکھا اور کہا بانگ دہل کہا اور اپنے کہے سے نہ کبھی پیچھے ہٹے نہ کسی شرمندگی اور معذرت کا رویہ اپنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا نام' ان کی شخصیت' ان کا کردار ادب کے حلقوں میں جیسا ان کی زندگی میں سمجھا جاتا' ویسا ہی اس دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد سمجھا جاتا رہا۔

اسلم فرخی' سلیم احمد کے ایک قریبی دوست ہیں' جنہوں نے کم و بیش 35 برس سلیم کے ساتھ بسر کیے۔ سلیم احمد پر اپنے خاکے میں انہوں نے لکھا کہ: ''میں نے سلیم کو کسی سے مرعوب ہوتے نہیں دیکھا۔ نہ وہ خود کسی کو مرعوب کرتا تھا' اس کی شخصیت من موہنی تھی' لوگ خود بخود کھنچتے تھے۔ 48ء سے 83ء تک سلیم سے تعلقات رہے' مگر میں نے اس کی زبان سے کوئی ناشائستہ بات' بے ہودہ جملہ یا کسی کی برائی نہیں سنی۔ میری معلومات کے مطابق وہ ایک شفیق باپ' محبت کرنے والا بھائی اور خدمت گزار بیٹا تھا۔ اس

نے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں کسی کا سہارا نہیں لیا، کسی کی امداد نہیں چاہی، چونکہ وہ خود حالات کی بھٹی میں پگھل کر کندن ہوا تھا۔ اس لیے نوجوانوں کے ساتھ اس کا رویہ بڑا ہمدردانہ تھا۔ وقفے وقفے سے اعصابی دباؤ کا شکار رہنے کے باوجود ہمیشہ خوش مزاج نظر آیا۔"

میرے لیے سلیم احمد کی وفات بالکل اچانک تھی۔ مرنے سے کافی عرصہ پہلے سے میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، مگر ادبی رسالوں، اخباری کالموں، ریڈیو اور ٹی وی کے مشاعروں کے ذریعے یک طرفہ رابطہ ہمیشہ قائم رہا۔ اس تمام عرصہ میں مجھے کبھی یہ خیال نہ آیا کہ سلیم احمد مر بھی سکتا ہے۔ اس روز میں لاہور میں ایک میٹنگ کی صدارت کر رہا تھا، جس میں پاکستان کے پہلے قومی فلمی ایوارڈز کی تفصیلات طے کی جانا تھیں کہ کسی نے آ کر کہا ریڈیو پاکستان لاہور کا کوئی پروڈیوسر مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں نے کہا ان سے کہو دوپہر کے بعد آئیں، ابھی میں ایک میٹنگ میں ہوں، مگر پروڈیوسر کا اصرار تھا کہ کام بہت اہم ہے۔ صرف چند منٹوں کے لیے ان کا مجھ سے ملنا ضروری ہے۔ میں نے میٹنگ کے شرکاء سے معذرت کر کے ان کو اندر بلوا لیا۔ ریڈیو پروڈیوسر ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر لیے آئے اور اسے میز پر رکھتے ہوئے بولے: "سر! آپ کے تاثرات ریکارڈ کرنا ہیں۔ ہم شام کو سلیم احمد پر ایک پروگرام نشر کر رہے ہیں۔" "سلیم احمد پر...... مگر کیوں؟" میں نے دریافت کیا۔ اب ان کو احساس ہوا۔ وہ ایک دم ٹھٹکا گئے اور گردن جھکا کر بولے: "سر...... آپ کو شاید علم نہیں ہے، رات سلیم احمد کراچی میں انتقال کر گئے۔" مجھ پر جیسے بجلی سی گر پڑی۔ دل و دماغ ماؤف ہو کر رہ گئے۔ اس وقت تاثرات تو کیا ریکارڈ کراتا، میری روتے روتے ہچکی بندھ گئی، میٹنگ ختم کر دی گئی اور فلم پروڈیوسرز ایسوسی ایشن کے اراکین نے کہ جو اس میٹنگ میں شریک تھے، فلم سٹوڈیوز سلیم احمد کے سوگ میں بند کرنے کا اعلان کیا۔

سب چلے گئے اور میں تادیر کرسی پر اکیلا بیٹھا رہا۔ یادوں کے آسمان پر سلیم احمد کے ساتھ بیتے ہوئے دن روشن اور چمکدار ستاروں کی طرح ابھرتے اور ڈوبتے رہے۔ میرے لیے یہ ایک بہت بڑے شاعر اور ادیب کی موت تھی۔ ایک پیشہ ور ساتھی کی موت تھی، جس کے لکھے ہوئے بہت سے ڈرامے میں نے پروڈیوس کیے۔

ایک نیک دل اور عالی ظرف انسان کی موت تھی۔ ایک اچھے دوست کی موت تھی۔ اور سب سے بڑھ کر ایک بھائی کی موت تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ اس رات سلیم احمد بالکل اچھے بھلے سوئے تھے' مگر صبح کو جب ان کی بیٹی انہیں بیدار کرنے ان کے کمرے میں گئی تو ان کی نیند ابدی نیند میں بدل چکی تھی۔ جانے کس وقت رات کی خاموشی اور تاریکی میں وہ چپ چاپ اس دنیا سے چلے گئے' نہ کسی سے کچھ کہا' نہ سنا۔ فیض صاحب نے اسی طرح کی موت کے لیے کہا تھا:

تھک کر یونہی دم بھر کے لیے آنکھ لگی تھی
سو کر ہی نہ اٹھیں یہ ارادہ تو نہیں تھا
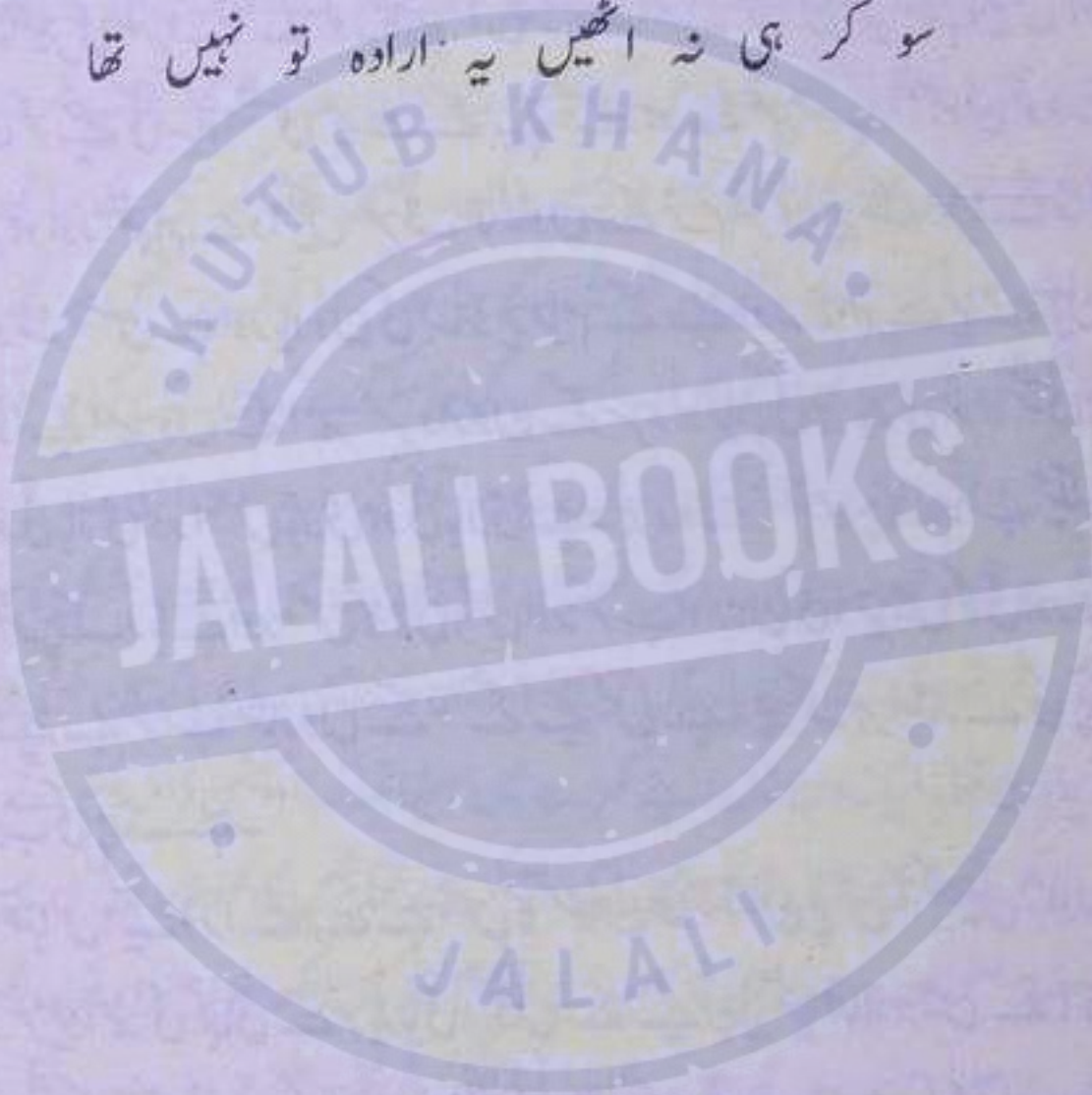
ریاض فرشوری

"تو چنگیزی گھرانے کے گورگان' آج کے صاحب قرآن' یہ سب یوں ہوااور اب آدھی رات کو خیمے کی سیاہ اطلسی چھت کے نیچے بیٹھے ہوئے تم حسب معمول خود سے شطرنج کھیل رہے ہو اور تمہارے دائیں طرف قالینوں کے نرم فرش پر ملکہ سرائے خانم کا جوان خوابیدہ مقبوضہ حسن ہے اور یادوں کی بساط پر ایام کے پٹے ہوئے مہرے پڑے ہیں۔ (طنزیہ لہجہ میں) تو اے امیروں کے امیر' سرداروں کے سردار ایام کی ہر بازی خواہ جیتی ہوئی بازی ہو یا ہاری ہوئی بازی' دراصل ہاری ہوئی بازی ہے۔ ہر روز جو ختم ہو چکا ہے اب نیلگوں آسمان پر تارہ بن کر چمک رہا ہے اور جس کا ثانی عمل اور حرب اور دن کی دنیا میں کوئی اور نہ تھا' رات کو وہ بھی اپنے بے خواب ستاروں کے آگے بے بس ہے۔ چونکہ ہر ستارے کی چمک ریا کی' دغا کی' فریب کی چمک ہے۔"

یہ اقتباس ایک ڈرامے سے ہے جس کا عنوان تھا "آہن پوش آنکھیں" اور جسے نامور افسانہ نگار عزیز احمد کی کہانی سے ریڈیائی تمثیل کے لیے اپنایا گیا تھا اور میں نے 1961ء میں کراچی ریڈیو کے مقبول پروگرام اسٹوڈیو نمبر 9 کے لیے پروڈیوس کیا تھا۔ یہ ڈرامہ لکھنے والے تھے ریاض فرشوری۔ کہانی کا مرکزی کردار مشہور زمانہ سپہ سالار اور فاتح امیر تیمور ہے جو اس منظر میں بے خواب اور مضطرب اپنے ماضی کو یاد کر رہا ہے۔ میں نے یہ مختصر سا اقتباس صرف اس لیے درج کیا ہے کہ پڑھنے والے زبان و بیان کی لذت سے محظوظ ہو سکیں۔ اردو ادب میں ایسی نثر لکھنے والے میرے خیال میں صرف دو ہی ادیب پیدا ہوئے ایک عزیز احمد اور دوسرا ریاض فرشوری۔ ان دونوں کا اسلوب نگارش ایک دوسرے سے اتنا ملتا جلتا ہے کہ مندرجہ بالا حصہ کو پڑھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون سے

جملے عزیز احمد کے ہیں اور کون سے ریاض فرشوری کے۔ الفاظ کا چناؤ' فقرے کی ساخت' بیان کا حسن' پڑھنے والے پر جادو کر دیتے ہیں۔ یہ تخلیقی اور تخیلی طرز تحریر کا کمال ہے جو قدرت نے ان دونوں کو عطا کیا تھا۔

ڈرامہ کے اس منظر کا خیال اس وقت مجھے اس لیے بھی آیا کہ جب میں نے ریاض فرشوری کے بارے میں کچھ لکھنے کا ارادہ کیا تو خود کو تقریباً اسی کیفیت میں پایا جو ڈرامہ "آہن پوش آنکھیں" میں امیر تیمور کی ہے۔ جیسے تیمور بیتے دنوں اور بچھڑے ساتھیوں کو یاد کرتے ہوئے پرزور جذباتی ہیجان میں مبتلا ہے' اسی طرح میں بھی برسوں پہلے کے واقعات اور اس دور کے دوستوں سے تعلقات کے بارے میں سوچتے ہوئے کچھ ایسی ہی کیفیت سے دوچار ہوں۔ میں نہیں جانتا ماضی کے ایام کے ڈھیر سے کون سے دن کا انتخاب کروں۔ کون سی بات سے آغاز کروں اور کون سی تصویر پہلے بناؤں۔ یقین کیجئے اگر کسی کے ساتھ اتنا بہت سا وقت گزرا ہو جیسا کہ میرا ریاض فرشوری کے ساتھ گزرا تو ایسے شخص پر کچھ لکھنا آسان نہیں ہوتا' کیونکہ اس ساتھ کو تو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے' بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جوانی بلکہ نوجوانی کے کم و بیش دس سال جس انسان کے ساتھ گزرے ہوں اس کے بارے میں کچھ لکھنا ایسا ہی ہے جیسے خود اپنے بارے میں لکھنا اور اپنے بارے میں لکھنا بڑا مشکل کام ہے۔

ریاض فرشوری سے پہلی بار میں 1957ء میں ملا۔ میں ریڈیو پاکستان کراچی میں ڈرامہ سیکشن کا انچارج تھا۔ ایک دن میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ اسٹیشن ڈائریکٹر کے چپڑاسی نے ایک فائل لا کر مجھے دی۔ اس فائل میں ایک اسکرپٹ تھا جس کا عنوان تھا "زریں تاج" فل سائز کے سفید صفحات پر بہت ہی خوبصورت رسم الخط میں لکھا ہوا مسودہ تھا۔ لکھائی کیا تھی لگتا تھا کسی نے موتی ٹانک دیئے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے مخروطی حروف اور بالکل ایک جیسی گولائیوں والے الفاظ جیسے ہاتھ سے نہیں لکھے گئے بلکہ کسی ایک ہی سانچے میں ڈھال کر نکالے گئے ہوں۔ میں اس رسم الخط کے حسن اور پرکشش تاثر کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا اور میں نے دل ہی دل میں کہا' اسکرپٹ کیسا بھی ہو' جس آدمی نے لکھا ہے اس کی تحریر کی نفاست کا بہرحال قائل ہونا پڑے گا۔ یہ ریاض فرشوری کا لکھا ہوا مسودہ تھا جو عزیز احمد کی کہانی "زریں تاج" سے ماخوذ تھا۔ عزیز احمد ان دنوں وزارت اطلاعات کے ایک بڑے افسر تھے۔ فائل میں سکرپٹ کے ساتھ ایک خط بھی تھا جو ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر زیڈ اے

بخاری نے کراچی ریڈیو کے سٹیشن ڈائریکٹر کے نام لکھا تھا۔ خط کے مندرجات کچھ یوں تھے...... "میں افسانہ نگار عزیز احمد کی کہانی "زرین تاج" کی ریڈیائی تشکیل کا مسودہ بھیج رہا ہوں۔ اسے ریاض فرشوری نے لکھا ہے جو براہ راست آپ سے رابطہ قائم کریں گے۔ اس ڈرامہ کو سٹوڈیو نمبر 9 کے لیے پرکھا جائے......"

میں نے دو ایک بار مسودہ کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر فائل اپنی دراز میں رکھ دی کہ اطمینان سے کسی وقت پڑھ کر اپنی رائے سے سٹیشن ڈائریکٹر کو مطلع کروں گا' البتہ ڈائریکٹر جنرل کا خط پڑھنے کے بعد مجھے ہلکا سا ناگواری کا احساس ہوا کہ یہ شخص جو بھی ہے بڑے افسروں کے توسط سے اپنا مسودہ منظور کرانا چاہتا ہے۔ دوسرے دن جب میں سٹوڈیو میں آئندہ اتوار کو نشر ہونے والے ڈرامے کی ریہرسل کرا رہا تھا کہ اسٹیشن ڈائریکٹر کا چپڑاسی پھر نمودار ہوا اور مجھے کہا صاحب نے سلام بھیجا ہے۔ انگریزوں کے زمانے کے افسران کسی ماتحت کو بلانے کے لیے یہی اصطلاح استعمال کیا کرتے تھے۔ یعنی کسی کو بلانا ہو تو افسر کہتا تھا فلاں صاحب کو میرا سلام بولو۔ میں ریہرسل میں بے حد مصروف تھا' اس لیے یہ بلاوہ مجھے ناگوار گزرا اور میں نے بددلی سے کہا "آپ جائیں میں ابھی آتا ہوں۔" تھوڑی دیر بعد جب میں سٹیشن ڈائریکٹر کے کمرے میں پہنچا تو وہاں ان کی میز کے ساتھ والی کرسی پر ایک شخص بیٹھا تھا۔ ڈائریکٹر صاحب نے کسی توقف کے بغیر مجھ سے پوچھا "آپ کو کل ایک مسودہ بھیجا تھا۔ اس کا کیا کیا آپ نے؟" میں سمجھ گیا' ساتھ بیٹھا ہوا شخص ہو نا ہو ڈرامہ کا مصنف ہے۔ وہ شخص مسلسل میری طرف دیکھ رہا تھا' لیکن میں نے اس کی جانب کوئی توجہ نہیں دی۔ میں نے ڈائریکٹر صاحب کو بڑے سپاٹ لہجہ میں جواب دیا "ابھی میں نے وہ مسودہ پڑھا نہیں ہے۔" ڈائریکٹر صاحب میرے جواب سے تھوڑے جز بز ہوئے اور پھر افسرانہ شان سے بولے "آج مسودہ پڑھ لیجئے اور کل مجھے اپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔" میں نے بلا کسی جھجک تڑاخ سے جواب دیا "آج میرے لیے یہ ممکن نہیں ہو گا' چونکہ میں پرسوں نشر ہونے والے ڈرامے کی ریہرسل میں مصروف ہوں۔ پیر سے پہلے مسودہ نہیں پڑھ سکوں گا۔ میرے لہجہ میں کچھ ایسی خود اعتمادی تھی کہ سٹیشن ڈائریکٹر لاجواب ہو کر میری طرف تکنے لگے اور ذرا توقف کے بعد ذرا رکھائی سے بولے "ٹھیک ہے پیر کو مجھے بتائیں۔" اور پھر ساتھ بیٹھے شخص سے مخاطب ہوئے "سوری' آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔ مجھے افسوس ہے آپ کو زحمت

ہوئی۔ اگر آنے سے پہلے آپ فون کر لیتے تو اس زحمت سے بچ جاتے۔" ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے گردن گھما کر ایک بار میری طرف دیکھا اور مہذب لہجہ میں کہا" کوئی بات نہیں میں پیر کو معلوم کر لوں گا۔" میں نے اجازت طلب نظروں سے ڈائریکٹر صاحب کی جانب دیکھا "ٹھیک ہے آپ جائیں۔" انہوں نے کہا اور میں کچھ کہے بنا کمرے سے باہر نکل آیا۔

دراصل میں ذہنی کوفت میں مبتلا تھا اور شاید یہ تاثرات میرے چہرے سے عیاں تھے۔ باہر نکل کر جب میں اوپر سٹوڈیو میں جانے کے لیے زینے کی طرف بڑھ رہا تھا تو اچانک میں نے اپنے کندھے پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا۔ مڑ کر دیکھا تو وہی شخص سامنے کھڑا تھا۔ غالباً میرے ساتھ ہی وہ بھی ڈائریکٹر صاحب کو خدا حافظ کہہ کر ان کے کمرے سے باہر آ گیا تھا۔ "آپ کے ڈائریکٹر صاحب نے ہمارا تعارف نہیں کرایا۔ میرا نام ریاض فرشوری ہے۔" اس نے خوش دلی سے کہا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے پہلی بار غور سے اس اجنبی کو دیکھا۔ اس کے انداز کا بے تکلفانہ پن مجھے اچھا لگا۔ "میرا نام آغا ناصر ہے۔" میں نے تعارف کی رسم نبھاتے ہوئے جواب دیا۔ "میں جانتا ہوں آپ کا نام۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔" اس نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ دبایا، لیکن میں جواب میں یہ نہ کہہ سکا، چونکہ مجھے اس ملاقات سے واقعی کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے صرف مسکراہٹ پر اکتفا کیا۔ میرا ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا "دیکھیں پیر تک مسودہ پڑھ کر کوئی فیصلہ ضرور کر لیں۔ مجھے پیسوں کی ضرورت ہے۔" جس بے تکلفی اور جس انداز سے اس نے یہ بات کہی اس نے میری ساری خفگی اور کوفت کو دور کر دیا۔ "جی ضرور" میں نے جواب دیا اور اسے خدا حافظ کہہ کر سٹوڈیو کی جانب جانے والے زینے کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔

یہ ریاض فرشوری سے میری پہلی ملاقات تھی۔ اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ آنے والے دس برسوں میں یہ شخص ریڈیو میں میرا سب سے قریبی دوست بن جائے گا۔ بعد میں جب ہم کبھی اس ناخوشگوار پہلی ملاقات کا ذکر کرتے تھے تو ریاض کہا کرتا تھا "دراصل میں نے سٹیشن ڈائریکٹر کے دفتر میں تمہارے رویہ سے فوراً ہی یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ تم اپنے ڈھب کے آدمی ہو اور ہماری تمہاری خوب نبھے گی۔"

میں نے اسی رات اس کا لکھا ہوا ڈرامہ پڑھ ڈالا۔ مسودے میں کوئی جھول نہیں تھا۔ ہر لحاظ سے یہ ایک مکمل اور معیاری ڈرامہ تھا۔ مجھے یہ کھیل اتنا بھایا کہ میں نے اگلے ہی ہفتے اسے

نشر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پیر کو جب وہ آیا تو میں نے نہ صرف اسے ڈرامے کی منظوری کی خبر سنائی بلکہ معاوضہ کا چیک بھی اس کے حوالے کر دیا۔ وہ بے حد خوش ہوا۔ بعد میں جب ہماری بے تکلفی بڑھ گئی تو اس نے مجھے بتایا کہ اس روز اس کو پیسوں کی اشد ضرورت تھی چونکہ کئی دنوں سے وہ مالی بحران کا شکار تھا اور گھریلو اخراجات تک کے لیے اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ ریاض فرشوری پر ایسے وقت بار بار آتے تھے۔ وہ لکھنے والوں کی اس کیٹیگری سے تعلق رکھتا تھا جن کا ذریعہ معاش صرف اور صرف تصنیف و تالیف پر منحصر ہوتا ہے۔ اس کی آمدنی کا تمام تر دارومدار اس کے قلم پر تھا۔ سعادت حسن منٹو، نصیر انور، کمال احمد رضوی وغیرہ کی طرح وہ قلم کی مزدوری کرتا تھا اور جب کسی وجہ سے یہ سلسلہ رک جاتا تو نوبت فاقوں تک پہنچ جاتی تھی، مگر اس نے زندگی بسر کرنے کا یہ انداز خود منتخب کیا تھا۔ ملازمت اسے پسند نہ تھی۔ کئی بار اس کو باقاعدہ ملازمت کے موقعے ملے مگر وہ ٹک کر کام نہ کر سکا۔ سفارت خانوں، اخبارات اور ریڈیو پاکستان میں اسے کئی بار نوکری ملی مگر وہ زیادہ عرصہ لگی بندھی محکمانہ زندگی کو برداشت نہ کر سکا اور کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر آزادی حاصل کر لی۔ وہ آزاد منش انسان تھا اور ملازمتوں کی پابندی اور افسروں کی ماتحتی اسے قبول نہ تھی۔ ایسی زندگی کے کچھ فائدے ہیں اور کچھ نقصان۔ فائدہ یہ کہ انسان کسی کے احکام کا پابند نہیں ہوتا اور خود کو مکمل طور پر آزاد محسوس کرتا ہے اور نقصان یہ کہ اگر کسی وجہ سے آمدن کا ذریعہ ٹوٹ جائے تو فاقہ کشی کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہوتی۔ ریاض فرشوری فاقہ کشی کے یہ مواقع خود فراہم کرتا۔ مثلاً ریڈیو کے حوالے سے میں یہ جانتا ہوں کہ جب اس کی ماہانہ آمدنی کا سو فیصد انحصار صرف ریڈیو کے سکرپٹ لکھنے پر تھا تب بھی وہ کسی لحاظ کے بغیر بعض افسران بالا کے خلاف ایسی ایسی فقرے بازی کرتا تھا کہ کتنا ہی صابر و شاکر افسر کیوں نہ ہو اس کی تاب لانا مشکل تھا اور نتیجہ ہمیشہ اس کے پروگرام کے سلسلہ کو بند کرنے کی صورت میں نکلتا تھا۔ ایک بار میں نے اس سے کہا "یار ریاض خاں، تم خود کیوں اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارتے ہو۔ تم اپنی زبان بند نہیں رکھ سکتے۔" میری بات سن کر بہت ہنسا اور پھر بڑی خوش دلی سے بولا "یار یہی تو ایک کام ہے جو میں صرف اپنے لیے کرتا ہوں۔ دیکھو نوکریاں اور کام دھام تو کسی نہ کسی طرح مل ہی جاتے ہیں مگر جو لذت زبان پر آئے ہوئے فقرے کی ادائیگی میں ہے وہ کہاں ملتی ہے۔ تو میری جان کچھ ہو جائے میں زبان پر آیا ہوا فقرہ نہیں روک سکتا۔ اگر ایسا

کروں تو یہ میرے اپنے ساتھ بڑی زیادتی ہوگی"۔ لہٰذا ساری زندگی وہ اس ڈگر پر چلتا رہا۔ اس کے چاہنے والے دوست احباب اسے بچانے کی کوششیں کرتے رہے۔ کبھی کامیاب ہوئے کبھی ناکام، مگر اس نے کبھی کسی کی نہ سنی۔ ہونٹوں پر آئے ہوئے فقرے کو روکنا اس کے نزدیک سب سے بڑا گناہ تھا اور اس نے یہ گناہ کبھی سرزد نہیں کیا۔ اگرچہ اس کی پاداش میں اس نے بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ سخت دشواریوں اور مشکلات کا سامنا کیا، مگر وہ کہتا تھا وہ خوشی کا ایک لمحہ جو اس فقرے کی ادائیگی نے مجھے بخشا ہزاروں، لاکھوں روپوں کی اجرتوں سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔

ریاض فرشوری دوستوں کے معاملے میں بہت احتیاط پسند تھا۔ اس کے جان پہچان والو کا حلقہ تو خاصا وسیع تھا مگر قریبی دوست گنے چنے تھے۔ ریڈیو پاکستان میں میرے علاوہ انگریزی پروگراموں کے پروڈیوسر حمید زمان اس کے خاص دوستوں میں شامل تھے۔ میں اور حمید زمان دونوں ریڈیو پاکستان کراچی سے وابستہ تھے اور ریاض بھی چند برسوں کے لیے تعلیمی نشریات کے شعبے میں پروڈیوسر کی حیثیت سے ملازم ہو گیا تھا۔ ہمارا یہ ساتھ چار پانچ برس جاری رہا۔ سارے دن میں بیشتر وقت ہم تینوں ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے تھے۔ دوپہر کے بعد ریاض اور زمان میرے کمرے میں آجاتے اور جب باہر ہوامیں رطوبت کم ہونے لگتی اور بحیرۂ عرب کی خنک ہوائیں کراچی کو اپنی گود میں لے لیتیں تو الفنسٹن سٹریٹ کا ایک چکر لگا کر ہم ریگل کے بس سٹاپ پر آتے اور وہاں سے اپنے اپنے علاقوں کی بسوں میں بیٹھ کر چلے جاتے۔ یہ کوئی مبالغہ نہیں ہوگا، اگر میں کہوں کہ ہم نے الفنسٹن سٹریٹ اور صدر کے ان برسوں میں پیدل اتنے چکر لگائے کہ شاید ہم کئی بار کراچی سے پشاور تک جا کر واپس آسکتے تھے۔ ریگل سینما کے بس سٹاپ کے سامنے بدایوں کے ایک کبابچی کی دکان تھی۔ جب کبھی ریاض کے پاس پیسے ہوتے تو وہ ضرور اس دکان سے کباب خریدتا۔ اس دن وہ بس کی بجائے ٹیکسی میں سفر کرتا۔ مجھے اور حمید زمان کو مارٹن کوارٹرز اور پیر الٰہی بخش کالونی میں ڈراپ کرتا ہوا اپنے گھر جاتا، جتنا شوق پیسہ خرچ کرنے کا میں نے ریاض فرشوری میں دیکھا وہ کم ہی کسی اور میں نظر آیا، جس روز اسے ریڈیو سے معاوضے کا چیک ملتا یوں لگتا تھا جیسے وہ لکھ پتی ہو گیا ہے۔ وہ دوپہر کو ہمیں کیفے ٹیریا میں لنچ کراتا، شام کو کیفے جارج میں چائے پلاتا اور کسی اچھے سینما گھر میں اچھی سی فلم دکھاتا۔ ہم دونوں کے علاوہ اس کے حلقہ احباب میں جو اور

لوگ شامل تھے ان میں روزنامہ "ڈان" کے چیف رپورٹر اور مشہور افسانہ نگار ضمیر الدین احمد کراچی آرٹس کونسل کے ڈائریکٹر عرفان حسین' ریڈیو پاکستان کے سٹاف آرٹسٹ افضل صدیقی' راولپنڈی سے آئے ہوئے پروڈیوسر محمد عمر معروف کالم نگار طفیل احمد جمالی اور روزنامہ امروز میں اس کے ساتھ کام کرنے والے چند پرانے ساتھی تھے۔ حیدر آباد' دکن کے پرانے دوستوں میں محمد عمر مہاجر' ابو مسلم ضیائی' مجید فاروقی اور دیگر دوستوں میں خواجہ بقاء اللہ' ثمین خان' نذیر صوفی' امریکن سفارت خانے کے احمد حسن اور وسیم صدیقی وغیرہ شامل تھے۔ ویسے ادبی اور صحافتی حلقوں کی اور بہت سی شخصیات سلیم احمد' قمر جمیل' حمید نسیم' ابراہیم جلیس' فرہاد زیدی' منصور قیصر' حنیف اسدی' ابرار احمد اور خواجہ معین الدین وغیرہ سے بھی اس کے قریبی تعلقات تھے' لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ لوگ ریاض فرشوری سے دور رہنا چاہتے تھے۔ ایک بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو اس سے خائف رہتے تھے اور اسی لیے اس کی قربت کو ناپسند کرتے تھے۔ میرا خیال ہے اس کی بڑی وجہ اس کی صاف گوئی' بے خوفی اور تند و تیز اور تلخ فقرے تھے۔

ریاض فرشوری بدایوں میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی سے تاریخ میں ایم اے کیا۔ چار سال تک حیدر آباد' دکن کے ریڈیو سٹیشن سے منسلک رہے اور حیدر آباد پر پولیس ایکشن کے بعد ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ انہوں نے روسی سفارت خانے میں بھی کام کیا اور روزنامہ امروز کے سٹاف میں بھی شامل رہے۔ کچھ عرصہ کے لیے ریڈیو پاکستان کراچی میں تعلیمی پروگراموں کے شعبے میں بحیثیت پروڈیوسر خدمات انجام دیں اور بعد ازاں ریڈیو کی ملازمت سے استعفیٰ دے کر آزاد پیشہ قلم کار کی حیثیت میں ریڈیو کے لیے سکرپٹ لکھتے رہے۔ انہوں نے برس ہا برس ایوب خان کے دور حکومت میں بنیادی جمہوریتوں کے پروگرام میں "جمہور کی آواز" کے زیر عنوان سلسلہ وار پروگراموں کے لیے مسودے تحریر کیے۔ زندگی کے آخری ایام میں وہ "سب رنگ" ڈائجسٹ کے ادارہ تحریر سے وابستہ تھے۔ اس مقبول ماہنامہ کے چیف ایڈیٹر اور مالک شکیل عادل زادہ نے حتی المقدور ان کی معاونت کی اور بڑی حد تک انہیں غم روزگار سے نجات دلانے کا ذریعہ بنے۔ میرے اور ریاض کے مشترکہ دوست اور مشہور شاعر قمر جمیل نے ریاض فرشوری کی وفات پر اپنے مضمون میں لکھا تھا:

"ریاض فرشوری ایک کہانی نگار تھا۔ ڈرامہ نگار تھا اور منٹو کی طرح ابراہیم جلیس کی طرح وہ بھی اپنی ایک کہانی چھوڑ گیا ہے۔ میں اس کہانی نگار کا پورٹریٹ بنانا چاہتا ہوں اور اس پورٹریٹ کے نیچے لکھنا چاہتا ہوں۔ ہر شے فانی ہے' جھوٹ بھی فانی ہے' سچ بھی فانی ہے۔ کیفیوسش نے کہا تھا بڑے بڑے پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ دانشور بھی پودوں کی طرح فنا ہو جاتے ہیں' مگر سچی روحیں کہتی ہیں' ہمیں جھوٹ سے سچ کی طرف لے چلو۔ غیر حقیقی سے حقیقی کی طرف لے چلو۔ اندھیرے سے روشنی کی طرف لے چلو۔ یہ سچ ہے کہ لامحدود دنیا کا احساس بعض اوقات لوگوں کو اس دنیا سے بدل کر دیتا ہے' لیکن ریاض فرشوری کے اندر جو انسان تھا' وہ ایسا درخت تھا جو زمین اور آسمان دونوں سے رشتہ جوڑنا چاہتا تھا۔

قمر جمیل نے یہ بھی لکھا "ریاض فرشوری ایک فن کار پیدا ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا ڈرامہ اپنے زمانے کے ضمیر کو جھنجھوڑ سکتا ہے۔ جگا سکتا ہے۔ راستہ دکھا سکتا ہے۔ اسی لیے وہ اپنے کمرشل ڈراموں کو بھی اپنی جاودانی تحریر سمجھتا تھا۔ وہ جانتا تھا ڈرامہ تفریح بھی ہے۔ تعلیم بھی ہے اور تخلیق بھی۔ وہ جانتا تھا ہم لوگوں کو صرف آئین اور قانون کے ذریعہ بہتر انسان نہیں بنا سکتے' لیکن ڈرامہ ہماری روحوں کی گہرائیوں میں گھونسلا بنائے ہوئے تعصبات کو جلا کر خاکستر کر سکتا ہے۔ ہم ڈرامے کے ذریعے رائے عامہ کو بڑی گہرائیوں میں اتر کر تبدیل کر سکتے ہیں۔ وہ اسی تگ ودو میں راتوں کو جاگتا رہتا تھا۔ اس کے کمرے میں لائٹ جلتی رہتی تھی۔ وہ اپنے گھر سے زیادہ باہر کافی ہاؤسز' افسروں کے کمروں میں' دوستوں کے لان میں بے باکی سے گفتگو کرتا۔ اس نے سارے قلعے ہوا میں بنائے۔"

ریاض فرشوری کو ہوائی قلعے بنانے اور جھوٹ بولنے کا بہت شوق تھا' مگر اس کے یہ دونوں شوق کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے تھے۔ اس کے جھوٹ نے اگر کسی کو نقصان پہنچایا تو اپنے آپ کو...... حالانکہ خود اس کو بھی یہ علم ہوتا تھا' مگر اس نے کبھی اس بات کی پروا نہیں کی۔ مثلاً میں نے بارہا دیکھا وہ جانتے بوجھتے ایسا کرتا تھا۔ ایک بار ہم دونوں کسی صنعت کار کو ملنے گئے۔ ریاض فرشوری نے حسب عادت ایک بہت مہنگا اور بڑا منصوبہ بنایا تھا اور اس پر عمل درآمد کے لیے کسی سرمایہ دار کی شمولیت کے لیے کوشاں تھا۔ ہم دونوں اس سیٹھ کے پاس گئے۔ ریاض بڑی سنجیدگی سے اس امیر زادے کو اپنے منصوبے کے اسرار و رموز سمجھاتا

رہا، مگر میں نے محسوس کیا کہ ریاض کچھ مطمئن نہیں ہے۔ جب ہماری ملاقات اختتام پذیر ہوئی تو ہمارے میزبان نے کہا ''آپ دونوں ابھی ٹھہریں میں آپ کو اپنے ساتھ لنچ پر لے جانا چاہتا ہوں۔ ریاض نے ایک لمحہ سوچے بغیر کہا ''آپ کا بہت بہت شکریہ، دراصل ہمیں ایک صوبائی وزیر نے کھانے پر مدعو کیا ہوا ہے۔ وہ ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اب اجازت دیجیے۔ آپ کا طعام پھر کسی وقت'' جب ہم باہر آئے تو میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کون سا وزیر ہے جس کے یہاں ہمیں لنچ پر جانا ہے، مگر میرے سوال سے پہلے ہی اس نے سوال کر ڈالا ''یار آغوں تمہارے پاس دو چار روپے ہوں گے۔ مجھے بڑی زور کی بھوک لگی ہے۔ سعید منزل کے سامنے جو ٹھیلے والا کھڑا ہوتا ہے وہاں سے چھولوں کی چاٹ کھانی ہے'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور کہا ''مگر وہ صوبائی وزیر کے ظہرانے کی دعوت؟...... وہ زور سے ہنسا ''کس کی دعوت، کہاں کی دعوت'' ''تو پھر تم نے اس شریف انسان کی دعوت کیوں مسترد کر دی۔ میں نے دریافت کیا ''دیکھو'' اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا، ''میں نے اس کی باتوں سے اندازہ لگالیا تھا کہ وہ ہمارے منصوبے کے لیے رقم فراہم کرنے میں سنجیدہ نہیں ہے تو پھر ہم اس کا کھانا کیوں کھاتے۔ کل کو وہ سارے شہر میں کہتا پھرتا کہ ریاض فرشوری اور آغا ناصر تو لنچ پر میرے پاس آتے رہتے ہیں'' اور پھر اس نے صنعت کار کو ایک موٹی سے گالی دی اور ہم دونوں تیز تیز قدموں سے سعید منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

ریاض فرشوری کے جھوٹ بولنے کی عادت نے جتنا نقصان اس کو زندگی میں پہنچایا، اس کا حساب لگانا بڑا مشکل ہے۔ وہ بھوکے پیٹ ہوتا تو کہتا ''میں ابھی فائیو سٹار ہوٹل سے کھانا کھا کر آرہا ہوں۔ اس کی جیب میں بس کے کرایہ کے لیے پیسے نہ ہوتے مگر وہ کسی کی کار میں گھر ڈراپ ہونے کی آفر مسترد کر دیتا۔ اپنی خوشحالی، دولت کی فراوانی اور زندگی کی آسائشوں کی ایسی مرقع تصویر دوسروں کے سامنے پیش کرتا کہ سننے والا رشک کرنے لگتا۔ میں نے ایک دن پوچھا ''یار ایسا کیوں کرتے ہو...... '' ہنس کر کہنے لگا ''یہی تو سب سے بڑا اثاثہ ہے۔ دیکھو میں کسی کا نقصان نہیں کرتا۔ کسی سے کچھ نہیں لیتا۔ اگر ایسی ہوائی باتیں کر کے اپنا دل پرسند کر لیتا ہوں تو کسی کو اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ہوائی قلعے، یہ جھوٹ کے محل، یہ تخیلی اور تصوراتی، شیشے کے گھر بس یہی تو متاع فقیر ہے۔ میں کسی کا کیا لیتا ہوں۔ اگر ان باتوں سے میرا دل خوش ہوتا ہے تو کسی کو اعتراض کیوں ہو۔''

بیٹھے ہیں رہ گزر میں ہم
کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

اب میں سوچتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے وہ کتنی سچی بات کہتا تھا۔ جو خوشیاں‘ جو روشنیاں‘ جو آسائشیں ہمیں حقیقت میں نصیب نہیں‘ ان کے تصور پر تو دوسروں کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ کیا ہم محروم و مجبور لوگ خواب بھی اپنی مرضی اور پسند کے مطابق نہیں دیکھ سکتے۔ کبھی کبھی شام کو الفنسٹن سٹریٹ پر گھومتے ہوئے جب میں اور حمید زمان اپنی محرومیوں اور اپنی پوری نہ ہونے والی خواہشات کا ذکر کرتے تو وہ ہمارا انداق اڑاتے ہوئے کہتا ”یار تم لوگ عجیب پاگل ہو...... تم دراصل کیا ہو‘ کن مسائل سے دوچار ہو‘ تمہارے گھر اور خاندان کی کیا حالت زار ہے۔ اس سے تو صرف تم واقف ہو۔ یہ ساری خلقت جو اس وقت سڑک پر گزرتے ہوئے ہمیں دیکھ رہی ہے‘ اس کو ہماری محرومیوں‘ ہماری ضرورتوں اور ہمارے غم و آلام کا کیا پتہ۔ لہٰذا اپنے چہروں پر مسرتوں کے‘ خوشحالی کے‘ فارغ اُلبالی کے خول چڑھالو تاکہ ان سارے دیکھنے والوں کے لیے ہم تینوں اس شہر کے متمول‘ آسودہ حال اور کامیاب و کامران انسان نظر آئیں اور بس یہی بات اہم ہے کہ ہم کیا نظر آتے ہیں۔ اور یاد رکھو‘ اگر اپنے عزائم بلند رکھو گے‘ اگر زندگی سے اچھی توقعات رکھو گے تو زندگی ضرور تمہیں نوازے گی۔ یہ آغا ناصر جو دو سال پرانی پشاوری چپل پہنے ہمارے ساتھ چل رہا ہے‘ میں اسے ریڈیو پاکستان کراچی کا پروڈیوسر نہیں سمجھتا۔ میرے لیے ریڈیو پاکستان کا مستقبل کا ڈائریکٹر جنرل ہے“۔ ہم اس کی باتوں پر ہنسنے لگتے مگر وہ کتنا سچ کہتا تھا۔ یہ احساس اب مجھے ہوتا ہے۔ وہ خود تو ساری زندگی کچھ حاصل نہ کر سکا‘ جس کے وہ خواب دیکھا کرتا تھا‘ مگر میں صدق دل سے یہ بات کہتا ہوں کہ ریاض فرشوری بہت بڑا آدمی تھا۔ دنیا نے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ جو تخلیقی صلاحیتیں اللہ تعالیٰ نے اس کو دی تھیں وہ میں نے کم لکھنے والوں میں دیکھیں۔ اس نے ریڈیو کے لیے اور بعد میں ٹیلی ویژن کے لیے جیسے جیسے معرکتہ آلارا ڈرامے لکھے‘ وہ بے حد اعلیٰ معیار کے تھے‘ مگر اس کی پذیرائی نہیں ہوئی۔ نہ اس کی زندگی میں‘ نہ اس کی موت کے بعد۔ خود اس نے کبھی یہ کوشش بھی نہیں کی‘ جو شہرت اور نام اس کو ملا وہ اسے خود ہی مل گیا اور پھر ایک دن وہ خاموشی سے مر گیا۔ مجھے تو معلوم بھی نہ ہوا وہ کب مرا‘ کیسے مرا؟ یہ 1983ء کی بات ہے۔ میں ان دنوں نیف ڈیک کا سربراہ تھا اور

کسی عالمی فلمی میلے میں شرکت کے لیے فرانس گیا ہوا تھا۔ کافی عرصہ ملک سے باہر رہ کر جب میں واپس آیا تو ریاض کو دنیا سے رخصت ہوئے دو تین ہفتوں سے زیادہ ہو چکے تھے۔ اخباروں میں اس کے انتقال کی خبریں چھپ کر پرانی ہو چکی تھیں۔ بھلا پھر مجھے کس طرح پتہ چلتا کہ میرا دوست اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ وہ تو یونہی اتفاقاً ایک روز میرے پاس دفتر میں کچھ فلمی لوگ آئے۔ وہ کسی تاریخی موضوع پر فلم بنانا چاہتے تھے۔ میں نے انہیں ریاض فرشوری کا نام بتایا کہ اس سے بہتر اس موضوع پر کوئی اور کہانی نہیں لکھ سکتا۔ تب ان میں سے کسی ایک نے کہا' آپ کو علم نہیں' ریاض کو تو وفات پائے مہینے سے زیادہ ہو گیا ہے۔ اس رات میں سو نہ سکا۔ میرا دوست اس دنیا کو چھوڑ کر چلا گیا اور مجھے معلوم بھی نہ ہوا۔ ریاض خان اس بات پر کتنا خفا ہو گا۔ اس کیساتھ گزارا ہوا ایک ایک دن' ایک ایک لمحہ میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ ہم نے کتنا طویل عرصہ ایک ساتھ گزارا تھا۔ وہ' میں اور حمید زمان...... ریڈیو پاکستان کراچی میں ہماری تکڈم مشہور تھی۔ سچ پوچھیں تو ہم تین ایسے دوست تھے جو ایک دوسرے کے بغیر نامکمل نظر آتے تھے۔

میں نے شروع میں لکھا تھا ریاض فرشوری کو اکثر لوگ پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ اس سے خائف رہتے تھے۔ اس کی زبان درازی سے ڈرتے تھے۔ ایسی محفلوں میں جانے سے اجتناب کرتے تھے جہاں ریاض موجود ہو...... مگر جو اس کے جاننے والے تھے' جو اس کو اپنے دل سے قریب رکھتے تھے' جنہیں اس کی صلاحیتوں' اس کے ادبی مرتبے کا احساس تھا' اس کے کردار اور عادتوں سے واقف تھے' انہیں اس کی ہر بات پسند تھی۔ جو اسے قریب سے جانتے تھے۔ انہیں علم تھا کہ ایسا اسلوب' ایسا طرز نگارش' ایسا تخلیقی ذہن رکھنے والا دانشور صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کے ایک دوست نے اس کے بارے میں کتنا صحیح لکھا ہے کہ اس کا ایک ہی اسلوب تھا۔ ایک ہی طریقہ تھا۔ کہانی میں بھی یہی اسلوب تھا۔ صحافت میں' ڈرامے میں' ناول میں' ترجمے میں ہر جگہ وہی اسلوب' وہی بے باکی' وہی خوبصورتی' وہ خیال کا نیا پن' نیا سچ' نیا جھوٹ۔ وہ کہتا تھا جہاں تھوڑی سی جگہ ملتی ہے میں کاغذ کی ایک جھگی ڈال لیتا ہوں۔ اس کا ایک ہی گھر تھا۔ وہ ادب تھا' شعر تھا' افسانہ تھا' ناول تھا' کالم تھا' ڈرامہ تھا۔ اس کی تحریروں میں زندہ لہو کی خوشبو تھی۔ اس کے فقرے ایک دوسرے سے اس طرح میچ کرتے تھے جیسے لڑکیوں کے دوپٹے فراک سے میچ کرتے ہیں۔ اس نے بہت لکھا۔ اس کے ریڈیو فیچر' ڈرامے

اور ٹیلی ویژن کھیل کے معیار ترین تحریروں میں شامل ہیں۔ ”دستک“، ”تین جھوٹے“، ”درد کی کوئی آواز نہیں“، ”زنجیر بدلتی رہتی ہے“، ”ریشمی رومال“، ”خون کے پھول“، ”ریشم کی چٹان“، ”دام خیال“، ”ہماری بستی“، ”تماشائی“ اور ٹیلی ویژن کا مقبول تاریخی سلسلہ وارڈوکوڈرامہ ”آزادی کے جرم“ اور ان کے علاوہ بہت کچھ اور...... مگر ہم نے اسے یاد نہیں رکھا۔ لوگوں نے اس کے بارے میں کچھ کیوں نہیں لکھا؟ کیا وہ مرجانے کے باوجود اس سے خوف زدہ تھے......؟

پچھلے دنوں جب میں نے چند منتخب شخصیتوں کے بارے میں لکھنے کا ارادہ کیا تو ایسے ناموں کی ایک مختصر سی فہرست بنائی، جن کے بارے میں کچھ لکھنا چاہتا تھا۔ فیض احمد فیض، زیڈ اے بخاری، خواجہ معین الدین، صادقین اور کچھ اور...... تب اچانک میں نے دیکھا کہ اس صف میں ریاض فرشوری بھی چپکے سے آکر کھڑا ہو گیا ہے۔ میں نے بڑے عرصے سے اسے نہیں دیکھا تھا، مگر وہ بالکل ویسا ہی تھا۔ لانبا قد، کالا رنگ، گھنے الجھے الجھے بال، اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں، خوبصورت چھوٹی سی ناک، ڈھیلی ڈھالی پتلون اور ملگجی سی قمیص پہنے...... وہ کھڑا ہنس رہا تھا۔ حسب معمول اس کے دانت پانوں کی زیادتی سے زردی مائل تھے اور اس کی مخصوص بو جس میں سگریٹ کے دھوئیں، کپڑوں کے میلے پن اور پسینہ کی بساند شامل ہوتی تھی، اس کے وجود سے لپٹی ہوئی تھی۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو کالی داس...... وہ ہنسا اور بولا، دیکھو میرا نام بھی اس فہرست میں شامل کر لو۔ کیا تم میرے بارے میں کچھ لکھنا نہیں چاہتے۔ میں نے کہا ”ریاض خان میں تمہارے بارے میں کیسے لکھ سکتا ہوں۔ بھلا کوئی اپنے بارے میں کچھ لکھ سکتا ہے؟ وہ زور سے ہنسا ”تم فقرے بازی میں مجھے بھی چت کر دیتے ہو۔ لیکن شاید ٹھیک کہتے ہو، تم۔ میں حمید زمان...... ہم تین تو اتنا وقت ایک ساتھ رہے کہ شاید یہ بھی یاد نہ رہا کہ کون سا واقعہ، کون سا فقرہ، کون سی واردات کس سے وابستہ ہے۔ تم واقعی میرے بارے میں کچھ نہیں لکھ سکتے۔ مگر یار آغوں ایک بات بتاؤ۔ یہ باقی سب کو کیا ہو گیا ہے۔ کسی نے بھی تو میرے بارے میں نہیں لکھا۔ کیا میں اتنا چھوٹا آدمی تھا۔“ اس نے اتنے دکھ سے کہا کہ میرا دل بھر آیا۔ میں نے کہا ”ریاض خان تم بہت بڑے آدمی تھے۔ اتنے بڑے کہ کسی کی ہمت نہیں پڑتی کہ تمہارے بارے میں کچھ لکھ سکے۔ تم ہی تو کہا کرتے تھے۔ یہ سب بونے ہیں۔ مجھ سے جلتے ہیں۔ مجھے پسند نہیں کرتے، صرف اس لیے کہ میں وہ

سب کچھ نہیں کرتا جو یہ کرتے ہیں۔ یاد ہے نا تمہیں...... ایک بار ایک بڑے ادبی سیمینار میں جو شاید رائٹر گلڈ نے منعقد کیا تھا' تم نے کسی بڑے اونچے عہدے والے ادیب کے پرخچے اڑا دیئے تھے اور اس کے بعد بلا اعلان تمہیں اس قومی ادبی انجمن سے بے تعلق کر دیا گیا تھا۔ ریاض نے اپنی مخصوص اپنائیت والی نظروں سے مجھے دیکھا اور بڑے پیار سے کہا "یار تم تو سنجیدہ ہو گئے۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔ تم میرے بارے میں لکھتے ہو یا نہیں لکھتے میرے لیے یہ اہم نہیں ہے میرے لیے تو صرف یہ اہم ہے کہ تم اب تک مجھے یاد کرتے ہو"

میری آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔ ایک دھند سی پھیل گئی اور جب یہ دھند صاف ہوئی تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ مگر میں نے اپنے سامنے میز پر پڑے ہوئے کاغذوں کی طرف دیکھا تو شخصیتوں کی فہرست میں ریاض فرشوری کا نام لکھا ہوا تھا۔

کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے مگر میں بہانگ دہل یہ کہنے کو تیار ہوں کہ ریاض فرشوری اس ملک کا ایک بڑا ادیب تھا۔ دانشور تھا۔ کہانی نگار تھا۔ اس کو ڈرامہ لکھنے کا ایسا فن آتا تھا جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا۔ اس کو زبان پر جو عبور تھا اور جس طرح کی عبادت وہ لکھتا تھا' میں نے اردو کے کم ادیبوں میں یہ وصف دیکھا۔ وہ بہت پڑھا لکھا آدمی تھا' مگر اپنے علم و فضل کا اظہار کرنا ضروری نہیں سمجھتا تھا۔ میں نے اس کی گفتگو سنی ہے۔ ہم نے لمبے لمبے سفر ایک ساتھ کیے۔ کراچی' حیدر آباد' خیر پور' سکھر' بہاولپور' ملتان' لاہور' گوجرانوالہ' سیالکوٹ' ڈیرہ غازی خان' میانوالی' کوہاٹ' بنوں' پشاور' لنڈی کوتل' کوئٹہ' چمن اور جانے کہاں کہاں ہم ایک ساتھ گھومے ہیں۔ ہوائی جہاز' ریل گاڑی' بس' کوچ' تانگہ' پیدل' غرض ہر قسم کے ذرائع استعمال کرتے ہوئے اور آپ اندازہ کر سکتے ہیں جب اتنے لمبے سفر پر لوگ نکلتے ہیں اور دن رات ساتھ رہتے ہیں تو باتوں کے سوا اور کیا کرتے ہیں۔ لہٰذا میں نے اس ساتھ میں اس کی اتنی باتیں سنی ہیں' جو شاید کسی اور نے نہ سنی ہوں۔ رات رات بھر وہ بولتا رہتا تھا' اور میں سنتا رہتا تھا۔ کون سا موضوع ایسا تھا جس پر اس کو عبور حاصل نہ ہو۔ ڈرامہ' شاعری' ناول' تنقید' تاریخ' مذہب' سیاست' نفسیات' فلسفہ' دیومالائی داستانیں اور جدید افسانہ...... غرض وہ اپنی باتوں سے مجھے حیرت زدہ کر دیتا تھا۔ میں اس سے کہتا تھا یار ریاض خاں یہ سب سرمایہ تم نے چھپا کر کیوں رکھا ہے۔ تم یہ جو کچھ لکھتے ہو...... اس نے میری بات کاٹ کر کہا "میں لکھتا کہاں ہوں' میں تو قلم کا مزدور ہوں' ٹھیکہ پر کام کرتا ہوں۔ مالکان اور ٹھیکیداران

جو کہتے ہیں وہ کرتا جاتا ہوں۔ ہاں کبھی غم روزگار سے فرصت ملی تو پھر لکھوں گا اور یہ جو دو چار ڈرامے' کچھ کالم' چند فیچر ایسے لکھ لیتا ہوں جن کو لکھ کر ذرا اطمینان اور مسرت ہوتی ہے تو یہ تو تمہارے' حمید زمان کے اور چند دوسرے دوستوں کے سبب ہے یا پھر اس ملک' اس زمین' اس مٹی کی محبت ہے جو کچھ ایسی چیزیں لکھوا لیتی ہے"۔ ریاض بزاز بردست محب وطن تھا۔ میں نے 1965ء اور 1971ء کی جنگوں میں اس کے لکھے ہوئے تمثیلچے' خاکے' کالم' تبصرے پڑھے اور سنے ہیں۔ ان تحریروں میں اس کے دل کی دھڑکن اور اس کا خون جگر شامل ہوتا تھا۔ اس کے مشہور ریڈیو پروگرام "کیا کہتے ہو مہاراج......" اور "جواباً عرض ہے" جنگ کے دنوں میں نشر ہونے والے بے حد مقبول پروگراموں میں شامل تھے۔ اس کی ان تحریروں میں اتنی تیزی اور آگ ہوتی تھی کہ دشمن کے لیے اس کے الفاظ توپ کے گولوں سے کم نہیں تھے۔ اس کو اس بات کا اعتراف تھا کہ اس کی تحریریں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک اس کے گھر کے چولہے کو گرم رکھنے کے لیے اور دوسری روح میں بھڑکنے والے شعلے کو روشن رکھنے کے لیے۔

ریاض بڑا محفل آراء آدمی تھا۔ اسے اچھے لوگوں کی کمپنی میں رہنا بے حد پسند تھا۔ خواہ وہ دوست آشنا ہوں یا عزیز رشتہ دار۔ اپنے اہل خاندان سے اسے بے تحاشہ محبت تھی۔ اپنی شریک حیات اور اپنے بچوں کے لیے وہ دنیا کا ہر کام کرنے کو تیار رہتا۔ میں نے اتنی محبت کرنے والے شوہر اور شفقت کرنے والے باپ کم دیکھے ہیں۔ یہی حساب دوستوں کے ساتھ تھا۔ ہم جو سلوک چاہیں اس کے ساتھ کریں مجال ہے جو اس کے ماتھے پر شکن آئے یا وہ کسی بات کا برا منائے۔

اس کے دوستوں نے اس کے رنگ کے حوالے سے طرح طرح کے نام رکھے ہوئے تھے۔ حمید زمان اس کو "کالا ناگ" کہتا تھا۔ سلیم احمد "کالی چرن" طفیل احمد جمالی "کالا باغ" عمر مہاجر جو خود بھی بہت کالے رنگ کے تھے اس کو "دوسرا کالا" کہہ کر پکارتے تھے چونکہ "پہلا کالا" وہ خود کو سمجھتے تھے۔ میں کبھی کبھی "کالی داس" کے نام سے پکارتا تھا۔ وہ پیار سے مجھے "آغوں" کہتا تھا...... اس میں اور خوبیوں کے علاوہ ایک بہت بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ دوستوں کی کسی بات کا برا نہیں مانتا تھا۔ مثلاً حمید زماں جو ریاض کے لیے صرف خان صاحب تھے' اکثر اس کو کہتے تھے یار کم از کم ہفتہ میں ایک دن تو نہا لیا کرو۔ جانتے ہو مجھے اپنے دفتر میں

بیٹھے ہوئے اس وقت تمہاری آمد کا پتا چل جاتا ہے جب تم ریڈیو سٹیشن کے گیٹ میں داخل ہوتے ہو۔ تم سے بہت پہلے تمہارے بدن کی بو آتی ہے۔ وہ ہنستا رہتا تھا' مگر کبھی ایسی باتوں پر دھیان نہ دیتا۔ پان کھانے کی زیادتی نے اس کے دانتوں کو سیاہی مائل کر دیا تھا۔ ناخن ترشوانے کا کبھی اسے خیال ہی نہیں آیا۔ بال اس وقت تک بڑھتے جاتے جب تک ہم میں سے کوئی اسے بار بر شاپ میں دھکا دے کر نہ بھیجتا۔ کپڑوں پر استری کرنے کے وہ سخت خلاف تھا اور جوتوں پر پولش بھی کی جاتی ہے' اس کا شاید اس کو علم ہی نہیں تھا۔ ویسے تو میں اور زمان خان بھی کون سے طہارت کے پتلے تھے' مگر بقول زمان خان' ریاض فرشوری کے سامنے تو ہم انگریز لگتے ہیں۔ وہ ہماری ساری باتیں اور جملے سنتا اور ہنس دیتا' لیکن تنقید اور تمسخر کا یہ حق اس نے صرف اپنے قریبی دوستوں کو دیا ہوا تھا۔ اگر کوئی اور اس کی شخصیت' اس کے کردار یا اس کے عادات و اطوار پر تنقید کرنے کی جرأت کرتا تو ریاض خان اس شخص کی کھال اتار دیتا۔ اس کے پرخچے اڑا دیتا اور ایسے ایسے فقرے چست کرتا کہ وہ شخص کہیں کا نہ رہتا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایسے بہت سے معرکے دیکھے ہیں اور بڑے بڑے طرم بازوں کو اس کے سامنے ناک رگڑتے دیکھا ہے۔ وہ اس معاملے میں بڑا بے درد تھا۔ جب ایک بار کسی سے اس کی زیادتی کا بدلہ لینے کا فیصلہ کر لے تو پھر وہ بڑا بے رحم ہو جاتا تھا۔

میرا تو جتنا اس کا ساتھ رہا' اس حوالے سے کتنے واقعات ہیں' کتنی باتیں ہیں' کتنے قصے ہیں جو اس خاکہ میں شامل کیے جا سکتے ہیں' مگر میں نے صرف دو چار واقعات لکھنے کا فیصلہ کیا ہے' جن سے ریاض فرشوری کی شخصیت اور اس کے کردار کا اندازہ ہو سکے۔

میں اب گزشتہ تیس برسوں سے اسلام آباد میں رہتا ہوں اور مجھے بلا جھجک یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ میں اس شہر کی محبت میں گرفتار ہوں۔ میرا خیال ہے اس قوم کے لیے ایوب خان کا سب سے قیمتی تحفہ یہ نیا دارالحکومت ہے' جسے ہم اسلام آباد کہتے ہیں۔ کراچی سے اسلام آباد دارالحکومت کی منتقلی 62-1961ء میں ہوئی۔ کہنے کو تو یہ کہا گیا کہ کراچی کی رطوبت زدہ آب و ہوا ملک کے دارالحکومت کے لیے نامناسب ہے۔ اس شہر میں رہنے والوں کی کارکردگی کم ہو جاتی ہے۔ پھر ہر روز شہر کی آبادی میں جس رفتار سے اضافہ ہو رہا ہے تو کچھ عرصہ بعد یہ شہر ناقابل انتظام ہو جائے گا۔ یہ بھی کہا گیا کہ دفاعی نقطہ نظر سے بھی ساحل سمندر پر واقع ہونے اور سرحد سے قریب ہونے کے باعث مناسب یہی

ہے کہ ملک کا صدر مقام کراچی سے منتقل کیا جائے۔ ظاہر ہے کراچی کے رہنے والوں کو اور مشرقی پاکستان سے آئے ہوئے بنگالیوں کو ان خیالات سے اتفاق نہیں تھا۔ اہل شہر کا کہنا یہ تھا کہ ایوب خان کو ان کے مشیروں نے یہ سمجھایا ہے کہ جب تک دارالحکومت کراچی میں ہے، حکومت پر مکمل طور پر اہل کراچی کا قبضہ رہے گا۔ سرکاری محکموں میں زیادہ تر ملازمتیں صرف اہل کراچی کو ملتی ہیں اور ملتی رہیں گی۔ خاص طور پر چھوٹی تنخواہوں کے ملازمین تو سب کے سب اسی علاقے کے ہیں' چونکہ ڈرائیور' مالی' چپڑاسی' کلرک' ٹائپسٹ وغیرہ جیسی آسامیوں کے لیے ملک کے دور دراز علاقوں سے کوئی یہاں نہیں آئے گا۔ اسی طرح درمیانے درجہ کی آسامیاں بھی کراچی کے تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل طالب علموں کے حصہ میں آتی ہیں اور پھر یہی درمیانے درجہ کے ملازمین ترقی کرتے کرتے اعلیٰ عہدوں پر پہنچ جاتے ہیں اور پالیسی معاملات میں بھی انہی کا عمل دخل ہوتا ہے۔ معلوم نہیں کراچی والوں کے یہ تاثرات اور خدشات حقیقت پر مبنی تھے یا نہیں' مگر حکومت نے جب اس سلسلہ میں ایک کمیشن لیفٹیننٹ جنرل یحییٰ خان کی سربراہی میں مقرر کر دیا تو یہ بات واضح ہو گئی کہ دارالحکومت کی تبدیلی اب ناگزیر ہے۔ چند برس بعد لاہور میں جب بیگم زاہدہ خلیق الزماں مغربی پاکستان کی کابینہ میں وزیر تھیں' میری ایک شام ان کے شوہر اور پاکستان تحریک کے معروف رہنما چودھری خلیق الزماں سے ملاقات ہوئی۔ چودھری صاحب اس روز بڑے موڈ میں تھے اور مزے مزے کے قصے سنا رہے تھے۔ ذکر ایوب خان کا چل نکلا کہ چودھری خلیق الزماں ہی وہ لیڈر تھے' جن کے کہنے پر ایوب خان نے کنونشن مسلم لیگ بنائی تھی اور ان کو پہلا صدر منتخب کیا گیا تھا۔ چودھری خلیق الزماں کے بارے میں عام تاثر یہ تھا کہ وہ ایوب خان کے سب سے بڑے چمچے ہیں۔ اس الزام کی صفائی میں چودھری صاحب نے جو نہایت خوش گفتار اور محفل آرا انسان تھے' فرمایا "آپ لوگوں کو احساس نہیں وہ کیسا کڑا وقت تھا' پہلا مارشل لاء تھا اور ایک مضبوط اور عالی حوصلہ ڈکٹیٹر قوم پر مسلط تھا۔ ان حالات میں سپین اور پرتگال کی طرح ملک کو کم از کم تیس چالیس برسوں تک فوجی ڈکٹیٹر شپ سے نجات ملنا ناممکن تھا۔ یاد رکھیں جب کبھی پاکستان کی صحیح تاریخ لکھی جائے گی تو میرا سب سے بڑا کارنامہ یہ قرار دیا جائے گا کہ میں نے جنرل ایوب خان کے سر سے فوجی ٹوپی اتروا کر اسے جناح کیپ پہنوا دی اور وہ جنرل ایوب کی بجائے صدر ایوب

کہلائے جانے میں زیادہ خوشی محسوس کرنے لگا...... "بات کہاں تک درست ہے، میں کچھ نہیں کہہ سکتا، مگر سمجھ میں آتی ہے۔ ایوب خان کا ذکر چلا تو کسی نے چودھری صاحب سے کراچی سے دارالحکومت کی منتقلی کی بات بھی پوچھ لی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ کراچی سے اسلام آباد منتقلی کا اصل سبب یہ تھا کہ ایوب خان کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ کراچی والے بڑے زیرک، ذہین، منصوبہ بندی کے ماہر اور سازشی لوگ ہیں اور جب اور جس وقت چاہیں حکومت کا تختہ الٹ سکتے ہیں۔ یہ بات کچھ اتنی غلط بھی نہیں تھی۔ 1950ء کے عشرے میں پے در پے حکومتیں بدلتی رہیں اور ہر بار اصل سبب یہی قرار دیا جاتا تھا کہ اہل کراچی جب بھی چاہتے ہیں حکومت بدل دیتے ہیں۔ جب چاہتے ہیں جس وزیر اعظم کو چاہتے ہیں اقتدار سے ہٹوا دینے کا سامان مہیا کر دیتے ہیں۔ لہٰذا بقول چودھری خلیق الزماں ایوب خان کو ان کے مشیروں نے یہ بات باور کرا دی تھی کہ اگر اپنی حکمرانی کو طول دینا ہے تو کراچی چھوڑ دیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کراچی کے دارالحکومت ہونے کے باوجود بھی بحیثیت صدر مملکت ایوب خان کا زیادہ وقت راولپنڈی میں گزرتا تھا اور راولپنڈی کا کمانڈر انچیف ہاؤس عملی طور پر ایوان صدر بن چکا تھا۔ ہر حال بات کہیں اور چلی گئی۔ آج اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام آباد دنیا کے خوبصورت ترین شہروں میں شمار کیا جاتا ہے اور شاید اس شہر کا وجود ہی ایوب خان کے دور حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ مرگلہ کی سرسبز پہاڑیوں کے دامن میں پوٹھوہار کی وادی میں آباد یہ بڑھتا پھیلتا شہر ایسا ہے جہاں زمینوں اور املاک کی قیمتیں ملک میں سب سے زیادہ ہیں۔ اسلام آباد میں پلاٹوں کی الاٹمنٹ اب ایک مستقل مسائل کا ذریعہ بن چکی ہے۔ گزشتہ برسوں میں کتنی ہی حکومتیں اور سربراہ ایسے گزرے جن پر بددیانتی اور بے ایمانی کے بڑے الزامات میں ناجائز طور پر اپنے عزیزوں، رشتہ داروں اور دوستوں کو اسلام آباد میں پلاٹ الاٹ کرنے کا الزام ضرور ہوتا ہے، مگر 1960ء کے عشرے میں حالات کچھ اور تھے۔ بات چونکہ ریاض فرشوری کی ہو رہی ہے تو مجھے یہ واقعہ اسی کے حوالے سے یاد آیا۔ غالباً 1963ء کا ذکر ہے کہ صدر ایوب نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اسلام آباد دارالحکومت کی منتقلی کی سالگرہ کے موقع پر ایک براڈ کومنٹری پروگرام ریڈیو پاکستان سے نشر کیا جائے۔ یہ یاد رکھئے کہ ان دنوں ٹیلی ویژن کا وجود ہی نہیں تھا۔ لہٰذا ابلاغ کا سب سے موثر اور اہم ادارہ ریڈیو پاکستان ہی تھا۔

صدر مملکت کی خواہش تھی کہ یہ پروگرام پاکستان ریڈیو کے کسی بہت اچھے اور لائق پروڈیوسر کو سونپا جائے اور ایک گھنٹہ طویل دورانیہ کے اس دستاویزی پروگرام میں اسلام آباد کی منظر کشی اس کی تاریخ' جغرافیہ اور یہاں کے رہنے والوں کے تاثرات' اہم لوگوں کے انٹرویوز' غرض سب کچھ شامل کیا جائے۔ پھر یوں ہوا کہ ایک صبح میں ذرا دیر سے ریڈیو سٹیشن پہنچا تو بڑی شدومد سے میری تلاش ہو رہی تھی۔ میں بھاگم بھاگ سٹیشن ڈائریکٹر کے دفتر میں گیا تو مجھے بتایا گیا کہ اسلام آباد پر ڈوکومنٹری پروگرام پروڈیوس کرنے کے لیے میرا انتخاب کیا گیا ہے اور مزید یہ کہ فیصلہ خود صدر ایوب نے کیا ہے۔ صدر ایوب سے میری جان پہچان کا سبب یہ تھا کہ کراچی میں ان کی مصروفیات کی ریڈیو رپورٹ مرتب کرنے کی ذمہ داری میرے سپرد تھی۔ میں ہر ایسی محفل اور جلسے میں موجود ہوتا تھا' جہاں صدر عالی کو تقریر کرنا ہوتی تھی۔ چونکہ کافی عرصہ وہ مجھے یہ کام کرتے دیکھتے رہے تھے' اس لیے مجھ سے بخوبی طور پر واقف ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ مجھے میرا نام لے کر پکارتے تھے۔ اکثر خود ہدایات بھی دیا کرتے تھے کہ تقریر کا فلاں حصہ بڑا اہم ہے' یا فلاں فقرے نکال دیں۔ شاید یہی وجہ ہوگی کہ اسلام آباد کی ڈوکومنٹری کے سلسلہ میں انہیں میرا نام یاد آیا۔ جب سٹیشن ڈائریکٹر صاحب نے مجھے یہ بتایا اور کہا کہ کراچی سٹیشن کے لیے یہ بڑا اعزاز ہے کہ سربراہ مملکت نے اس کام کے لیے تمہارا انتخاب کیا ہے تو میں نے بھی ذرا نخرے دکھانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے کہا "سر یہ ٹھیک ہے' مگر اس اہم پروڈکشن کے لیے میری کچھ شرائط ہوں گی" مثلاً؟ ڈائریکٹر صاحب کو میرا جواب کچھ غیر متوقع معلوم ہوا۔

"مثلاً یہ کہ پروگرام کتنے عرصہ میں پروڈیوس ہوگا اس کا فیصلہ میں کروں گا۔ اس کا بجٹ ریڈیو کے مروجہ اصولوں پر مبنی نہیں ہوگا بلکہ اس کے لیے خصوصی معاوضے ادا کرنا پڑیں گے۔ پروگرام لکھنے والے اور اس میں حصہ لینے والوں کا انتخاب میں کروں گا اور کسی افسر اعلیٰ کی منظوری درکار نہیں ہوگی۔ اس سلسلہ میں شاید ایک سے زیادہ بار اسلام آباد جانا پڑے گا اور یہ سفر میں اور میرا اسکرپٹ رائٹر ہوائی جہاز سے کریں گے۔ (ان دونوں ہوائی سفر کے لیے ہیڈ آفس سے خصوصی اجازت لینا پڑتی تھی) جب تک پروگرام مکمل نہ ہو جائے مجھ سے اس کے ریکارڈ شدہ حصہ سنانے کے لیے نہیں کہا جائے گا' وغیرہ وغیرہ۔"

اسٹیشن ڈائریکٹر جو بڑے شریف آدمی تھے' حیرت سے میری طرف دیکھتے رہے اور

جب میں بات ختم کر چکا تو مسکراتے ہوئے بولے "چائے پیو گے یا کافی؟ تمہاری ساری شرائط مجھے...... بلکہ یوں سمجھو' صدر پاکستان کو منظور ہیں۔"

میں نے پروگرام کی تیاریاں شروع کر دیں اور سب سے پہلا فیصلہ یہ کیا کہ ریاض فرشوری میرا اسکرپٹ رائٹر ہو گا۔ ہم دونوں نے بڑی محنت سے پروگرام پر کام شروع کیا اور جب سکرپٹ کی کچھ شکل نکل آئی تو اسلام آباد جانے کا پروگرام بنایا۔ 63-1962ء کا اسلام آباد کچھ اور ہی تھا۔ صرف آب پارہ ہوا کرتا تھا' جہاں سب سے بڑا دفتر سی ڈی اے کا تھا۔ چھوٹے درجہ کے سرکاری ملازمین کے لیے لال کوارٹر بڑی تعداد میں تعمیر ہو چکے تھے' جن میں تقریباً سارے ہی کوارٹروں میں کراچی سے تبادلہ ہو کر آئے ہوئے سرکاری ملازمین مقیم تھے۔ شہر میں ہر طرف تعمیر کا کام جاری تھا۔ سڑکیں بن رہیں تھیں۔ ٹیلی فون کے تار بچھائے جا رہے تھے۔ بجلی کے کھمبے نصب ہو رہے تھے۔ سیکرٹریٹ کی عالیشان عمارت کی تزئین کی جا رہی تھی۔ میں اور ریاض ایک ہفتہ سے زیادہ یہاں ٹھہرے...... اگرچہ سی ڈی اے والوں نے ہماری رہائش کا انتظام کیا ہوا تھا' مگر اس ویرانے میں رہائش پذیر ہونے کی بجائے ہم دونوں نے اپنے یار عزیز محمد عمر کے گھر ٹھہرنے کو ترجیح دی' جو ان دنوں راولپنڈی ریڈیو سٹیشن پر متعین تھے۔ ہم دونوں روز صبح سی ڈی اے کی وین میں بیٹھ کر اسلام آباد آتے۔ زیر تعمیر شہر میں گھومتے اور اپنے سکرپٹ کے مطابق ریکارڈنگ کرتے۔ سب سے مشکل مرحلہ یہاں کے مکینوں سے انٹرویو کا تھا۔ کراچی سے آئے ہوئے یہ لوگ جن میں زیادہ تر بنگالی تھے' کسی صورت بھی اس نئے شہر کی تعریف کرنے کو تیار نہیں تھے۔ جب بھی ہم یہاں کی زندگی' طرز بود و باش اور موسم وغیرہ کے بارے میں بات کرنے کی کوشش کرتے وہ ہمیں لن طعن کرنے لگتے۔ اس جگہ کی طرح طرح کی برائیاں کرتے وقت ایسی زبان اور ایسے الفاظ استعمال کرتے کہ جو پالیسی کے علاوہ اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی ناقابل نشر تھے۔ سب سے زیادہ مشکل بنگالیوں کے انٹرویو میں تھی۔ ان میں سے کوئی بھی تعریف کا ایک لفظ کہنے کو تیار نہ تھا۔ ذرا بات کرو تو وہ اپنے مخصوص لہجہ میں بگڑ کر بولتے "شالا ہم کو ادھر جنگل میں لا کر چھوڑ دیا ہے۔ یہ سب پنجابی لوگوں کا کام ہے۔ ابھی آپ کو ہم دکھائے گا' جب سہروردی کا حکومت آئے گا' یہ کیپٹل ہوائی جہاج سے شفٹ ہو کر واپس جائے گا وغیرہ وغیرہ...... جب اسلام آباد میں رہنے والے کسی بھی بنگالی شہری سے معاملہ نہ بن سکا تو ریاض فرشوری کو ایک

ترکیب سوجھی۔ اس نے محمد عمر سے کہا تمہارے راولپنڈی ریڈیو سٹیشن پر جتنے بنگالی کام کرتے ہیں' کل ان سب کو جمع کرلو ہم ان کے انٹرویو ریکارڈ کریں گے۔ ترکیب کامیاب رہی۔ ظاہر ہے وہ سب ریڈیو کے ملازم تھے اور ہمارے ساتھی تھے۔ ہماری مجبوریوں کو بھی سمجھتے تھے' لہٰذا جو بھی ان سے کہلوانا چاہا' انہوں نے کہا۔ اگرچہ ان میں سے بہت سے راولپنڈی میں رہتے تھے' مگر انہوں نے بھی اپنے انٹرویو میں اسلام آباد کی تعریف کی اور کہا کہ دنیا کا سب سے خوبصورت اور پر فضا شہر ہے بلکہ ایک نے تو یہ تک کہہ دیا "ہم کو تو اسلام آباد پر زنت (جنت) کا شبہ ہوتا ہے۔"

ڈوکومنٹری پروگرام بنتا گیا۔ سارے مرحلوں سے گزرنے کے بعد ہم نے آخری انٹرویو کے لیے سی ڈی اے کے چیئرمین سے وقت مانگا۔ ان دنوں ڈبلیو اے شیخ اس عہدے پر فائز تھے۔ انتہائی لائق اور شریف سول سروس کے افسر تھے۔ ہم نے ان کے دفتر میں ایک طویل انٹرویو ان کے ساتھ ریکارڈ کیا۔ ریاض نے بڑے ٹیڑھے میڑھے سوال پوچھے' مگر ان کو اپنے کام پر اتنا عبور حاصل تھا اور ہر معاملہ سے اتنے باخبر تھے کہ ہر سوال کا نہایت اطمینان بخش جواب دیتے رہے۔

انٹرویو کے اختتام پر ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ ریاض فرشوری نے کہا "شیخ صاحب' سچی بات یہ ہے کہ اس تمام عرصہ میں ہم نے جتنے بھی لوگوں سے بات کی' آپ ہی واحد شخص ہیں جس نے خلوص اور صدق دل سے اس شہر کی تعریف کی ہے......" شیخ صاحب نے بھی ہم دونوں کا شکریہ ادا کیا اور جب ہم نے اجازت چاہی تو بولے "ذرا ٹھہریے!" پھر انہوں نے ٹیلی فون پر اپنے سیکرٹری سے کہا "دو سیٹ لے آیئے...... ذرا دیر بعد ایک بزرگ الاٹ منٹ فارموں کے دو سیٹ لیے کمرے میں داخل ہوئے۔ شیخ صاحب نے ایک مجھے دیا' دوسرا ریاض کو اور کہا ان کو پر کر دیجئے۔

"یہ کیا ہے؟" ریاض نے دریافت کیا۔

"کچھ بھی نہیں' اب آپ نے اتنی محنت اور محبت سے یہ پروگرام بنایا ہے تو ہمارا بھی کچھ فرض ہے۔"

"مطلب؟" ریاض کچھ جزبز سا تھا۔

"یہ آپ دونوں کے لیے ایک ہزار گز کے پلاٹوں کے فارم ہیں۔ ہم شالیمار کے چھ

نمبر سیکٹر میں آپ دونوں کو ایک ایک پلاٹ الاٹ کرنا چاہتے ہیں......

میں نے ریاض کی طرف دیکھا۔ اس نے میری طرف اور ہم دونوں بے ساختہ قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ ریاض نے اپنے مخصوص انداز میں خود کو چھوٹی سی گالی دیتے ہوئے کہا......

''واہ شیخ صاحب، ہم آپ کے لیے اتنا اچھا پروگرام بنا رہے تھے اور آپ ہمیں اس قدر...... سمجھتے ہیں کہ اس جنگل بیابان میں زمین دے رہے ہیں۔ ویسے بھی ہمارے پاس اتنے پیسے کہاں ہیں کہ زمین خریدنے کا سوچیں۔'' شیخ صاحب نے لاکھ سمجھایا کہ یہ بہت سستی زمین ہے۔ صرف چھ ہزار روپے میں ایک ہزار گز کا پلاٹ ملے گا۔ سب سے بہتر علاقہ میں جگہ دوں گا اور پھر میں اپنے خصوصی اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے آپ دونوں کو آسان قسطوں پر ادائیگی کی اجازت دوں گا، مگر ریاض نے اور میں نے ایک نہ سنی۔ ہم دونوں متواتر ہنستے رہے اور فارم ان کی میز پر چھوڑ کر خدا حافظ کہہ کر نکل آئے۔ راستے بھر ریاض قہقہے لگاتا ہا ''یار آغا خان ذرا سوچو، کراچی سے ہزار میل دور اس ویرانے میں ہی ہم نے مکان بنانا ہے۔ لاحول ولا......'' اس بات کو پینتیس سال گزر چکے ہیں۔

اب بھی جب کبھی میں ایف سیکس کے سیکٹر سے گزرتا ہوں تو مجھے یہ واقعہ بے اختیار یاد آتا ہے۔ ریاض خان نے کس طرح ہم دونوں کو کروڑ پتی بننے سے بچالیا ورنہ ایک ہزار گز کے پلاٹ کی قیمت آج اس علاقے میں چھ ہزار سے بڑھ کر، کروڑوں تک پہنچ چکی ہے۔ لیکن مزہ یہ ہے کہ ساری زندگی نہ کبھی مجھے اور نہ ریاض کو اپنے فیصلہ پر افسوس ہوا۔ یہ تھا ریاض فرشوری، فقیر...... ملنگ...... درویش صفت اور اپنے فیصلے پر نادم نہ ہونے والا۔

مجھے ایک اور دلچسپ واقعہ یاد ہے۔ ایک روز یوں ہوا کہ شام کے بعد مجھے گھر پر پیغام ملا کہ رات کے بارہ بجے صدر ایوب کسی بیرونی دورے سے واپس آرہے ہیں اور ایر جنسی میں ایئرپورٹ پر ان کے ''فقید المثال'' استقبال کا انتظام کیا جارہا ہے، لہٰذا ریڈیو پاکستان کو حکم ملا ہے کہ ایئرپورٹ کی اس ساری کارروائی کو ریکارڈ کیا جائے اور صبح کے ٹرانسمیشن میں قومی رابطہ کے پروگرام میں نشر کیا جائے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب محترمہ فاطمہ جناح کے صدارتی امیدوار کے طور پر نامزدگی کا چرچا تھا اور ایوب خان خاصے نروس تھے۔ مجھے جب اپنی ڈیوٹی کا علم ہوا تو میں نے افسران سے یہ اجازت بھی لے لی کہ اس پروگرام کی ترتیب و تحریر کے لیے مجھے ایک سکرپٹ رائٹر کی ضرورت بھی ہوگی اور اس کام کے لیے میں ریاض فرشوری کو

اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ اجازت مل گئی اور سارے انتظامات کرنے کے بعد میں اور ریاض ریکارڈنگ کی آؤٹ سائیڈ براڈکاسٹ وین (جسے ریڈیو کی زبان میں او بی وین کہا جاتا ہے) میں سوار ہو کر دس بجے رات ایئرپورٹ کے لیے روانہ ہوئے۔ اب تو ریکارڈنگ کی جدید ترین مشین اور چھوٹے چھوٹے ٹیپ ریکارڈر آگئے ہیں مگر آج سے چالیس برس پہلے یہ کام منی بس کی برابر ایک بہت بڑی وین کے ذریعے کیا جاتا تھا۔ ریڈیو کی نیلے رنگ کی اس بڑی او بی وین پر ریڈیو پاکستان کا لوگو بھی بنا ہوا تھا اور بڑے جلی عربی حروف میں "قول والناس حسنا" لکھا تھا۔ ایئرپورٹ جاتے ہوئے راستے میں حیدر آباد کالونی کے پاس ریاض خاں نے ڈرائیور سے کہا کہ یار ذرا موڑ پر گاڑی روکو' میرے پانوں کا سٹاک ختم ہو گیا ہے۔ ڈرائیور نے حسب ہدایت گاڑی روک لی اور ریاض خاں نکڑ والی دکان پر پان بنوانے چلے گئے۔ میں وین کی اگلی نشست پر بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر میں میں نے محسوس کیا کہ ایک ایک کر کے لوگ ہماری وین کے گرد جمع ہوتے جا رہے ہیں۔ مجھے ذرا تشویش سی ہوئی' چونکہ کراچی شہر میں ایوب خاں کی مخالفت میں دبے دبے احتجاج کا آغاز ہو چکا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا جلدی سے جاؤ اور ریاض صاحب کو بلا لاؤ' مجھے معاملہ گڑبڑ نظر آتا ہے۔ ہمارا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں ہے۔ ڈرائیور نے سڑک کے دوسرے کنارے پر پان کی دکان کے پاس کھڑے ریاض فرشوری کو میرا پیغام پہنچایا۔ اس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔ حالات کا اندازہ لگایا اور بڑے اطمینان سے ہاتھ ہلا کر اشارہ کیا کہ ابھی آتا ہوں۔ جب ڈرائیور واپس آکر اپنی سیٹ پر بیٹھ رہا تھا تو قریب کھڑے کسی آدمی نے اس سے دریافت کیا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ اس نے کہا ایئرپورٹ' بس پھر کیا تھا لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں اور دیکھتے دیکھتے ہجوم بڑھنے لگا۔ لوگ دبے دبے لہجوں میں ہماری طرف اشارے کر کے کہنے لگے' یہ ایوب خان کے چمچے ہیں۔ میں چونکہ او بی انچارج تھا اور ساری ذمہ داری میری تھی۔ اس لیے میں بے حد گھبرایا کہ اگر انہوں نے کچھ توڑ پھوڑ کر دی تو کیا ہوگا۔ ہجوم بڑھتا گیا۔ شور بھی بڑھتا گیا اور ریاض فرشوری بڑے اطمینان سے پنواڑی سے پان بنواتا رہا۔ میرا دل گلے میں دھڑک رہا تھا کہ اب کچھ ہوا اور اب کچھ ہوا۔ ریاض نے صورت حال کا اندازہ کر لیا اور جب وہ پانوں کا بنڈل لے کر واپس وین کی طرف آیا تو میں نے دیکھا اس نے اس ہجوم میں سے ایک باریش بزرگ کا بازو تھاما اور ان سے باتیں کرتا ہوا انہیں او بی وین کی دوسری طرف لے گیا۔ ذرا دیر بعد وہ بزرگ

واپس آئے۔ انہوں نے خدا جانے مجموع سے کیا کہا کہ سب وین کے سامنے سے ہٹ گئے اور ریاض آرام سے دروازہ کھول کر میرے ساتھ آ بیٹھا اور ہماری وین ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہوگئی۔ میری جان میں جان آئی تو میں نے ریاض سے پوچھا یہ سب کیسے ہوا؟ بولا' مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ ہجوم پھر بھی سکتا ہے' لہٰذا میں نے ایک بزرگ کو تاڑا' ان کو وین کی دوسری طرف لے جا کر جلی حروف میں لکھی ہوئی وہ آیت دکھائی اور کہا یہ جنازے اٹھانے والی گاڑی ہے۔ ایئرپورٹ پر لندن سے ایک میت بذریعہ جہاز آ رہی ہے۔ ہم لوگ وہیں جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے بزرگ نے باقی لوگوں کو تنبیہ کی اور ریاض سے معذرت چاہی۔ ہم دونوں ہنسنے لگے۔ ذرا توقف کے بعد ریاض نے کہا "ویسے یار اس میں جھوٹ کیا ہے' لندن سے میت ہی تو آ رہی ہے۔" تو یہ تھا ریاض فرشوری۔ حاضر دماغ' بہروپیا' پر اعتماد اور ہر مشکل کا حل ڈھونڈ لینے والا۔

ریاض فرشوری کے آمدنی کے مستقل ذرائع نہیں تھے۔ کبھی کبھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے وہ ملازمت بھی کر لیتا تھا' مگر جلد ہی کسی نہ کسی افسر کو ناراض کرنے کے بعد سبکدوش کر دیا جاتا یا خود استعفیٰ دے دیتا۔ ایک زمانہ ایسا آیا کہ وہ ایک طویل عرصہ تک بے روزگار رہا۔ یہ اس کی بے حد پریشانی کا دور تھا' مگر مجال ہے کہ اس کی روش میں کوئی فرق آیا ہو۔ اس کا وہی طرز اور وہی انداز رہا جو پہلے تھا۔ وہ حسب عادت کسی اہم عہدے دار کو ناراض کر کے چھوٹی موٹی آمدنی کے عارضی ذرائع بھی ختم کرا لیتا۔ میں نے اور حمید زمان نے کئی بار اس سے کہا کہ یار تم خود اپنے سب سے بڑے دشمن ہو۔ اچھی بھلی ڈیل چل رہی ہوتی ہے کہ تم بات بے بات کسی ایسے آدمی کو خوامخواہ خفا کر دیتے ہو' جو جواباً تمہاری ملازمت اور ذریعہ آمدنی ختم کرا دیتا ہے۔ اس کا فائدہ کیا......؟ ریاض خاں اپنے مخصوص انداز میں دیر تک ہنستا رہا' پھر بولا دیکھو تم جانتے ہو جب مجھے کوئی فقرہ سوجھ جائے تو پھر روکا نہیں جاتا۔ اب اگر وہ فقرہ اس آدمی پر چست ہوتا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ مجبوری ہے..... حمید زمان نے کہا "کیا خاک مجبوری ہے تم وہ سب نہ کہو۔ ریاض فرشوری پھر ہنسا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "آغوں یار تم ہی سمجھاؤ خان صاحب کو' روزگار تو کسی نہ کسی طرح دیر بدیر مل ہی جاتا ہے' مگر زبان پر آیا ہوا فقرہ ضائع ہو جائے تو کیسے دکھ کی بات ہے۔" تو یہ تھا ریاض فرشوری اپنے ایک فقرے کے لیے اپنی آمدنی کے ذریعہ' اپنی ملازمت' اپنے تعلقات سب کچھ قربان کر

دینے والا، دلیر، نڈر، باہمت۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا۔ ریاض فرشوری کو جھوٹ بولنے کا شوق دیوانگی کی حد تک تھا۔ ہم نے اس کی بات سے حقیقت حاصل کرنے کے لیے مختلف پیمانے بنائے ہوئے تھے۔ بعض موضوعات ایسے تھے جہاں جھوٹ کی ملاوٹ 90 فیصد ہوتی۔ کچھ ایسے جہاں ففٹی ففٹی سے کام چل جاتا اور چند ایک ایسے جہاں صرف چاشنی اور زیب داستان کے لیے پانچ دس فیصد جھوٹ کافی ہوتا۔ مگر جھوٹ کا ہونا بالکل یقینی امر تھا۔ ہمارے مشترکہ دوست خواجہ معین الدین کہا کرتے تھے۔ میں آج تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ ریاض فرشوری زیادہ بڑا جھوٹا ہے یا ابراہیم جلیس۔ ایک دن ایسا ہوا کہ اسے کسی بڑے سرکاری افسر سے کچھ ضروری کام تھا۔ مجھ سے کہا تم بھی ساتھ چلو۔ "دو مشہور شخصیات" کی موجودگی کا زیادہ اثر ہوگا۔ (ہم خود کو کراچی شہر کی مشہور شخصیات میں شمار کرتے تھے اور یہ حقیقت بھی تھی کہ ریڈیو پاکستان اور خاص طور پر ڈرامے سے وابستگی کے سبب ہم شہر کے مقبول اور مشہور آدمی سمجھے جاتے تھے۔) میں راضی ہو گیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اس نے ریڈیو سٹیشن کے سامنے سے ایک ٹیکسی پکڑی اور ہم کلفٹن کی طرف روانہ ہو گئے، جہاں ان صاحب کا دفتر تھا۔ حسب توقع وہاں ہمارا بڑا تپاک خیر مقدم کیا گیا۔ جب ہم نے ان کے سیکرٹری کو اپنے نام بتائے تو پہلے خود سیکرٹری صاحب اپنی خوش قسمتی پر رشک کرتے رہے کہ اسے ہم جیسے مشہور فنکاروں سے بالمشافہ ملاقات کا موقع ملا۔ پھر اندر جا کر جب اس نے صاحب کو اطلاع دی تو وہ خود ہمیں لینے باہر تشریف لائے۔ ہم خاصی دیر ان کے ساتھ رہے اور وہ نہایت خوش اخلاقی اور ادب واحترام سے گفتگو تو کرتے رہے، مگر مطلب کی بات نہایت چالاکی سے کاٹ جاتے۔ ریاض کا مجھے اندازہ تھا کہ وہ اندر ہی اندر طیش کھا رہا ہے۔ آخر کافی دیر بعد جب ہم جانے کے لیے اٹھے تو انہوں نے کہا، ایک منٹ ٹھہریے، میں آپ کی واپسی کے لیے کار کا انتظام کرا دیتا ہوں۔ میں دل ہی دل میں خوش ہوا چونکہ باہر تیز دھوپ تھی۔ ریڈیو سٹیشن کا فاصلہ بھی وہاں سے کافی تھا، مگر اس سے پہلے کہ میں شکریہ کے ساتھ یہ آفر قبول کرتا، ریاض فرشوری نے دیوار پر لٹکی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا اور ایک دم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ معاف کیجئے گا مجھے باتوں میں وقت گزرنے کا دھیان ہی نہیں رہا۔ دراصل ہمیں نائیجیریا کے سفیر نے اپنے گھر پر ملاقات کے لیے بلایا ہوا ہے۔ ان کی کار نیچے ہمارا انتظار کر رہی ہے۔ آپ کیساتھ ان شاءاللہ

پھر کبھی نشست ہو گی۔ اس سے قبل کہ ہمارا میزبان کچھ کہے ہم دونوں مصافحہ کر کے اس کے کمرے سے باہر نکل چکے تھے۔ میں بالکل خاموش تھا' بلکہ ریاض خاں کی اس حرکت پر خفا تھا۔ بھلا یہ کوئی بات ہے میں حیران تھا۔ ریاض نے مجھے کیوں نہیں بتایا تھا کہ ہم نائیجیریا کے سفیر کے گھر مدعو ہیں۔ دفتر سے باہر نکل کر ریاض خاں نے تیزی سے سڑک پار کی۔ پھر ایک موڑ پر رکشہ روکا اور ہم بندر روڈ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ریاض خاں میرے موڈ اور خاموشی سے مزہ لے رہا تھا یونہی تھوڑی دیر سفر جاری رہا۔ آخر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے کہا' یہ سب کیا فراڈ ہے۔ وہ نائیجیریا کے سفیر کی کار اور اس سے ملاقات' میں نے غصہ سے کہا۔ وہ زور زور سے ہنسنے لگا اور بڑے پیار سے میرے شانوں کو تھپکتے ہوئے بولا' یار اس کم ظرف اور چالاک آدمی کی کار میں بیٹھ کر ہمیں کتنی کوفت ہوتی۔ تمہیں اس کا اندازہ ہے؟ اب آغوں یار تم ہی کہو' ہم ایسے ٹچے آدمی کی آفر کیوں قبول کرتے۔ میں نے زور سے اس کے کاندھے پر ہاتھ مارا اور بے تحاشا ہنسنے لگا۔ تو یہ تھا ریاض فرشوری' خوددار' اپنی ذات پر کسی اور کو دکان چمکانے کا موقع نہ دینے والا۔ نودولتیوں اور کم ظرفوں کا مخالف' بے باک اور باحوصلہ۔

اب تو اسے ہم سے جدا ہوئے ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے' مگر خدا جانے میرے دل میں کبھی کبھی ایک بڑا احمقانہ سا خیال کیوں آتا ہے۔ مجھے لگتا ہے وہ مرا نہیں کھو گیا ہے اور کسی دن بالکل اسی طرح جب ہم پہلی بار ایک دوسرے سے ملے تھے وہ کہیں مل جائے گا۔ کسی سڑک کے کنارے' کسی گلی کے موڑ پر' کسی دروازے کے پاس' کسی زینے کے قریب' میں اچانک اپنے کندھے پر کسی کا ہاتھ محسوس کروں گا اور جب مڑ کر دیکھوں گا تو وہ میرے سامنے کھڑا ہو گا اور بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہہ رہا ہو گا ''میرا نام ریاض فرشوری ہے۔''

اطہر علی

وطن عزیز سے ہزاروں میل دور سنٹرل لندن کی مشہور عالم عمارت بش ہاؤس میں ایک چھتناور درخت تھا جس پر رنگ رنگ کے پھول کھلتے جن کی مہکار سارے ماحول کو معطر کر دیتی اور اس کی شاخیں خوش شکل اور خوش ذائقہ رس دار پھلوں سے لدی رہتیں جنہیں کوئی ایک بار کھالے تو ساری زندگی اس لذت کو فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی گھنیری چھاؤں میں دیس پردیس کے اجنبی اور آشنا مسافر بیٹھ کر ستاتے۔ ٹھنڈے میٹھے ماحول میں خوش گپیاں کرتے۔ دوسروں کی سنتے اور اپنی سناتے۔ بش ہاؤس کے اس شفیق سایہ دار درخت کا نام اطہر علی تھا۔

اطہر علی چوتھائی صدی سے زیادہ عرصہ بش ہاؤس میں واقع بی بی سی اردو سروس سے منسلک رہا۔ اس نے بی بی سی کے جنگل میں یہ وقت ایک شیر کی طرح گزارا اور جب یہاں سے گیا تو ایک باغیرت اور باوقار انسان کی طرح پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا کہ مفتوحہ علاقوں کی جانب لوٹ کر جانا بہادروں اور عزت داروں کا شیوہ نہیں ہوتا' اسے اپنی عزت نفس کا بہت پاس تھا اور اسے اپنی ذات اور اپنی صلاحیتوں پر مکمل اعتماد تھا۔

میری ملاقات اطہر علی سے 1964ء میں ہوئی۔ جب میں پہلی بار انگلستان گیا تھا۔ مجھے ریڈیو پاکستان کی جانب سے لندن سنٹر فار ایجوکیشنل ٹیلی ویژن میں برٹش کونسل کے اسکالرشپ پر ٹیلی ویژن کی تربیت کے دوماہ کے کورس پر بھیجا گیا تھا۔ بی بی سی کی اردو سروس میں میرے بہت سے جاننے والے کام کرتے تھ۔ وہیں بی بی سی کے مقبول زمانہ کلب میں پہلی بار میر اطہر علی سے تعارف ہوا۔ ویسے میں اس کے نام سے واقف تھا' اس کی آواز بھی بی بی سی کی اردو سروس میں سنی تھی اور مجھے اس کے بارے میں یہ بھی علم تھا کہ انگلستان آنے

سے پہلے وہ کراچی میں روزنامہ جنگ کا چیف رپورٹر تھا۔ اس شام رسمی تعارف کے بعد ہم دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ شاید اس وقت ہم میں سے کسی کو بھی یہ علم نہیں تھا کہ آج کی یہ مختصر ملاقات آنے والے زمانے میں ایک گہری اور پائیدار دوستی میں بدل جائے گی۔ ہماری دوستی کم وبیش تیس برسوں پر محیط ہے۔ لیکن اس تمام عرصہ اطہر علی لندن میں رہا اور میں پاکستان میں۔ اس سارے وقت میں ہماری کتنی ملاقاتیں ہوئیں؟ دس' پندرہ' بیس؟ اس سے زیادہ ہرگز نہیں۔ کیا مستحکم دوستی اور پکی یاری کے لیے یہ کافی ہے؟ میرا جواب ہے ہاں چونکہ میرے خیال میں دوستی کا ملاقاتوں کی تعداد اور اکٹھا رہنے کے عرصے سے تعلق نہیں ہوتا۔ کتنے لوگ زندگی میں ایسے ہوتے ہیں جن سے آپ ہر روز ملتے ہیں۔ پہروں گفتگو کرتے ہیں۔ ایک دفتر میں ساتھ کام کرتے ہیں' مگر پھر بھی وہ دوستوں کے حلقے میں شمار نہیں ہوتے۔ دوستی کے تو کچھ اور ہی تقاضے ہیں۔ کچھ اور ہی مطالبے ہیں۔ دوستی تو دنیاوی اصولوں سے ماورا ہے۔ اس کے لیے کب کیوں کہاں اور کیسے کی شرائط نہیں ہوتیں۔ دوستی تو روشنی کی طرح ہے کہ جب اس کی کرنیں پھیلتی ہیں تو اردگرد کی ساری تاریکی اس کی چمک میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ خوشبو کی طرح ہے کہ جس کی مہک سارے ماحول پر چھا جاتی ہے۔ یہ روشنی اور یہ خوشبو ہر شخص کی اپنی ہوتی ہے اور جب کوئی دو ایسے انسان ملتے ہیں جن کی روشنی اور خوشبو ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں تو دوستی جنم لیتی ہے۔ دوستی کی اصل اساس یہی ہے اور یہی دوستی ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ جان پہچان' شناسائی' پیشہ ورانہ ساتھ' یا عزیزداری کے رشتے ہوتے ہیں۔ اطہر اس تیس سال کے عرصے میں بہت کم پاکستان آیا۔ ہمارا خط وکتابت کا سلسلہ بھی نہیں تھا۔ ٹیلی فون پر بھی شاذ ہی گفتگو ہوتی تھی۔ ہاں ہماری ملاقاتیں زیادہ تر لندن میں ہوتیں کہ جب میں کسی سرکاری یا نجی کام سے وہاں جاتا' مگر اس کے باوجود ہم تیس برس یارانے کے مضبوط بندھن میں بندھے رہے اور ہماری دوستی کی جڑیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ 29 اکتوبر 1996ء کی ایک سہ پہر لندن کے ایک ہسپتال میں وہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

یہ اکتوبر کے دوسرے ہفتے کی بات ہے۔ میں ہانگ کانگ میں منعقد ہونے والی ایشین براڈکاسٹنگ یونین کی جنرل اسمبلی میں شرکت کے لیے جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ ایشین براڈ کاسٹنگ یونین جسے اے بی یو کے نام سے پکارا جاتا ہے' دنیا کی سب سے بڑی براڈ کاسٹنگ

یونین ہے۔ اس کی سالانہ اسمبلی ایشیا اور پیسفک ریجن کے براڈ کاسٹنگ نیٹ ورکس کا سب سے بڑا اجتماع ہوتا ہے۔ میں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں 15 سے زائد ایسی اسمبلیوں میں شرکت کی۔ کبھی پاکستان ٹیلی ویژن، کبھی ریڈیو پاکستان اور کبھی شالیمار ٹیلی ویژن نیٹ ورکس کی جانب سے۔ ہم سارے ایشیائی براڈ کاسٹر اس اسمبلی کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتے ہیں کہ آٹھ دس روز کے لیے ایک بہت بڑے اور نہایت مفید اجتماع میں شرکت کا موقع ملتا ہے اور ساتھ ہی نئے پرانے دوستوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ ہانگ کانگ میں منعقد ہونے والی اسمبلی میں شرکت کے لیے مجھے شاید اگلے روز جانا تھا اور اس بار میں اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے جا رہا تھا۔ دوپہر کو جب میں لنچ کے لیے گھر آیا تو صفیہ نے بتایا کہ ابھی اطہر بھائی کا فون آیا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ خدا جانے کیا بات ہے۔ خیریت تو ہے؟ "خیریت ہی ہو گی۔ وہ بہت خوشگوار موڈ میں تھے۔ کہنے لگے آغا کو دفتر فون کیا تھا وہاں سے معلوم ہوا وہ گھر کے لیے چل چکا ہے۔ ابھی پہنچا یا نہیں" میں نے جواب دیا "نہیں ابھی آتے ہی ہوں گے۔" پھر انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ اس وقت گھر کیوں آ رہا ہے؟ میں نے بتایا روز ہی آتے ہیں لنچ کرنے، وہ ہنس پڑے...... "کیا پکایا ہے آج" بات یہاں تک پہنچی تھی کہ فون کی گھنٹی بول اٹھی۔ میں نے لپک کر چونگا اٹھایا دوسری طرف اطہر کی مانوس اور گداز آواز تھی۔ "بڑے عیش ہیں، لنچ کرنے گھر آتے ہو" "اور نہیں تو کیا، پاکستان میں رہنے کے یہی تو فائدے ہیں، تم کہاں سے بول رہے ہو؟" میرا خیال تھا شاید وہ اسلام آباد یا کراچی سے بول رہا ہے۔ "میں لندن میں ہوں۔ ایک کام پڑ گیا ہے۔ میرے ایک دوست ہیں ولیم کراولے۔ تم بھی انہیں جانتے ہو۔ بی بی سی کی ایسٹرن سروس کے ہیڈ تھے۔ وہ برمنگھم میں کسی سیمینار میں مضمون پڑھ رہے ہیں۔ جس کا موضوع ہے جنوبی ایشیا کے ملکوں میں سیٹلائٹ ٹیلی ویژن کے اثرات...... انہیں پاکستان کے بارے میں مواد چاہیے۔ ظاہر ہے تم سے بہتر آدمی کون ہو سکتا ہے اس کام کے لیے"۔ اطہر کو دوسروں کی مدد کرنے اور ضرورت مندوں کے کام آنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ "مگر اطہر میں"...... میرے کچھ کہنے سے پہلے اس نے میری بات کاٹ دی۔ "مجھے معلوم ہے تم کل شام اے بی یو کی میٹنگ میں ہانگ کانگ جا رہے ہو، اسی لیے تو میں نے تمہیں فوراً ہی فون کیا۔ تم ایسا کرو جو میٹریل بھی مل سکے آج ہی میرے فیکس نمبر پر ارسال کر دو"۔ ظاہر ہے اطہر کی بات ٹالی نہیں جا سکتی تھی۔ میں نے دفتر جا کر مناسب مواد

اکٹھا کیا۔ کچھ نئے اعداد و شمار ٹائپ کرائے اور شام کو اس کے، فیکس پر بھیج دیئے۔ رات کو پھر اس کا فون آیا۔ "پارٹنر بہت بہت شکریہ۔ مگر ایک زحمت اور کرنا ہوگی۔ کل ایک بار پھر سے میٹریل فیکس کرا دو۔ تمہارے بھیجے ہوئے بعض صفحات پڑھے نہیں جا سکتے"۔ پھر فون پر ہی اس نے ہانگ کانگ کے بارے میں ضروری معلومات دیں، وہاں کون کون سے جاننے والے رہتے ہیں، کن سے ملاقات کرنا مناسب رہے گا وغیرہ۔

اطہر علی کو دنیا کے ہر شہر میں مقیم متعلقہ لوگوں کے بارے میں ساری معلومات ہوتی تھیں اور وہ ایک کل وقتی افسر رابطہ کی طرح اپنے سارے دوستوں اور ملنے والوں کے کام آتا اور ان کی رہنمائی کرتا رہتا تھا۔ شاید زندگی میں وہ جس قدر اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے کام آیا، کوئی اور نہ آیا ہوگا۔ پھر میں ہانگ کانگ چلا گیا، جہاں تقریباً تین ہفتے گزارنے کے بعد ہم واپس آئے اور زندگی حسب معمول اپنی ڈگر پر چلنے لگی۔ واپسی کے چند روز بعد ایک شام جب میں واک کے لیے گھر سے نکلنے کی تیاری کر رہا تھا تو ملازم نے کہا کوئی انگریز آپ سے فون پر بات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے فون لیا۔ دوسری طرف سے ولیم کراولے بول رہا تھا۔ اس نے میرا شکریہ ادا کرنے کے لیے فون کیا تھا۔ چند روز قبل ہی وہ برمنگھم کے سیمینار میں اپنا مضمون پڑھ کر آیا تھا، جسے بے حد پسند کیا گیا تھا۔ میں ہنس ہنس کر اس کا شکریہ قبول کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے وہ آخری فقرہ کہا جس نے یکدم میری دنیا اندھیر کر دی۔ "مسٹر ناصر" اس نے بات ختم کرتے ہوئے کہا" دراصل تو مجھے اطہر کا شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا کہ اسی کے توسط سے آپ کا بھیجا ہوا میٹریل مجھے ملا۔ مگر اب اس کی موت کے بعد...... "میرا سر چکرا گیا، زبان گنگ ہو گئی"۔ موت کے بعد...... یعنی آپ کا مطلب ہے...... کیا کہہ رہے ہیں آپ مسٹر کراولے" میرے بے ربط فقرے اور غم زدہ لہجہ کو سن کر وہ گھبرا گیا۔ کچھ شرمندہ سا بھی ہوا، جیسے یہ بات اس کو کہنی نہیں چاہیے تھی۔ "آئی ایم سوری، ویری سوری مسٹر ناصر مجھے علم نہیں تھا کہ آپ کو معلوم نہیں ہے۔ دو ہفتے پہلے اطہر کا انتقال ہو گیا۔ وہ ضروری سرجری کے لیے آپریشن کی میز پر تھا اور اسی حالت میں وہ ہم سے جدا ہو گیا"۔ میں نے کراولے کو بتایا کہ میں اٹھارہ دن کے بعد وطن واپس آیا ہوں۔ اطہر کی وفات کی خبر اس عرصے میں اخباروں میں شائع ہو کر پرانی ہو چکی تھی، لہٰذا مجھے کسی نے بتانا ضروری ہی نہ سمجھا۔ ولیم کراولے نے مخصوص انگریزی کلچر کو ملحوظ رکھتے ہوئے رسماً کہا، "آئی ایم سوری،

کاش یہ بری خبر آپ کو میرے توسط سے نہ ملتی''

اطہر کی موت کی خبر میرے لیے اتنی اچانک تھی کہ کئی روز میں اس کے اثر سے باہر نہ آسکا۔ پھر کچھ دن بعد اطہر کے کچھ دوستوں نے جن میں انگلستان کے سفارت خانے کے ایم ایس لودھری پیش پیش تھے' میریٹ ہوٹل میں اس کے جاننے والوں کو جمع کیا اور ہم چائے پر دیر تک اپنے پیارے دوست کا ذکر کرتے رہے۔ ذکریار کرنے والوں میں حمید علوی' ایم ایس لودھی' لندن سے آئے ہوئے عظیم طارق کے علاوہ ابصار رضوی اور اصحاب نقوی بھی شامل تھے۔ ہم میں سے ہر ایک اطہر کی شخصیت' اس کے ساتھ اپنے تعلقات اور گزرے ہوئے وقتوں کے قصے سناتا رہا۔ میں نے اہل محفل کو بتایا کہ اطہر سے میری آخری ملاقات صرف دو مہینے پہلے ہوئی تھی جب میں امریکہ سے پاکستان آتے ہوئے دو روز کے لیے لندن ٹھہرا تھا۔

اطہر کا تعلق دہلی کے ایک سید خانوادے سے تھا۔ وہ اسی شہر میں 11 جولائی 1930ء میں پیدا ہوئے۔ اس کے والد سید شمشاد علی دہلی کے عربک کالج میں پروفیسر تھے اور ان کا خاندان علم و فضل کے حوالے سے خاص شہرت رکھتا تھا۔ اطہر کی والدہ نے اس دور میں کہ جب لڑکیوں کی تعلیم کو معیوب سمجھا جاتا تھا' دہلی کے مشنری سکول میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کی انگریزی' فارسی اور اردو کی قابلیت مستند تھی۔ اطہر کے عزیزداروں میں اردو ادب سے تعلق رکھنے والی نامور شخصیتوں کے نام شامل ہیں جن میں شان الحق حقی' تابش دہلوی' محمد حسن عسکری اور ڈاکٹر اسلم فرخی وغیرہ شامل ہیں۔ اس طرح اطہر کو علم و ادب کا ذوق ورثہ میں ملا۔ مجھے تو کبھی ملاقات کا موقع نہیں ملا' لیکن میں نے سنا ہے اس کی والدہ اس روانی سے ایسے اچھے لہجہ میں انگریزی بولتی تھیں کہ سننے والے حیران رہ جائیں۔ اپنی ماں سے اطہر کی محبت ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے والد کا سایہ لڑکپن ہی میں سر سے اٹھ گیا تھا' لہٰذا والدہ کا رتبہ صرف ماں کی حیثیت تک محدود نہیں تھا۔ انہوں نے باپ کے فرائض بھی انجام دیے اور تقسیم ہند کے بعد جب اطہر اپنے اہل خانہ کے ہمراہ دہلی سے پاکستان ہجرت کر کے آیا تو اس کی والدہ ہی اس خاندان کی سربراہ تھیں۔ اطہر کی عمر اس وقت 16 سال تھی اور وہ چونکہ اپنی دونوں بہنوں نجمہ اور شمسہ اور بھائی طاہر علی سے عمر میں بڑا تھا' لہٰذا چھوٹے بھائی بہنوں کے لیے اس کا درجہ باپ جیسا تھا۔ اس نے اپنی

اس ذمہ داری کو پوری طرح نبھایا اور بھائی بہنوں کی تعلیم و تربیت میں کوئی کوتاہی نہ کی۔ اطہر کو لکھنے پڑھنے کا شوق ماں اور باپ دونوں کی طرف سے ورثہ میں ملا تھا۔ یہی شوق اسے صحافت کی دنیا میں لے آیا اور کراچی کے مشہور اخبارات "انجام" اور اس کے بعد ایک طویل عرصے تک روزنامہ "جنگ" سے منسلک رہا۔ 1985ء میں وہ بی بی سی سے وابستہ ہو گیا اور اردو سروس میں ملازم ہو کر لندن چلا گیا۔

اطہر کو اپنی ماں سے بے حد محبت تھی۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ میں نے زندگی میں جو کچھ بھی حاصل کیا' وہ سب میری ماں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے 1983ء میں پیرس جاتے ہوئے میں لندن سے گزرا' مگر ایک دن کے مختصر قیام میں اطہر سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ویسے مجھے یہ علم تھا کہ ان دنوں اس کی والدہ لندن اس کے پاس آئی ہوئی ہیں۔ کافی عرصہ ہمارا رابطہ نہ رہا۔ پھر ایک دن مجھے اطہر کا خط ملا۔ اس نے لکھا تھا:

آغا جی' سلام!

اس بار یورپ آئے تو ملنا بھی نہ ہوا۔ کچھ اپنی کہتے کچھ ہماری سنتے۔ کوئی دو مہینے سے یوں سمجھو وقت بہت خراب گزرا۔ پہلے میں ستمبر میں ہسپتال میں داخل ہوا اور بڑا آپریشن ہو گیا۔ ٹھیک ہو کر گیا بلکہ ہسپتال سے نکلا گھر پہنچا تو والدہ بیمار ہو گئیں۔ کمزوری اور ضعیفی تو تھی ہی میری بیماری کی پریشانی نے شاید ان کو نڈھال کر دیا اور وہ پھر نہ اٹھ پائیں۔ 20 اکتوبر کو انتقال ہوا۔ پردیس میں تم جانو جینا بھی دشوار اور غمی اور بھی دشوار۔ یہ لوگ جس نسل سے تعلق رکھتے تھے وہ ناپید ہے۔ ہم لوگ تو ان کے پاسنگ بھی نہیں۔ وہ آتے جاتے گھر سے نکلتے پوچھ لیتی تھیں کہاں جا رہے ہو۔ کب تک آؤ گے۔ اب وہ دم نہیں رہا۔ دعاؤں کو ترس جائیں گے۔

اب دعائے نیم شب میں کس کو یاد آؤں گا میں

اطہر نے ایک فرماں بردار بیٹے کی طرح آخر وقت تک ان کی خدمت کی۔ ماں کی وفات کے بعد وہ بہت اداس رہنے لگا اور واپس نارمل حالت پر آنے میں اسے کافی عرصہ لگا۔

اطہر کو کتابیں پڑھنے اور کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ سنا ہے اس کی لائبریری میں کم از کم دس ہزار کتابیں تھیں۔ اس نے بے شمار مضامین لکھے' ترجمے کیے' وہ خود اپنے تجربات پر مبنی ایک کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتا تھا' مگر وقت نے مہلت نہ دی۔ مجھے یقین ہے اطہر

جیسا ذہن اور زبان و بیاں پر مکمل عبور رکھنے والا آدمی اگر کوئی کتاب تصنیف کرتا تو وہ ہمارے ادب میں ایک گراں بہا اضافہ ہوتا اس نے دنیا کے بے شمار ملکوں کے سفر کیے، عظیم سیاستدانوں، نامور شاعروں، ادیبوں، دانشوروں اور کھیل اور فن کی دنیا کی شہرت یافتہ شخصیتوں سے ملاقاتیں کیں، جو باتیں اور قصہ کہانیاں وہ زبانی سنایا کرتا تھا۔ اگر وہ قلم بند کر کے ایک کتابی صورت ہی شائع کردی جاتیں تو کتنا اچھا ہوتا، مگر وقت نے مہلت نہ دی۔

اطہر کو سیر و تفریح اور نئے نئے ملکوں کا سفر کرنے کا بہت شوق تھا۔ اسی شوق کی بدولت اس نے بہت دنیا دیکھی۔ ہر دو سال بعد وہ پاکستان کا چکر لگاتا اور موقع ملتا تو ہندوستان بھی ہو آتا۔ دہلی شہر سے اس کو ایک خاص قسم کا جذباتی لگاؤ تھا۔ یہ وہ شہر تھا جہاں وہ پیدا ہوا اور جس کے چپہ چپہ سے اس کی یادیں وابستہ تھیں۔ وہ کہا کرتا تھا میں جب بھی دہلی جاتا ہوں۔ ان گلی کوچوں میں ضرور گھومتا ہوں، جہاں میری زندگی کے ابتدائی 16 برس گزرے۔ مجھے اس شہر کا ایک ایک راستہ اور ایک ایک روش یاد ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ اطہر نے یورپ، امریکہ، مشرق وسطی، مشرق بعید کے تقریباً سارے قابل ذکر ملکوں کے دورے کیے اور جہاں جہاں وہ گیا وہاں اپنے یاد کرنے والوں اور عقیدت مندوں کی بڑی تعداد چھوڑ آیا۔ اس کی دل آویز شخصیت سے ہر ملنے والا متاثر ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے ہر ملک اور ہر شہر میں اس کے جاننے والے اور چاہنے والے موجود تھے جو ضرورت پڑنے پر اس کے کام آتے تھے۔ مجھے اسی سلسلہ میں ایک ذاتی واقعہ یاد ہے جسے میں زندگی بھر فراموش نہیں کر سکتا۔

شاید 1985ء کی بات ہے۔ میں ان دنوں نیشنل فلم کارپوریشن کا ایم ڈی تھا اور Canns کے فلمی میلے میں شرکت کے لیے فرانس جا رہا تھا۔ ایسے موقعوں پر میں ہمیشہ یہ کیا کرتا تھا کہ ایسی فلائٹ لوں جو لندن سے ہو کر جائے تاکہ دو تین روز لندن ٹھہر سکوں۔ اس بار بھی میں نے یہی کیا۔ اطہر سے لمبی ملاقاتیں رہیں اور جب میں نے اسے بتایا کہ کانز سے واپسی پر میرا ارادہ دو تین روز پیرس ٹھہرنے کا ہے تو اس نے کہا اس کے ایک دوست پیرس میں رہتے ہیں جن کا نام ظفر مسعود ہے۔ تم ان سے ملنا وہ پیرس میں تمہاری مناسب خاطر تواضع کریں گے۔ میں لندن سے کانز گیا اور ہفتہ بھر فلمی میلے میں شرکت کے بعد تین روز کے لیے پیرس آیا، جہاں شانتری لیزے کے قریب ایک چھوٹے سے ہوٹل میں قیام

کیا۔ پیرس میں پہلی ہی شام ایک انڈین ریسٹورینٹ میں دیسی کھانا کھا کر مجھے شدید قسم کی فوڈ پائزننگ ہوگئی۔ ہوٹل واپس آکر جب میں بستر پر لیٹا تو میری تکلیف بڑھتی گئی۔ میں ہوٹل کے کمرے میں تنہا تھا۔ مجھے طرح طرح کے خیال آتے رہے اور میرا دل گھبراتا رہا۔ آدھی رات ہونے تک میں نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا سوچ رہا تھا کہ کیا کروں۔ ہوٹل کے اسٹاف میں کوئی انگریزی نہیں سمجھتا تھا۔ میں تیز بخار میں پھنک رہا تھا۔ ڈی ہائی ڈریشن اس قدر زیادہ تھی اور لاغری اتنی بڑھ گئی تھی کہ بستر سے اٹھ کر غسل خانہ تک جانا محال تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ یہ اتوار کی رات تھی اور پیرس میں سب کچھ بند تھا۔ پاکستانی سفارت خانے سے بھی رابطہ ممکن نہیں تھا۔ مجھ پر سخت ڈپریشن طاری تھا۔ لگتا تھا کہ بس میں اسی طرح بستر پر لیٹا لیٹا مر جاؤں گا اور پھر پاکستانی اخباروں میں خبر لگے گی کہ میں پیرس کے ایک ہوٹل میں مردہ پایا گیا۔ ہوٹل کے کاؤنٹر پر بار بار فون کرنے کے باوجود میں بوڑھی فرانسیسی عورت کو جو نائٹ شفٹ پر تھی۔ اپنا مدعا نہ بتا سکا۔ میری تکلیف اور کمزوری بڑھتی جا رہی تھی۔ کمزوری کے ساتھ ساتھ میری نروس نس میں بھی اضافہ ہو رہا تھا اور مجھے موت اپنے بہت قریب نظر آنے لگی تھی۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ شاید میں نہیں بچوں گا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میں کم از کم مرنے سے پہلے اپنے کسی جاننے والے کو اپنی حالت سے مطلع تو کر دوں۔

میں نے ڈائری اٹھا کر دنیا کے دوسرے حصوں میں رہنے والے اپنے دوستوں کے نام ڈھونڈھے۔ سب سے قریب لندن تھا اور لندن میں اطہر تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے نمبر گھمایا۔ اس وقت شاید صبح کے چھ بجے ہوں گے۔ دوسری جانب سے نیند میں ڈوبی ہوئی اطہر علی کی آواز آئی۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی تپتے بے آب و گیاہ صحرا میں کوئی نخلستان اچانک سامنے آگیا ہو۔ "اطہر" ...... میرا گلا خشک تھا اور اس کی آواز سن کر جذبات سے میری آواز رندھ گئی تھی۔ "آغا ...... تم ہو یہ ...... کہاں ہو ...... کیا بات ہے" وہ ایک دم چاق و چوبند آواز میں بولنے لگا۔ اس کی نیند یک لخت غائب ہو گئی تھی۔ میں اس کے سوال کے جواب میں کچھ نہ کہہ سکا اور آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں ہو گیا۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کیا بات ہے "اطہر گھبرا گیا" "میں مر رہا ہوں ...... میں مر جاؤں گا ...... اطہر" وہ مجھے تسلیاں دے کر ساری بات سننا چاہتا تھا۔ پھر اس نے کہا "ٹھہرو، مجھے اپنا فون نمبر دو، میں تمہیں فون کرتا ہوں"،

میں نے ہوٹل کا نام اور فون نمبر بتایا اور اپنی حالت سے بھی اسے آگاہ کیا۔ فون کا چونگہ واپس رکھنے کے بعد مجھے کچھ اطمینان سا ہو گیا کہ اب کم از کم کسی کو یہ علم تو ہے کہ میں مر رہا ہوں۔ مجھ پر نیم بے ہوشی کا عالم طاری تھا اور اب اتنی سکت بھی نہ تھی کہ خالی ہو جانے والے گلاس میں سامنے کی میز پر رکھے ہوئے جگ سے پانی ہی انڈیل سکوں۔ میں آہستہ آہستہ جتنی دعائیں یاد تھیں دہرانے لگا۔ آنکھیں بند ہو رہی تھی کہ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بڑے زور سے بولی' میں نے بمشکل ہاتھ بڑھا کر چونگا اٹھایا۔ دوسری طرف سے اطہر کی آواز آ رہی تھی۔ "آغا...... کیسے ہو...... گھبراؤ مت...... سب ٹھیک ہو جائے گا...... میں نے پیرس میں اپنے دوست ظفر مسعود سے بات کی ہے۔ وہ ہوٹل والوں کو سمجھا رہا ہے۔ ابھی کچھ دیر میں تمہیں ڈاکٹر دیکھنے آجائے گا۔ ظفر بھی تم کو ابھی فون کرے گا۔ بس ہمت سے کام لو"۔ اس نے بڑی تسلیاں دیں اور یہ کہہ کر فون بند کر دیا کہ ظفر کا فون آنے والا ہو گا۔ ظفر کے فون سے پہلے ہوٹل کا ایک کارکن ماسٹر کی سے دروازہ کھول کر میرے کمرے میں آیا۔ اس نے فرانسیسی میں میرا حال دریافت کرنے کی کوشش کی۔ قسمت سے عین اسی وقت ظفر مسعود کا فون بھی آ گیا۔ میں نے نحیف اور لاغر آواز میں انہیں اپنا احوال بتایا اور انہوں نے کہا آپ فون ہوٹل کے آدمی کو دیں۔ وہ آدمی میرے سارے کوائف ظفر مسعود کی زبانی سن کر عجلت میں واپس گیا اور فوراً ہی ضروری دوائیں لے کر واپس آ گیا۔ اس عرصہ میں ظفر مسعود مجھے تسلیاں دیتے رہے کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ وہ ابھی آپ کو دوائیں دیں گے اور ڈاکٹر کو بلوا کر باقاعدہ آپ کا معائنہ کرائیں گے۔ میں بھی آپ سے رابطہ رکھوں گا۔ اس نے جو کہا تھا ویسا ہی ہوا۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر آ گیا۔ اس نے تفصیلی معائنہ کیا اور کچھ دوائیں دیں۔ دوپہر ہونے تک ظفر مسعود کے چھوٹے بھائی گھر کا بنا ہوا سوپ لے کر آ گئے اور شام تک پاس بیٹھے رہے۔ ظفر مسعود نے کسی ضروری کام سے جانا تھا' لہٰذا انہوں نے اپنے بھائی کو میرے پاس ہوٹل بھیج دیا تھا۔ شام ہوتے ہوتے میری طبیعت بڑی حد تک بحال ہو چکی تھی۔ اس عرصہ میں لندن سے اطہر نے کئی مرتبہ ٹیلی فون کر کے میرا حال پوچھا۔ اطہر نے جس ہوش مندی اور تیز رفتاری سے عمل کیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ بعد میں اطہر نے مجھے بتایا کہ اس نے میرے فون کے بعد فوراً ہی اپنے لیے پیرس کے ٹکٹ کا انتظام کر لیا تھا اور اگر شام تک میری طبیعت بحال نہ ہوئی ہوتی تو وہ پیرس پہنچ جاتا ایسے دوست کب کب ملتے ہیں۔

اطہر نہ صرف خود سیر وسیاحت کا دلدادہ تھا بلکہ دوسروں کو بھی ہمیشہ یہی مشورہ دیا کرتا تھا۔ اس کے ساتھ دفتر میں کام کرنے والی بی بی سی کی مس تھامسو کا کہنا ہے کہ وہ اکثر مجھے کہا کرتے تھے کہ سفر کا جو بھی موقع ملے اسے کبھی ہاتھ سے نہ جانے دو' چونکہ سیر وسیاحت بذات خود ایک تعلیم ہے۔ انہیں کے مشورے پر میں نے ہندوستان کا سفر کیا اور ان کے مرتب کیے ہوئے شیڈول کے مطابق وہاں کے اہم مقامات دیکھے۔ واپسی پر میں نے پاکستان دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے اس بات کی پر زور تائید کی کہ میں دہلی سے کراچی ہوتی ہوئی واپس لوٹوں اور جب میں نے کہا کہ میں کراچی میں کسی کو نہیں جانتی تو انہوں نے بلا توقف جواب دیا "یہ غلط ہے' تم جانتی ہو۔" اور پھر ذرا وقفہ کے بعد بولے' وہاں میری بہن رہتی ہے۔ تم اس کے ہاں ٹھہر سکتی ہو۔ پھر ایسا ہی ہوا۔ میں واپسی پر کراچی ان کی بہن شمسہ کے ہاں ٹھہری جہاں ان کی بھانجی عنبرین سے میری بڑی دوستی ہوگئی۔ پھر کچھ عرصہ بعد اطہر بھی کسی شادی میں شرکت کے لیے لندن سے کراچی آگئے اور انہوں نے مجھے جی بھر کر سیر کرائی۔

اطہر کے التفات اور شفقت و محبت کا برتاؤ صرف اس کے دوستوں تک محدود نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ کام کرنے والے بھی اس کے حسن سلوک کے قائل تھے۔ ڈیوڈ اسٹرایڈ جو بی بی سی ایکسٹرنل سروس میں ایسٹرن سروس کے سربراہ کے طور پر کام کرتے رہے۔ انہوں نے اطہر علی کی وفات پر اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا' اطہر علی سے میری پہلی ملاقات 1961ء میں ہوئی تھی جب میں نے بحیثیت پروگرام آرگنائزر ایکسٹرنل سروس کے انڈین سیکشن سے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کیا۔ اطہر علی مجھ سے دو سال قبل پاکستان سیکشن میں پروگرام اسسٹنٹ کی حیثیت سے ملازم ہو کر آئے تھے۔ حسب معمول ان دنوں بھی ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات سرد مہری کا شکار تھے' مگر اس صورت حال کے برخلاف بی بی سی ایکسٹرنل سروس میں ان دونوں شعبوں کے کارکنوں کے تعلقات میں بڑی گرم جوشی پائی جاتی تھی۔ انڈین اور پاکستانی سیکشن ایک دوسرے سے متصل تھے اور اکثر آتے جاتے لفٹ میں کاریڈور میں یا پھر بی بی سی کلب میں دونوں شعبوں میں کام کرنے والوں کی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ مجموعی طور پر یہ بڑا پرامن اور دوستانہ ماحول تھا۔

پاکستان سیکشن کا پہلا شخص جس کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں اور دیانت داری نے مجھے متاثر

کیا وہ اطہر علی تھا۔ خاموش طبیعت' محتاط مگر ایک مخصوص حس مزاح رکھنے والا ذہین انسان۔ اس کی عادت تھی کہ خاموشی سے ہر بات بڑے غور سے سنتا اور اپنی رائے کا اظہار نہایت مختصر الفاظ میں کرتا۔ لیکن اس کی رائے ان سارے دلائل پر بھاری ہوتی جو موضوع زیر بحث پر متعلقہ لوگوں نے دیے ہوتے۔ اطہر بات کرتے ہوئے آداب محفل کا پورا پورا خیال رکھتا تھا اور نپے تلے انداز میں اپنا نقطہ نظر پیش کرتا تھا۔ ہاں ایک اس کی بڑی کمزوری تھی' جس کو وہ تسلیم کرتا تھا۔ وہ یہ کہ فضول اور احمقانہ باتوں سے اسے سخت نفرت تھی اور وہ ایسے لوگوں کو کسی بھی صورت میں برداشت نہیں کرتا تھا۔ ڈیوڈ اسٹرائیڈ سے جو کچھ عرصہ بعد اطہر کا افسر بن گیا' میری بھی صاحب سلامت تھی۔ میں جب کبھی لندن جاتا تو ڈیوڈ مجھے لنچ پر ضرور بلاتا اور اکثر لنچ میں اطہر علی بھی شامل ہوتا۔ ڈیوڈ کا کہنا تھا کہ اطہر نہ صرف ذہنی اعتبار سے ایک عظیم صحافی اور براڈکاسٹر ہے بلکہ شخصیت سے بھی شوبز کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ ڈیوڈ نے مجھے بتایا کہ اطہر علی سے اس کے تعلقات صرف دفتری نوعیت کے نہیں ہیں بلکہ ابتدائی زمانے سے کہ جب اس نے بی بی سی کی ملازمت اختیار کی اور وہ دونوں دو مختلف شعبوں میں تعینات تھے۔ تب بھی ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ ان مراسم کے آغاز اور ان کو قائم رکھنے میں زیادہ حصہ اطہر علی کا ہی تھا۔ اس نے بتایا کہ 1960ء کی دہائی کے ابتدائی سالوں میں جب پاکستان کی کرکٹ ٹیم انگلستان کے دورے پر آئی ہوئی تھی تو اطہر نے میرے لیے کمنٹری باکس کے ایک پاس کا انتظام کیا۔ اس نے مجھ سے کہے بغیر یہ عنایت کی تھی اور میں اس کے اس حسن سلوک سے بے حد متاثر ہوا۔ اسی طرح 1970ء میں جب میں جنوب ایشیا کے ملکوں کے دورے پر تھا' کراچی میں اطہر علی سے میری ملاقات ہوئی جو ان دنوں پاکستان ٹیلی ویژن کے الیکشن ٹرانسمیشن میں میزبانی کے فرائض انجام دینے کے لیے لندن سے آیا ہوا تھا۔ اگرچہ وہ بی بی سی سے چھٹی پر تھا مگر میرے قیام کے دوران اس نے میری جس قدر مدد کی وہ میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ میرا خیال ہے اس کی مدد کے بغیر شاید وہ کام جن کے لیے مجھے پاکستان کے دورے پر بھیجا گیا تھا نامکمل رہ جاتے۔ اسی دوران ایک دن اطہر نے دفتری باتیں کرتے کرتے اچانک مجھ سے کہا "ڈیوڈ میں چاہتا ہوں آپ میری ماں سے ملیں"۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی' مگر ساتھ ہی ایک عجب طرح کے فخر کا احساس بھی کہ اس نے مجھے اس قابل سمجھا۔ میں نے بلا تامل یہ دعوت قبول کر لی اور اگلے

دن وہ مجھے میرے ہوٹل سے ٹیکسی میں بٹھا کر گھر لے گیا۔ جب ہم اس کے مکان میں داخل ہوئے تو میں نے وہاں ایک نہایت بردبار اور دلکش بزرگ خاتون کو اپنا منتظر پایا۔ اطہر کی والدہ ایک مہربان صورت اور شفیق سیرت خاتون تھیں۔ ان میں نہ ہی کسی قسم کا تصنع تھا نہ تجر۔ ایک گوری چمڑی والے انگریز سے ملتے ہوئے ان کے چہرے پر کسی قسم کے تکلف یا غیریت کے تاثرات نہیں تھے۔ ان سے ملاقات کے بعد جب میں واپس لوٹا تو میرا دل اطہر کے لیے ممنونیت کے جذبات سے پر تھا کہ اس نے مجھے ایک ایسی دلآویز اور مہربان بزرگ خاتون سے ملنے کا موقع فراہم کیا جو اس وقت شاید اس کی زندگی میں سب سے اہم حیثیت رکھتی تھیں اور برسوں بعد جب اطہر نے لن آسٹن سے شادی کی تو میں نے سوچا یہ یقیناً اسی باوقار اور مشفق ہستی کی تربیت کا نتیجہ ہے کہ اطہر ہمیشہ صحیح فیصلے کرتا ہے۔

دوستوں کے کام آنا' پیشہ ور ساتھیوں کی مدد کرنا اور نوجوانوں کی رہنمائی کرنا اطہر کا دل پسند مشغلہ تھا۔ پیشہ ورانہ عمل اور دوستوں کی مدد کے سلسلہ میں وہ ایک پل کا تامل نہیں کرتا تھا۔ مشہور صحافی اور ہاکی کے کمنٹیٹر فاروق مظہر نے ایک دن مجھے قصہ سنایا کہ وہ کسی سلسلہ میں پولینڈ کے شہر وارسا گیا ہوا تھا۔ جس ہوٹل میں اس کا قیام تھا' اسی میں سالی ڈے ریٹی کے لیڈر ویلیسیا بھی قیام پذیر تھے۔ فاروق کی ان سے ناشتہ کی میز پر دو ایک بار ملاقاتیں ہوئیں اور وہ مختلف موضوعات پر ان سے گفتگو کرتے رہے۔ وارسا سے واپسی پر فاروق نے کچھ روز لندن میں قیام کیا اور جیسا کہ دستور تھا' اطہر علی کو اپنی آمد کی اطلاع دی۔ پہلی ملاقات میں بی بی سی کلب میں بیٹھے گفتگو کرتے ہوئے فاروق مظہر نے اطہر کو بتایا کہ وہ وارسا کے جس ہوٹل میں مقیم تھا' وہاں ویلیسیا بھی ٹھہرا ہوا تھا اور ان سے دو تین بار ملاقات ہوئی۔ یہ سن کر اطہر کی صحافتی اور دوستی کی رگ ایک ساتھ پھڑک اٹھی۔ اس نے پوچھا کیا واقعی تم ویلیسیا سے ملے ہو۔ میں نے کہا ہاں' اس نے پھر پوچھا کیا واقعی تم نے اس سے گفتگو کی ہے۔ فاروق نے کہا' ہاں' آخر اس میں اتنی حیرت کی کیا بات ہے؟ حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ پولینڈ میں سولیڈیریٹی کے عروج کا ابتدائی دور تھا اور اس وقت تک انگلستان کا کوئی بھی صحافی ویلیسیا سے ملاقات کرنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ اطہر فاروق مظہر سے معذرت کر کے اٹھا اور کاؤنٹر پر جا کر فون کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے واپس آ کر بتایا کہ آدھے گھنٹے بعد بی بی سی ہوم سروس کے لیے اس کا ایک انٹرویو کیا جائے گا' جس میں وہ ویلیسیا سے اپنی ملاقات اور گفتگو کی

تفصیلات پیش کرے گا۔ فاروق نے آدھ گھنٹے بعد وہ انٹرویو ریکارڈ کرایا اور نتیجتاً بی بی سی کو ایک سکوپ اور فاروق مظہر کو ساٹھ پونڈ فیس مل گئی جو اس کے لیے اچھی خاصی رقم تھی۔

اطہر علی کی یہ عنایات اپنے تمام ایسے دوستوں کے لیے تھیں جو لندن آتے خواہ ان کا قیام ایک یا دو روز کے مختصر عرصہ کے لیے ہی ہوتا۔ مجھے یاد نہیں کبھی ایسا ہوا ہو کہ میں نے اپنے لندن کے قیام کے دوران بی بی سی کی اردو سروس کے لیے انٹرویو ریکارڈ نہ کرایا ہو۔ یہی حال پاکستان سے آنے والے دوسرے احباب کا تھا۔ مجھے جب بھی کوئی ایسا شناسا ملتا جو لندن ہو کر واپس آیا ہو تو میں اس سے دریافت کرتا کہ اطہر سے ملے تھے۔ ان میں سے ہر کسی کا جواب یہی ہوتا' ہاں اور پھر دوسری بات جو وہ کہتے یہ ہوتی کہ اطہر نے ملنے کے بعد پہلا سوال یہی کیا تھا "آغا کیسا ہے" یہی حال میرا تھا' جو اس کا تھا۔

1969ء میں امریکہ سے واپس آتے ہوئے میں چند روز کے لیے لندن ٹھہرا۔ یہ پاکستان کی تاریخ کا بڑا تشویشناک دور تھا۔ بنگلہ دیش کی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا۔ جنرل یحییٰ خان ان دنوں پاکستان کے مختار کل تھے۔ انہی دنوں انہوں نے چار بیرونی نامہ نگاروں کو ایک بڑا زبردست انٹرویو دیا تھا' جس کا بہت شہرہ تھا۔ میرے دوست اور ان دنوں کراچی ٹیلی ویژن مرکز کے جنرل منیجر اسلم اظہر اس انٹرویو کی ریکارڈنگ لے کر لندن آئے ہوئے تھے' جو میں نے اطہر کے ساتھ بیٹھ کر دیکھی۔ میں دو ماہ سے زیادہ ملک سے باہر رہ کر لوٹ رہا تھا۔ دراصل میں این ایچ کے ٹوکیو میں ٹی وی کے ایک ایڈوانس کورس کے سلسلہ میں گیا تھا اور میری غیر حاضری میں پی ٹی وی میں بہت سی تبدیلیاں ہو گئی تھیں۔ نئے منیجنگ ڈائریکٹر روائیداد خان مقرر ہوئے تھے۔ وہ بھی ان دنوں لندن آئے ہوئے تھے۔ ان سے میری پہلی ملاقات بھی وہیں عبدالقیوم صاحب کے گھر پر ہوئی' جو پاکستان سفارت خانے میں پریس منسٹر تھے۔

لندن قیام کے دوران اطہر علی سے بہت ملاقاتیں رہیں۔ ہم پہروں ملکی حالات اور آنے والے تاریک دنوں پر گفتگو کرتے رہتے۔ اطہر بی بی سی کے رویہ سے بھی بہت خفا تھا۔ نہ صرف انگریزوں کا رجحان بنگلہ دیش کی مکتی باہنی کے حق میں تھا بلکہ اردو سروس کے بہت سے پاکستانی کارکن بھی انگریز آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے وطن دشمنی پر اتر آئے تھے۔ اطہر کی تنہا ذات تھی جو اس کے خلاف ڈٹ کر مقابلہ کر رہی تھی۔ لندن کے اسی قیام کے

دوران ہم دونوں اصل معنی میں ایک دوسرے کے قریب آئے اور میں 1969ء ہی کو اپنی اور اطہر کی دوستی کا نقطہ آغاز سمجھتا ہوں۔

پاکستان واپسی پر میں فوراً ہی تبادلہ ہو کر راولپنڈی اسلام آباد کے ٹیلی ویژن اسٹیشن پر بحیثیت جنرل منیجر آگیا اور اگلے برس جب یحییٰ خاں نے الیکشن کا اعلان کیا تو ایک دن روائیداد خان نے مجھے اپنے دفتر بلا کر الیکشن ٹرانسمیشن کی ساری ذمہ داری میرے سپرد کر دی اور مجھے سارے پاکستان کے لیے جنرل منیجر الیکشن 70ء کے نام سے نئے خصوصی تشکیل دیے گئے عہدے کا چارج دے دیا گیا۔ مجھے پاکستان کے چاروں ٹیلی ویژن اسٹیشنوں کے لیے جن میں راولپنڈی، اسلام آباد، لاہور، کراچی اور ڈھاکہ شامل تھے، الیکشن کے خصوصی پروگرام ترتیب دینا تھے اور مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے نتائج کا اعلان کرنے کے لیے انتظامات کرنا تھے۔ میں نے اپنی ٹیم کے ساتھ مل کر منصوبہ بندی کی اور یہ فیصلہ کیا کہ ہر ٹی وی اسٹیشن کے ایک اسٹوڈیو کو ''الیکشن سٹی'' میں تبدیل کیا جائے گا، جہاں سے نان سٹاپ ٹرانسمیشن نشر ہوں گی۔ ہمیں ہر سٹیشن کے لیے دو دو میزبانوں کی ضرورت تھی۔ اچھے میزبان یا کمپیئر بہت کمیاب تھے۔ ایک دن اچانک بیٹھے بیٹھے مجھے اطہر علی کا خیال آیا۔ میں نے اسے لندن فون کیا اور الیکشن ٹرانسمیشن کی تفصیلات بتا دیں۔ میں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اگر وہ پاکستان میں ہوتا تو الیکشن ٹرانسمیشن کی میزبانی کے لیے نہایت موزوں سمجھا جاتا۔ اطہر ہنسا اور بولا، ''تم مجھے موزوں سمجھتے ہو، تو میں آیا جاتا ہوں۔'' ''مگر پی ٹی وی تمہیں لندن سے آنے جانے کا کرایہ نہیں دے سکتی۔'' میں نے اسے بتایا۔

''کوئی بات نہیں...... میرے لیے پاکستان کی تاریخ کے اس یادگار ٹی وی ٹرانسمیشن میں شرکت ہی بہت ہے۔ میں چھٹی لے کر آجاؤں گا۔ تم اپنے افسران سے منظوری لے کر مجھے مطلع کرو۔'' پھر ایسا ہی ہوا۔ میں نے افسران بالا سے اجازت لی۔ وہ سب اطہر سے واقف تھے۔ لہٰذا اس انتخاب پر بے حد خوش ہوئے اور اس طرح اطہر کو مدعو کر لیا گیا۔ ہمیں تین شہروں کے لیے میزبان درکار تھے۔ لاہور، کراچی اور اسلام آباد۔ میری خواہش تھی کہ اطہر اسلام آباد آئے، مگر میں نے فیصلہ خود اطہر پر چھوڑ دیا کہ وہ جس شہر کا چاہے انتخاب کر لے۔ اطہر نے اپنے پرانے شہر کراچی کو منتخب کیا اور اس طرح پاکستان ٹیلی ویژن کے طویل الیکشن ٹرانسمیشن میں میزبانی کے فرائض انجام دیے۔

دوست نوازی اطہر علی پر ختم تھی۔ میں لندن جاتا تو وہ ہیتھرو ایئرپورٹ پر مجھے لینے آتا۔ میں نے کئی بار اطہر کو کہا کہ یار یہ تکلف کیوں کرتے ہو۔ سنٹرل لندن سے ہیتھرو آنا تو بالکل ایک دوسرے شہر کا سفر ہے۔ آخر اس تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ مگر وہ ہمیشہ میری بات کو ہنسی میں ٹال دیا کرتا۔ اس کا کہنا تھا ایک تو تم سے آتے ہی ملاقات ہو جاتی ہے' ورنہ کم سے کم اگلے روز تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔ دوسرا یہ کہ ایئرپورٹ سے گھر تک جاتے ہوئے تمہیں بھی کمپنی مل جاتی ہے۔ میں نے بار بار اسے منع کیا مگر وہ نہیں مانتا تھا۔ آخر مجبور ہو کر میں نے یہ صورت نکالی کہ اسے اپنے آنے کی اطلاع دینا ہی بند کر دی۔ بس لندن پہنچنے کے بعد اسے فون پر بتاتا کہ میں آگیا ہوں۔ ایک دو بار جب ایسا ہوا تو وہ بھی سمجھ گیا اور اس نے مجھے کہا میں سمجھتا ہوں تم ایسا کیوں کرتے ہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایئرپورٹ پر نہیں آؤں گا مگر تم آنے کی اطلاع تو دے دیا کرو۔ پھر ایسا ہی ہونے لگا۔ میں اسے اطلاع دیتا اور اس کے بعد میری ساری ذمہ داری ختم ہو جاتی۔ وہ میری سرکاری مصروفیات کے بارے میں دریافت کرتا۔ کس کس سے ملنا ہے' کہاں ہاں جانا ہے' کس کس وقت اور کب کب میٹنگیں ہیں۔ ساری معلومات جمع کرنے کے بعد بقایا پروگرام ترتیب دینا اس کا کام تھا' سب سے پہلے تو وہ یہ کرتا کہ مشترکہ دوستوں کو فون پر اطلاع دیتا کہ آغا آیا ہوا ہے۔ احباب کی فہرست میں بہت سے نام تھے' جن میں صبغت اللہ قادری' منصور موجز' انعام عزیز' حبیب الرحمٰن' نسیم احمد برمنگھم میں سلیم شاہد یہاں تک کہ ویانا میں مقیم خالد حسن بھی۔ جب تک میں لندن میں رہتا' اطہر روزانہ الصبح مجھے فون کرتا اور میرا پورے دن کا پروگرام مجھے بتاتا' پوری تفصیل کے ساتھ۔ گھر سے کب نکلنا ہے۔ کہاں سے کون سی ٹرین یا بس لینی ہے۔ کون سا فاصلہ کتنے وقت میں طے ہو گا اور سرکاری کام اور میٹنگیں نمٹانے کے بعد اس سے کب اور کہاں ملاقات ہو گی۔ جب تک وہ بی بی سی میں رہا' ملاقات کا آغاز اس کے دفتر سے ہی ہوتا۔ لندن میں میرے قیام کے دوران وہ اپنے دن بھر کے پروگرام کو بھی اس طرح ترتیب دیتا کہ ہمارا زیادہ وقت ساتھ گزر سکے۔ پچیس تیس برس اس کا یہی رویہ رہا۔ جب وہ بی بی سی میں تھا' اس وقت بھی اور ریٹائر ہونے کے بعد بھی۔ میرا آنا جانا' ملنا جلنا' کام سیر و تفریح غرض لندن قیام کے دوران ساری مصروفیات اور پروگرام شیڈول کی تمام تر ذمہ داری وہ اپنے اوپر لے لیتا اور میں لندن میں ایسے رہتا جیسے مجھے خود کچھ کرنا ہی نہیں۔ مجھے علم نہیں اپنے دوسرے پاکستانی دوستوں کے ساتھ بھی اس کا رویہ یہی تھا یا نہیں مگر میں

نے لندن میں قیام کے دوران اس کو ہمیشہ ایسا ہی پایا۔ میں اس سے کہا کرتا تھا' تم مجھے اس طرح اپنی حفاظت میں لیے لیتے ہو' جیسے مرغی چوزوں کو اپنے پروں میں چھپا لیتی ہے۔ دوستوں کے لیے وہ ہر گھڑی ہر کام کرنے کو تیار رہتا۔ دوسروں کی مدد کر کے اور اپنے دوستوں کے کام آ کر اسے دلی خوشی ہوتی تھی۔

اطہر کے سینہ میں ایک دردمند دل تھا۔ نہ صرف اپنے جان پہچان والوں کے لیے بلکہ ایسے لوگوں کے لیے بھی جن سے اس کی کوئی واقفیت نہیں تھی۔ وہ حتی الوسع سب کی مدد اور ہر طرح کی رہنمائی کے لیے تیار رہتا تھا۔ اس کی موت کے بعد کراچی میں اس کے اہل خاندان کے نام ملک کے کونے کونے سے تعزیتی پیغامات اور خطوط موصول ہوئے' جن میں اطہر کے احسانات اور مہربانیوں کا ذکر تھا۔ اس کی چھوٹی بہن کا کہنا ہے کہ اطہر کے انتقال کی خبر پڑھ کر ایک شخص نے بدین سے اپنے بیٹے کو کراچی بھیجا' جس کے آپریشن کے سلسلے میں لندن میں اطہر نے بے حد مدد اور مالی تعاون کیا تھا۔ بیٹا اپنے باپ کے ساتھ اطہر کی تصویر لے کر آیا تھا' جس کو دیکھنے اطہر ہر روز ہسپتال جایا کرتا تھا۔

اسی طرح مجھے یاد ہے کہ ایک بار میں لندن میں تھا اور اطہر کو ایک طے شدہ مقام پر مجھے ملنے کے لیے پہنچنا تھا۔ میں نے بڑی دیر اس کا انتظار کیا' مگر وہ نہیں آیا۔ یہ ایک خلاف معمول بات تھی اور اطہر کے مزاج کے خلاف تھی۔ وہ اپنے وعدے کا پکا تھا اور وقت کی پابندی کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ مجھے پریشانی تھی کہ جانے کیا بات ہے۔ شام کو گھر پہنچنے کے بعد میں نے اسے فون کیا تو اس نے بتایا' کسی پاکستانی کا انتقال ہو گیا تھا اور اس کی میت اسلام آباد روانہ ہونا تھی' چونکہ متوفی غریب خاندان کا فرد تھا' اس کے اہل خانہ کے پاس پیسے نہ تھے اور نہ ان کا اتنا اثرورسوخ کہ اس کی میت کو وطن واپس بھجوانے کے لیے مناسب انتظامات کر سکیں' لہٰذا اطہر سارا دن اس کے لیے تابوت بنوانے اور پی آئی اے کے افسران سے گفت و شنید میں مصروف رہا۔ اور وقت مقررہ پر مجھے ملنے نہ آ سکا۔ اس طرح کے کام وہ اکثر کرتا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان باتوں کا وہ کسی سے ذکر نہیں کرتا تھا۔ ایک دن لندن جنگ کے دفتر میں مجھے ایک نوجوان ملا جو ریڈیو پاکستان کراچی میں میرے پاس آیا کرتا تھا۔ ان دنوں یہ نوعمر طالب علم بے حد غریب تھا۔ ریڈیو کے پروگراموں میں حصہ لے کر اپنی فیس ادا کیا کرتا تھا۔ مجھے اس کو بڑے عرصے بعد دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ اس نے بتایا وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے

لندن آ گیا ہے اور جنگ اخبار کے لیے چھوٹے موٹے کام کر کے روزی کماتا ہے۔ لیکن اس کے تعلیم کے سارے بڑے اخراجات بی بی سی اردو سروس کے پروگراموں کی فیس سے پورے ہوتے تھے۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ لندن آنے کے بعد اطہر علی سے ملا۔ کراچی میں کسی نے اس کا پتا دیا تھا اور کہا تھا وہ تمہارے مسائل کو حل کرنے میں ضرور مدد کرے گا۔ لہٰذا جب وہ اطہر سے ملا اور اپنا احوال سنایا تو اطہر نے فوراً دریافت کیا کہ تعلیمی اخراجات کے لیے اسے ماہانہ کتنی رقم درکار ہوگی اور جب اس نے تخمینہ بتایا تو اطہر نے فوراً ہامی بھر لی کہ وہ پروگراموں میں شرکت کے ذریعے ان اخراجات کا انتظام کر دے گا۔

یہ تو صرف چند قصے ہیں اور نہ جانے کتنے لوگ ہوں گے جن کی خاموشی کے ساتھ اطہر مدد کرتا رہتا تھا۔ پاکستان کی غربت پر اس کا دل بے حد کڑھتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا' اپنے ملک کے غریب لوگوں کو دیکھ کر مجھے زیادہ افسوس اس لیے ہوتا ہے کہ یہ چند مخصوص لوگوں کی عائد کردہ غربت ہے۔ جنھوں نے اپنے مفاد کے لیے لوگوں کو غربت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر رکھا ہے۔ وہ کہا کرتا تھا یہ صحیح ہے کہ پاکستان میں سرکار خوشحال اور عوام مفلوک الحال ہیں۔ لوگ ہر نئی آنے والی حکومت سے امیدیں لگاتے ہیں کہ شاید حالات سنور جائیں' لیکن بہتری کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ پاکستان کے معاملے میں اس کا رویہ ہمیشہ ایک سچے محب وطن کا ہوتا۔ اس کو اس سرزمین سے والہانہ محبت تھی' جہاں وہ نوجوانی میں اپنی ماں اور چھوٹے بھائی بہنوں کے ساتھ ہجرت کر کے آیا تھا۔ اس نے بڑے قریب سے اس ملک کو بنتے دیکھا تھا۔ دہلی سے کراچی آنے کے بعد وہ اس نئے ملک کو پیش آنے والے واقعات اور حالات اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہا تھا۔ پاکستان کی سیاسی' معاشی اور معاشرتی بے راہ روی اور زوال پذیری پر وہ اپنا دل مسوس کر رہ جاتا تھا۔ خاص طور پر جب سے کراچی شہر کے حالات خراب ہوئے تھے' اس شہر کی زبوں حالی پر اس کا دل روتا تھا۔ وہ کہتا تھا جنھوں نے اس روشن' پر رونق اور زندگی سے بھرپور شہر کی بربادیوں کا سامان کیا' ان سے بڑا ملک کا کوئی اور دشمن نہیں ہو سکتا۔

اطہر بہت باتونی آدمی نہیں تھا' مگر ہر موضوع پر اس کی معلومات اتنی زیادہ تھیں کہ وہ دیر تک گفتگو کر سکتا تھا۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ ہم جو پاکستان میں رہتے ہیں ہماری معلومات اپنے ملک کے بارے میں ان پاکستانیوں کی نسبت کم ہیں جو غیر ملکوں میں آباد ہیں یا

یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ بیرون ملک پاکستانیوں کی معلومات ہماری نسبت زیادہ صحیح ہوتی ہیں اور خاص طور پر انگلستان میں رہنے والے تو ہم سے کہیں زیادہ باعلم ہیں۔ لہٰذا لندن میں اطہر سے ملاقات ہوتی تو سب سے پہلے تو میں خود کو پاکستان کے بارے میں اپ ڈیٹ کرتا۔

اطہر ایک سنجیدہ طبیعت انسان تھا' مگر اس کے پاس قصے کہانیوں' حکایتوں' واقعات اور تذکروں کا ایسا بڑا ذخیرہ تھا کہ ہر مضمون پر بات کرنا اس کے لیے آسان تھا۔ کسی ہوٹل' ریسٹوران یا کلب میں بیٹھے ہوئے' ٹیوب یا ٹیکسی میں سفر کرتے ہوئے پیدل ٹہلتے ہوئے ہم ہمہ دم گفتگو کرتے رہتے۔ اس بات چیت میں کوئی خاص ربط بھی نہیں ہوتا تھا۔ اطہر کی عادت تھی کہ جیسے ہی اس کو کوئی بات یاد آتی وہ کہہ دیتا۔ مثلاً کلب میں بیٹھے ہوئے وہ اچانک کہتا "پارٹنر تمہیں معلوم ہے غالب کون سی شراب پیتے تھے؟" "مجھے معلوم نہیں"۔ میرا جواب سن کر وہ کہتا پچھلے دنوں ہندوستان سے اردو کے ایک بڑے محقق آئے ہوئے تھے۔ وہ غالب پر تھیسس لکھ رہے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ غالب "جن" پیا کرتے تھے۔ سفید رنگ کا یہ مشروب سہ پہر کو ان کا خادم مٹی کے چھوٹے گھڑے یا صراحی میں بھر کر برف میں لگا دیتا اور شام کو اس کے چاروں طرف پھولوں کا گجرا لپیٹ کر باہر کھلی ہوا میں چھینکے پر لٹکا دیتا اور یہ جو اردو میں لفظ الٹام ہے۔ اس کی بھی ایک نسبت ہے۔

"وہ کیا؟" "میں پوچھتا۔

"جن" بنانے والی ایک کمپنی اولڈ ٹام (Old Tom) کے نام سے ہے جو آج تک قائم ہے' لہٰذا نشہ میں مست ہو کر جب کوئی پینے والا بے سدھ ہو جائے تو لوگ (Old Tom) کے حوالے سے کہتے کہ پی کر الٹام ہو گیا۔ الٹام...... اولڈ ٹام کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔

ایک دن آکسفورڈ اسٹریٹ پر چہل قدمی کرتے کرتے اطہر نے کہا، "یار تم یحییٰ سید کو جانتے ہو؟" "ہاں کیوں نہیں۔ جب پہلی بار لندن آیا تو وہ مورننگ نیوز کے نامہ نگار تھے۔ کئی بار ملاقات ہوئی ہے"۔ ہاں وہی۔ اطہر بولا' مرحوم بہار شریف کے رہنے والے تھے۔ بڑے سیدھے آدمی تھے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ نیو ایئر پارٹی میں شریک ہو کر آدھی رات کے بعد گھر لوٹے اور چابی سے اپنے فلیٹ کا دروازہ کھولنے لگے۔ بہت دیر کوشش کی' مگر تالا کسی طرح کھلتا ہی نہ تھا۔ اسی شش و پنج میں تھے کہ برابر والے فلیٹ کا مالک ادھر سے گزرا۔ اس نے انہیں دروازہ کا تالا کھولتے دیکھا تو پکارا "سید صاحب یہ کس کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر

رہے ہیں۔ آپ کا فلیٹ تو ساتھ والا ہے۔" سید صاحب نے پلٹ کر اس کو تشکر بھری نظروں سے دیکھا اور ذرا جھینپتے ہوئے کہا "ارے بھائی ہم تو دھت تھے پھر آپ نے ہمیں پہچانا کس طرح......"

ایک دفعہ گفتگو میں زیڈ اے بخاری کا ذکر آ گیا جو اکثر آجایا کرتا تھا' چونکہ اطہر ان کے بہت قریبی عقیدت مندوں میں سے تھا۔ کہنے لگا' ایک بار میں کراچی گیا۔ بخاری صاحب سے فون پر بات ہوئی۔ انہوں نے اگلے دن آنے کے لیے کہا' مگر دوسرے دن جانے کیا معروفیات ہو گئیں کہ ذہن سے بالکل نکل ہی گیا کہ ان کی طرف جانا ہے۔ اگلے روز ان کا فون آیا' کہنے لگے "بھئی ہم تو شام سے کرسی ڈال کر چھڑکاؤ کر کے بیٹھ گئے تھے' مگر تم آئے ہی نہیں۔ اس طرح کے چٹکلے اطہر کے ساتھ ملاقاتوں کا لازمی جز تھے۔ وہ اس قدر باخبر انسان تھا اور اس کی اتنے لوگوں سے ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں کہ اس کا دامن ایسی باتوں سے ہر وقت بھرا رہتا تھا۔ ہندوستان پاکستان کے فلمی ستاروں کی باتیں' دنیا بھر کے کرکٹرز کے قصے' شاعروں اور ادیبوں اور صحافیوں کی باتیں' سیاست دانوں اور سرکاری عہدے داروں کے اسکنڈل' غرض اس کے ساتھ تھوڑا وقت گزار کر بھی طبیعت کو سیری ہو جاتی تھی۔

اطہر علی کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں پر کسی قسم کا اختلاف رائے نہیں ہے۔ ہر کوئی اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ وہ بے حد ذمہ دار اور ذہین انسان تھا۔ صحافتی اور نشریاتی حلقوں میں وہ ایک باحوصلہ صحافی اور ہر دلعزیز براڈ کاسٹر کے طور پر جانا جاتا۔ اس کو لکھنے کا سلیقہ بھی آتا تھا اور بولنے کا بھی۔ ملازمت کے آخری زمانہ میں اسے اردو سروس کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ وہ پہلا پاکستانی تھا جسے یہ اعزاز ملا' ورنہ اس عہدے پر ہمیشہ انگریز ہی مقرر کیے جاتے تھے۔ اس نے بی بی سی اردو سروس کی طرز نشریات میں نمایاں تبدیلیاں کیں اور صرف خبریں نشر کرنے کی بجائے حالات حاضرہ اور معلوماتی پروگراموں سے بھی اپنے سامعین کو روشناس کرایا۔ اس نے کھیلوں' تفریحی پروگراموں' انٹرویوز اور میگزین پروگراموں کے نت نئے سلسلے شروع کیے' جنہیں برِاعظم پاک و ہند میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ بی بی سی کی نشریات ان ملکوں میں بڑی اہمیت کی حامل تھیں اور سننے والے سچی خبریں اور بے لاگ تبصرے اپنی مادری زبان میں سننے کے لیے ہمیشہ منتظر رہتے تھے۔ سامعین کی تعداد ایسے

موقعوں پر اور بھی بڑھ جاتی تھی۔ جب علاقہ میں کسی بحران کا سامنا ہوتا مثلاً 1965ء اور 1971ء کی جنگیں، بنگلہ دیش کی تحریک، ذوالفقار علی بھٹو کا مقدمہ اور پھانسی، اندرا گاندھی کا قتل، ضیاء الحق کے سی-130 کا فضائی حادثہ وغیرہ۔ اطہر علی کی مہذب آواز خبروں کی پرکھ، غیر جانبدارانہ لہجہ، بے لاگ تبصرے، منصفانہ اسلوب تحریر اور اسلوب بیان اور نشریات کی تہذیب و ترتیب کا مخصوص طریقہ۔ ان ساری خوبیوں نے اس کو برصغیر کی نشریات کی دنیا کا ایک مقبول عام نام بنادیا تھا۔

بی بی سی سے ریٹائر ہونے کے بعد اطہر علی اپنے پرانے پیشے کی طرف لوٹ آیا جو اس کی پہلی محبت تھی۔ اس کی بیوی لن علی نے اس واپسی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"1988ء میں جب اطہر علی بی بی سی سے سبکدوش ہوا تو مجھے سخت گھبراہٹ تھی کہ وہ جو گزشتہ تیس سالوں سے صبح تا شام انتہائی مصروف رہنے کا عادی ہے، اب اپنا وقت کس طرح گزارے گا۔ میں جانتی تھی وہ اس طرح کا آدمی نہیں جو باغبانی میں اپنا وقت صرف کرے، یا پہروں کرسی پر بیٹھے سامنے سٹول پر پاؤں دھرے ٹیلی ویژن دیکھتا رہے۔ میں بہت سے لوگوں کو جانتی ہوں جو ساری زندگی مصروف رہنے اور دنیا جہاں کی سیر و سیاحت کرنے کے بعد ایسا ہی کچھ کرتے ہیں اور خوش اور مطمئن رہتے ہیں مگر مجھے معلوم تھا اطہر ایسے لوگوں میں سے نہیں ہے۔ مجھے فکر تھی پھر آخر وہ کیا کرے گا۔ لیکن ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ میں نے دریافت کر لیا وہ کیا کر رہا ہے۔ اس کے کمرے سے اس کے پرانے ٹائپ رائٹر کی کھٹ کھٹ کی آواز آنے لگی۔ میں نے سمجھا شاید اس نے اپنی وہ کتاب لکھنی شروع کر دی ہے جس کا ذکر وہ اکثر کیا کرتا تھا کہ ملازمت سے فراغت کے بعد یہ کام کرے گا، مگر میرا خیال غلط تھا۔ پھر میں نے دیکھا وہ سہ پہر ہوتے ہی کچھ ٹائپ شدہ کاغذ لے کر کسی ایسے سٹور کی طرف چلا جاتا جہاں فیکس کی سہولت میسر تھی۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ اطہر نشریات کی دنیا کو الوداع کہنے کے بعد اپنے پرانے پیشہ کی طرف لوٹ آیا تھا اور اس نے اخبار کے لیے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ کچھ دن بعد اس نے مجھے بتایا کہ وہ قارئین کی عام دلچسپی کے موضوعات پر مضامین لکھ کر کراچی کے مشہور انگریزی اخبار ڈان کو بھیجنے لگا ہے۔ اب تو ہر جگہ فیکس کی سہولتیں موجود ہیں، لیکن ان دنوں ایسا نہیں تھا۔ مجھے یاد ہے اتوار کے دن اطہر کو اپنی سٹوری یا آرٹیکل فیکس کرنے کے لیے بہت دور جانا پڑتا تھا۔ لندن کے مضافاتی علاقہ میں کھیتوں اور باغوں میں واقع

ایک پرانی عمارت میں ہمارے گھر سے میلوں دور ایک ایسا سٹور تھا جہاں سے اتوار کو چھٹی کے دن فیکس ارسال کرنا ممکن تھا اور یوں ڈان کے نامہ نگار کی حیثیت سے اطہر نے اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد کی نئی زندگی کا آغاز کیا جو آٹھ سال کے طویل عرصہ تک جاری رہنے کے بعد اس کی وفات کے ساتھ ہی ختم ہوا۔ یہ آٹھ سالہ دور اطہر کی زندگی کا بڑا ہیجان پرور اور باثمر دور تھا۔ بی بی سی ایکسٹرنل سروس کے ماحول میں بند کمروں میں' چھوٹے بڑے افسران کی ہمہ وقت موجودگی میں کام کرنے کی بجائے بالکل آزاد فضا میں اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ ایک آزاد اخبار کے خود مختار صحافی کی حیثیت سے وہ پیشہ ورانہ فیصلے خود کرتا تھا۔ نہ کوئی قدغن تھی نہ سنسر شپ۔ چاہے سیاسی خبریں ہوں' عدالتی مقدمات ہوں یا کھیلوں اور کھلاڑیوں کے مسائل' اب وہ محکماتی اور سرکاری پالیسیوں سے آزاد تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی مصروفیات میں اضافہ ہوتا گیا۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا کہ وہ صبح کسی پریس کانفرنس میں جانے کے لیے نکلتا' پھر وہیں سے کسی لنچ پر چلا جاتا اور اس کے بعد دوڑا دوڑا گھر آتا' تا کہ اپنی سٹوری ٹائپ کر کے شام تک فائل کر دے اور پھر رات کو کسی ثقافتی تقریب یا عشائیہ میں شرکت کے لیے چلا جاتا۔ اس کے علاوہ فیکس پیغامات اور ٹیلیفون کالوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا جو رات گئے تک جاری رہتا۔ اس کی ٹیلی فون نمبروں کی ڈائری حجم میں رفتہ رفتہ لندن کی ٹیلی فون ڈائریکٹری کی ہم پلہ معلوم ہونے لگی۔ یہ ڈائری آج تک میرے استعمال میں ہے اور اب بھی اگر کسی کا فون یہ معلوم کرنے کے لیے آئے کہ فلاں پاکستانی ریستوران کا ٹیلی فون نمبر کیا ہے یا کوئی کسی ایسے پاکستانی کا پتا دریافت کر رہا ہو جو لندن چھوڑ کر امریکہ یا روس جا چکا ہے' تو اس ڈائری میں مجھے یہ ساری معلومات مل جاتی ہیں اور میں اجنبی اور غیر مانوس لوگوں کو یہ معلومات فراہم کرتی رہتی ہوں۔"

لِن کا کہنا ہے کہ اخباری صحافت کے پیشہ میں واپسی کے بعد اطہر نے بڑی بڑی دلچسپ اور اہم خبریں اپنے اخبار کو ارسال کیں۔ خاص طور پر بی سی سی آئی کے زوال اور اس کے متعلق عدالتی کارروائی۔ پاکستان کے وزرائے اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف کے بینک اکاؤنٹ اور انگلستان میں جائیدادوں کے معاملات۔ عمران خان کے خلاف بوتھم اور ایلن لیمب کے مقدمات وغیرہ

اطہر کو اپنے کام سے اس درجہ رغبت تھی کہ وہ کبھی تھکاوٹ یا اکتاہٹ محسوس نہیں

کرتا تھا۔ اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کی بجا آوری کے لیے وہ ہمیشہ مستعد رہتا۔ ہر نیا دن اس کے لیے ایک بھرپور اور مصروف دن ہوتا تھا۔ وہ ہر روز پہروں اپنے پرانے دستی ٹائپ رائٹر پر بیٹھا اخبار کے لیے خبروں کی کہانیاں ٹائپ کرتا رہتا۔ یہ ٹائپ رائٹر اس کو بے حد عزیز تھا۔ اس نے اس کے ساتھ ملک ملک کا سفر کیا تھا اور بچوں کے اصرار کے باوجود وہ اسے چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔ گھر میں لگی فیکس مشین سے اطہر کا گہرا تعلق تھا۔ کبھی کبھی جب اسے لن کے ساتھ کہیں جانا ہوتا تو وہ جلدی جلدی فیکس پر اپنی اسٹوری فیڈ کرتا اور اگر ترسیلی نظام میں خرابی کے باعث اس کی اسٹوری ارسال نہ ہو پاتی تو وہ بہت جھنجلاتا۔ لن کو اس کی بڑی شکایت تھی کہ جب شام کو کسی دن ان کا گپ لگانے کا موڈ ہوتا اور وہ چائے کی کیتلی چولہے پر رکھ کر آرام سے بیٹھ کر گفتگو کرنے کے لیے بیٹھتے تو عین اسی وقت فیکس پر دھڑا دھڑ کاغذ نکلنے شروع ہو جاتے۔ عام طور پر یہ ایم کیو ایم لندن آفس سے جاری پریس ریلیز کے صفحات ہوتے جن کی تعداد کبھی چودہ پندرہ سے کم نہ ہوتی۔ اطہر ان کو MQM Hour کہا کرتا تھا اور جیسے ہی فیکس کی گھڑگھڑاہٹ شروع ہوتی تو وہ کہتا لو مزید کام آرہا ہے۔

اطہر کو اپنے گھر پر مہمان بلانے کا بھی بے حد شوق تھا۔ جب کبھی پاکستان سے یا کسی اور ملک سے اس کا کوئی قریبی ملنے والا لندن آتا تو اطہر اپنے گھر پر احباب کو مدعو کرتا۔ ایسی محفلیں بڑی یادگار ہوتیں اور بعض اوقات تو نصف شب کے بعد تک جاری رہتیں۔ میں نے آخری بار ایسی محفل میں 1993ء میں شرکت کی تھی۔ جب اس نے مجھے اور میری بیوی کو کھانے پر بلایا تھا۔ یہ اگست کا مہینہ تھا اور چند دن پہلے مجھے حکومت پاکستان کی جانب سے صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی دیئے جانے کا اعلان ہوا تھا۔ اس نے دعوت میں لندن کے ایسے بہت سے لوگوں کو بلایا تھا جو میرے دوست تھے۔ سلیم شاہد خاص طور پر برمنگھم سے آیا تھا۔ سلیم شاہد سے ہم دونوں کو بڑی محبت تھی۔ وہ بی بی سی ٹیلی ویژن سے ریٹائر ہونے کے بعد برمنگھم ہی میں مقیم تھا اور وہاں ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔ مجھے یاد ہے اسی محفل میں مجھے اطہر نے علیحدگی میں کہا تھا "یار یہ سلیم شاہد برمنگھم میں بالکل اکیلا رہتا ہے۔ اس کی صحت بھی ٹھیک نہیں رہتی ہے۔ میں نے کئی بار کہا ہے کہ لندن آجاؤ اور ہمارے قریب کوئی مناسب سا گھر لے لو مگر وہ سنی ان سنی کر دیتا ہے۔ ذرا موقع دیکھ کر تم بھی کسی وقت بات کرو"۔ میں سلیم شاہد سے بات تو نہ کر سکا مگر اتفاق دیکھیں کہ سلیم کو لندن آنے کا مشورہ دینے والا اطہر

خود سلیم شاہد سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

اطہر کے قریبی دوستوں میں خالد حسن خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جب تک وہ لندن میں الطاف گوہر صاحب کے سات تھرڈ ورلڈ میں کام کرتا رہا' اطہر سے اس کی ملاقاتیں روزانہ کا معمول تھیں۔ پھر جب وہ ویانا چلا گیا۔ تب بھی لندن متواتر اس کا آنا جانا رہا۔ خالد حسن نے اطہر کی موت پر جو کالم لکھا جی چاہتا ہے اس کے کچھ حصے اپنے اس خاکے میں شامل کروں۔ اس نے لکھا تھا میرے دوست اطہر علی کا شمار یقیناً مشاہیر میں ہوتا ہے۔ اس نے صحافی کی حیثیت سے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کیا اور پھر اخبار چھوڑ کر بی بی سی کی اردو سروس سے مسلک ہو گیا اور آخر دنوں میں پھر سے واپس اخبار میں آ گیا۔ اپنی اہلیت اور خدا داد صلاحیت کی بنا پر اس نے صحافت کے شعبے میں بڑا نام پیدا کیا۔ اس کی وفات سے تھوڑا ہی عرصہ پہلے میں امریکہ سے پاکستان آتے ہوئے اس سے لندن میں ملا تھا۔ مجھے یاد ہے ہم سلوز میں لنچ پر مدعو تھے اور وہیں اسے کھانا کھاتے ہوئے چھوڑ کر میں ایئرپورٹ کے لیے روانہ ہوا تھا۔ جب میں زینے سے جلدی جلدی اتر رہا تھا تو اس نے پکار کر کہا تھا۔ ''پارٹنر چند ہفتوں بعد پھر ملاقات ہو گی'' مگر یہ ملاقات نہ ہو سکی۔ چند روز بعد میں نے یہ خبر اسلام آباد میں سنی جہاں میں اپنے کسی ملنے والے کے گھر کسی کی تعزیت کرنے گیا تھا۔ وہاں کسی نے میرے سامنے اس دن کا اخبار رکھ دیا' جس کے پہلے صفحہ پر اطہر کی تصویر تھی' مگر اس کے لکھے ہوئے کسی آرٹیکل کے ساتھ نہیں بلکہ اس کی موت کی خبر کے ساتھ۔

مجھے یاد نہیں میں اطہر سے پہلی بار کب ملا تھا' مگر اس بات کو کم از کم تیس سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ جب لاہور میں ایک شام مشہور فلم سٹار سنتوش کمار کے گھر اس سے میرا تعارف ہوا۔ اطہر لندن سے آیا ہوا تھا اور میں نے انہیں دنوں نیا نیا صحافت کے میدان میں قدم رکھا تھا۔ پھر اس کے بعد جب میں پہلی بار لندن گیا تو اطہر سے طویل ملاقاتوں کا سلسلہ رہا۔ اس سے گپ شپ کے لیے دو جگہیں مخصوص تھیں۔ ایک بی بی سی کلب اور دوسرے اسٹرینڈ کا ایک ہوٹل اطہر ان دنوں کوئنز گیٹ کے علاقہ میں رہا کرتا تھا اور اپنی ہونے والی بیوی لن آسٹن کی محبت میں گرفتار تھا جو خود بھی بی بی سی میں کام کرتی تھی۔ شادی کے بعد وہ ایک بے حد محبت کرنے والی اور وفادار بیوی ثابت ہوئی۔

خالد حسن نے اطہر کو بہت قریب سے دیکھا۔ اس کا کہنا ہے ''آج جب کہ محب وطن

کی اصطلاح کثرت استعمال سے مضحکہ خیز اور بے معنی ہو کر رہ گئی ہے' میں بلا جھجک یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ اگر میں نے زندگی میں صحیح معنی میں کوئی محبِ وطن پاکستانی دیکھا تو وہ اطہر علی تھا۔ اس کو اپنی عزت نفس اور خودداری کا بڑا پاس تھا اور وہ اس بات پر فخر کرتا تھا کہ وہ ایک پاکستانی ہے۔ بی بی سی میں اس کی عام شہرت یہ تھی کہ وہ اپنے ملک کی قدر و منزلت اور احترام کے سلسلہ میں نہ کوئی دباؤ برداشت کرتا ہے اور نہ اپنے دوسرے بہت سے ساتھیوں کی طرح گورے افسروں کے ایما پر دھڑے بندیوں اور سازشوں میں ملوث ہوتا ہے۔ وہ ایک نہایت ذمہ دار براڈکاسٹر اور نڈر صحافی تھا اور سر تا پا پیشہ ورانہ خصوصیات کا جیتا جاگتا نمونہ تھا۔ اس کو خبر لکھنے اور اس کی تراش خراش میں خاص مہارت تھی۔ نہایت تیز رفتار مستند اور باصلاحیت۔ اگرچہ وہ سلیم شاہد یا حمید نسیم کی طرح ریڈیو کا آدمی نہیں تھا' مگر بی بی سی کے نشریات کے شعبے میں بھی اس نے بڑا نام پیدا کیا۔ میرا خیال ہے اس جیسے لوگ اس شعبے میں بہت کم ملیں گے"۔

لندن میں اطہر علی کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اپنے ان بے شمار دوستوں کے لیے جو لندن آتے جاتے رہتے یا مستقل طور پر وہاں رہائش پذیر تھے' وہ ہر وقت ہر قسم کے تعاون اور میزبانی کے لیے تیار رہتا۔ وہ دوستوں کا دوست تھا اور کسی بھی ضرورت کے وقت ان کے کام آنا اس کے کردار کا اٹوٹ انگ تھا۔ میرے خیال میں اس نے ساری زندگی اپنے کسی دوست کو مایوس نہیں کیا۔ جن سے بھی اس کا دوستی کا رشتہ تھا' ان سے اس نے تاعمر وفاداری نبھائی۔ اگر اسے کبھی کوئی بات ناگوار گزرتی تو وہ بلا جھجک اور برملا اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دیا کرتا تھا۔ اس کو منافقت' غیبت اور عیب جوئی سے شدید نفرت تھی۔ ایسی باتوں اور ایسے لوگوں کے لیے اس کی زندگی میں کوئی جگہ نہ تھی۔ اطہر کی ایک بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ وہ لوگوں کو اور معاملات کو مکس اپ نہیں کرتا تھا۔ اس نے ہر ایک کے لیے علیحدہ علیحدہ خانے بنائے ہوئے تھے۔ خانگی معاملات' دفتری مصروفیات' بڑے لوگوں سے رسمی میل ملاقات اور قریبی دوستوں اور عزیزوں سے تعلقات زندگی کے ان سارے شعبوں میں اس کے رویے بڑے واضح اور دوٹوک تھے۔ میں نے اسے کبھی کسی الجھن میں مبتلا نہیں دیکھا' چونکہ وہ کسی بھی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ وہ منصوبہ بندی کا ماہر تھا اور کسی بھی مسئلہ کا فیصلہ کرنے میں تاخیر نہیں کرتا تھا۔ اس کے فیصلے ہمیشہ منصفانہ اور جرأت

مندانہ ہوتے تھے۔ میں پاکستان میں اور لندن میں بھی اس کے بہت سے ملنے والوں کو جانتا ہوں‘لیکن میں نے کبھی کسی کو اس کی شکایت کرتے نہیں سنا۔ ویسے دوستوں کے انتخاب میں وہ خود بڑا محتاط تھا۔ جو لوگ اس کی طبیعت کے ساتھ مطابقت نہ رکھتے ہوں‘ان کے ساتھ تعلقات کو اس نے کبھی رسمی حدود سے تجاوز نہیں ہونے دیا۔ اسی لیے اکثر لوگوں کا خیال تھا اور شاید صحیح تھا کہ اطہر بڑا کم آمیز اور الگ تھلگ رہنے والا آدمی ہے۔ اپنے قریبی دوستوں کے علاوہ عام لوگوں کے لیے وہ واقعی ایسا تھا۔ سنجیدہ کم گو اور دیر آشنا۔

اطہر چلا گیا اور اس کے جانے سے جانے کتنے تھکے ہارے مسافر اس سایہ دار درخت کی گھنی چھاؤں سے محروم ہو گئے۔ میری طرح اطہر کے بہت سے اور دوستوں کا بھی یہی خیال ہے کہ اس کے بعد لندن میں وہ جاذبیت اور کشش نہیں رہی۔ شہروں کی اپنی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ بستیاں تو اپنے مکینوں کے حوالے سے پہچانی جاتی ہیں۔ ہر بستی اور ہر شہر کی اپنی خوشبو اور اپنی روشنی ہوتی ہے جو وہاں کے بسنے والوں کی محبت اور خلوص سے جنم لیتی ہے۔ اطہر کے بعد اس کے دوستوں کے لیے لندن شہر اس خوشبو اور اس روشنی سے محروم ہو گیا ہے۔

غفاری بیگم

''آغا رے او آغا'' ہر روز صبح کے سناٹے میں ایک دلنشیں' شفقت بھری شیریں آواز گونجتی تھی۔ میں برس ہا برس یہ آواز سنتا رہا۔ فرید نگر کے بنگلہ میں' کراچی کے مارٹن روڈ کے چھوٹے سے کوارٹر میں' لاہور کے شاہ جمال کے خوبصورت گھر میں اور اسلام آباد کے ای سیون کی وسیع و عریض کوٹھی میں۔ یہ میری ماں کی آواز تھی جو منہ اندھیرے مجھے نیند سے بیدار کرتی تھی۔ پھر ایک دن یہ آواز معدوم ہو گئی۔ اس عالم رنگ و بو میں چوراسی سال گزارنے کے بعد میری ماں رخصت ہو گئی۔ لیکن آج بھی کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کہیں دور سے کوئی مجھے پکار رہا ہے ''آغا رے او آغا''......

جہاں تک میری یادداشت ساتھ دیتی ہے' مجھے اماں جی اس وقت سے یاد ہیں جب میری عمر چار یا پانچ سال تھی۔ میرے ذہن میں جوان کی پہلی تصویر ابھرتی ہے وہ ان دنوں کی ہے جب ہم فرید نگر میں رہتے تھے اور گھر میں ان دنوں جن اہم واقعات کا ذکر میں سنتا تھا' ان میں علامہ اقبال کی وفات' ہٹلر کا فرانس اور انگلستان پر حملہ اور باجی جان کی شادی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

فرید نگر یوپی کے شہر میرٹھ کے ضلع میں واقعہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ آبادی چند ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ بستی کا اپنا ایک ڈاک خانہ اور پولیس چوکی تھی۔ ایک پرائمری سکول تھا اور ایک بڑا بازار جو دو حصوں میں تقسیم تھا۔ بڑے حصے میں زیادہ تر بڑی دکانیں تھیں جو نسبتاً مالدار لوگوں کی تھیں اور یہ سب ہندو تھے۔ بازار کے چھوٹے حصے میں جسے چھوٹا بازار یا ''بزریا'' کے نام سے پکارا جاتا تھا' مسلمانوں کی دکانیں تھیں جن میں قصائی' درزی' سبزی فروش' پنساری اور پرچون فروش شامل تھے۔ فرید نگر کی آبادی محلوں کے

لحاظ سے چار حصوں پر مشتمل تھی۔ سب سے اچھے مکان بنیوں کے علاقے میں تھے۔ اس محلّہ کی گلیاں پکی تھیں اور سڑک کے علاوہ بعض گھروں میں بجلی بھی موجود تھی۔ ہندوؤں کا دوسرا محلّہ نسبتاً کم خوشحال لوگوں کا تھا۔ مسلمانوں کے بھی دو محلّے تھے۔ ایک نچلے طبقہ کا جس میں تیلی، فقیر، قصائی اور کھیت مزدور رہتے تھے جبکہ دوسرا بلوچوں کا تھا جس کو گڑھی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

فرید نگر کے قصبہ سے باہر تقریباً ایک میل دور سنٹر ٹیچرز ٹریننگ سکول واقع تھا جو کئی ایکڑ علاقے پر پھیلا ہوا تھا۔ اس کے احاطہ میں سکول کی عمارت کے علاوہ ہوسٹل، ملازموں کے کوارٹر، میس، باورچی خانے اور رسوئیاں، کھیل کے میدان اور بہت بڑے رقبہ پر ایک زرعی فارم بھی تھا۔ اس ٹیچرز ٹریننگ سکول میں طالب علم ایک سال کے لیے آتے اور یہاں سے ڈپلومہ حاصل کرنے کے بعد اپنے اپنے علاقوں کے پرائمری سکولوں میں مدرس مقرر ہو جاتے۔ ہر سال تقریباً پچیس تیس طالب علم اس تربیت گاہ میں آتے تھے جو ''پیوپل ٹیچر'' کہلاتے تھے، مگر عام بول چال میں انہیں ''منشی لوگ'' کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ اگرچہ کوئی باقاعدہ کوٹہ سسٹم تو رائج نہیں تھا، مگر عام طور پر ان ''پیوپل ٹیچروں'' میں پندرہ سولہ ہندو، سات آٹھ مسلمان اور چار پانچ اچھوت ہوتے تھے۔ ہوسٹل میں رہائشی کمرے بھی اسی تناسب سے بنائے گئے تھے۔ تین کمرے ہندوؤں کے لیے، دو کمرے مسلمانوں کے لیے اور ایک اچھوتوں کے لیے۔ کھانا پکانے کا انتظام علیحدہ علیحدہ تھا۔ مسلمان کا باورچی خانہ الگ تھا ہندوؤں کی رسوئی کے باورچی کو ''مہاراج'' کہا جاتا تھا۔ ہندو پیوپل ٹیچر رسوئی میں بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے جب کہ اچھوتوں کو ہندوؤں کی رسوئی کے دروازے کے باہر قطار لگانا ہوتی تھی، جہاں کہاران کو رسوئی کے اندر سے کھانا لا کر دیتا تھا۔ ان کے کھانے کے برتن بھی جدا تھے، جنہیں وہ خود ہی دھوتے تھے۔ سکول میں کام والے ملازموں کی تعداد سولہ سترہ افراد پر مشتمل تھی۔ ان میں دو تین مالی بھی شامل تھے جو زرعی فارم پر کام کرتے تھے۔ زراعت کا مضمون ٹریننگ کورس کا حصہ تھا اور سارے پیوپل ٹیچرز کو خود مختلف اقسام کی سبزیوں، فصلوں اور پھلوں کی کاشت کرنا ہوتی تھی۔ سکول کے دیگر کاموں کے لیے چار پانچ ملازم اور تھے جن میں سب سے زیادہ اہم پرنسپل یا ہیڈ ماسٹر کا چپڑاسی تھا۔ سکول کا ٹیچنگ سٹاف صرف پانچ افراد پر مشتمل تھا جن میں ایک ہیڈ ماسٹر یا پرنسپل اور چار ماسٹر تھے۔ ہیڈ ماسٹر سنٹرل

ٹریننگ سکول کا سربراہ تھا اور تعلیم و تربیت کے علاوہ ادارے کا ایڈمنسٹریشن، مالی امور اور دیگر معاملات اسی کی ذمہ داری تھے۔ میرے والد اس عہدے پر فائز تھے اور فرید نگر کے قصبے میں "بڑے ماسٹر صاحب" کے نام سے مشہور تھے۔

پرنسپل یا ہیڈ ماسٹر کی رہائش گاہ سکول کے احاطے ہی میں تھی جس میں ہم لوگ رہتے تھے ویسے تو یہ ایک چھوٹا سا بنگلہ نما گھر تھا مگر اگر دیکھا جائے تو اس چھوٹے سے گھر کے باہر کئی ایکڑ زمین پر پھیلا ہوا سارا رقبہ بھی اسی کے مکینوں کے تصرف میں تھا۔ اباجی کے اوپر کوئی افسر نہ تھا۔ ہاں سال دو سال میں ایک مرتبہ انگریز انسپکٹر آف سکول دورے پر آتا تھا۔ اس کی آمد سے یہ احساس بھی ہو جاتا تھا کہ ملک میں انگریزوں کی حکومت ہے۔

ہم کل چھ بہن بھائی تھے۔ ایک بہن اور پانچ بھائی۔ میں سب سے چھوٹا تھا۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو میری بہن کی شادی ہو گئی تھی۔ مجھے باجی جان کی شادی ویسے تو یاد نہیں، لیکن بڑا ہو کر ان کے دلہن بنے، سرخ جوڑے میں پری کی طرح خوبصورت لگنے اور رخصتی کے وقت اماں جی کے بے ہوش ہونے کے قصے اتنی بار سنے تھے کہ مجھے یہ گمان ہونے لگا تھا جیسے یہ سب میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ میرے بڑے تین بھائی میرٹھ میں زیر تعلیم تھے۔ ایک فیض عام کالج میں اور دو گورنمنٹ ہائی سکول میں چوتھے بھائی جو مجھ سے پانچ سال بڑے تھے وہ چار کوس دور بیگم آباد کے ایک سکول میں پڑھنے جایا کرتے تھے۔

میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد آرام، آسائشوں، سہولتوں اور سکون کا جو ماحول دیکھا، اس کو ساری زندگی بھول نہیں سکتا۔ ہر طرح کی خدمت انجام دینے کے لیے نوکروں کی ایک پوری کھیپ تھی جو ہر وقت مستعد رہتی۔ ورزش اور کھیلوں کے لیے ہر طرح کی سہولتیں تھیں۔ والی بال کے نیٹ، ہاکی اور فٹ بال کے میدان، ورزش گاہیں اور قسم قسم کے انڈور گیم۔ سبزی ترکاری اور بہت سے پھل جو سکول کے تجرباتی زرعی فارم میں کاشت ہوتے تھے، سب سے پہلے ہمارے گھر بھیجے جاتے تھے۔ سکول میں کام کرنے والا سارا عملہ سکول کے پرنسپل کے ماتحت تھا، لیکن دراصل پرنسپل سے زیادہ یہ احکامات کے لیے اماں جی کی طرف دیکھتے تھے جو اس ادارہ میں خاتون اول کی حیثیت رکھتی تھی۔ ویسے بھی اماں جی میں انتظامی امور کی اتنی صلاحیتیں تھیں کہ اباجی کی شخصیت ان کے سامنے ماند پڑ جاتی تھی۔ اباجی بڑے قناعت پسند، درویش صفت اور الگ تھلگ رہنے والے آدمی تھے۔ وہ اس زمانے کے

علی گڑھ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے۔ جب مسلمانوں کے گھرانوں میں تعلیم کا رواج اتنا زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ انہوں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز غالباً گورکھپور کے کسی سکول سے کیا تھا۔ پھر کافی عرصہ سہارنپور میں رہے تھے اور 1932ء سے فرید نگر کے سنٹر ٹریننگ سکول کے سربراہ کے طور پر کام کر رہے تھے۔ اباجی کی دیانت' ذہانت اور قناعت پسندی کی شہرت نہ صرف سارے خاندان میں تھی بلکہ ان سے تھوڑی واقفیت رکھنے والے لوگ بھی ان کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔ میں ان کے بہت سے ایسے شاگردوں کو جانتا ہوں جو اباجی کے زیر تعلیم رہے اور بعد میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے' مگر اپنے قابل احترام استاد کو نہیں بھولے۔ ہم لوگوں کے کراچی آجانے کے بعد بھی ان کے ایسے بہت سے شاگردان کو ملنے آتے رہتے تھے۔

اباجی اور اماں جی کی طبیعتوں میں بہت فرق تھا۔ دونوں کا خاندانی پس منظر بھی مختلف تھا۔ ویسے تو ایک ہی بستی کے رہنے والے تھے اور دور دراز کی کچھ رشتہ داری بھی تھی' مگر دونوں خاندانوں کا رہن سہن کافی مختلف تھا۔ اباجی کا خاندان صوفیا اور اولیاء کا خاندان تھا۔ ان کے خاندان کے اکثر افراد سرکاری ملازمتوں میں تھے' جن کی بڑی تعداد ریلوے کے محکمے سے متعلق تھی۔ اباجی کے دادا مانے ہوئے بزرگ تھے اور باقاعدہ پیر سمجھے جاتے تھے۔ وہ شاہ صاحب کے لقب سے مشہور تھے اور ان کے مریدوں کا ایک وسیع حلقہ تھا۔ ویسے وہ بھی ریلوے کے محکمے میں ملازم تھے اور کہتے ہیں پہلی تاریخ کو گھر آتے ہوئے راستے میں ہی اپنی ساری تنخواہ غریبوں میں بانٹ دیتے تھے۔ اباجی اور ان کے خاندان کا رہن سہن بہت سادہ تھا۔

اس کے برعکس اماں جی کا خاندان نسبتاً خوشحال تھا اور ان کے طور طریقے زمینداروں اور رئیسوں جیسے تھے۔ ہمارے نانا ترائی کے جنگلات میں درختوں کے ٹھیکہ دار تھے۔ وہ بڑی پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ بڑے پر شکوہ اور وجیہہ۔ نانا سال میں ایک بار ہمارے ہاں فرید نگر آتے تھے۔ چوڑی دار پاجامہ' سفید شیروانی' سر پر بڑا صافہ' پاؤں میں گرگابی' سینہ تان کر اس طرح چلتے تھے جیسے کسی ریاست کے نواب ہوں۔ عادتیں بھی ساری نوابوں والی تھیں۔ مثلاً شکار' قوالی' مشاعرے' خود بھی شاعر تھے۔ جتنے دن ہمارے ہاں آکر رہتے تو گھر میں بڑی رونق ہو جاتی۔ اماں جی اپنے والد کے لیے جنہیں وہ میاں جی کہا کرتی تھیں' انواع و

اقسام کے کھانے پکاتیں۔ گھر کے باہر نانا میاں کے ٹھہرنے کے لیے ایک بڑا چھپر کا سائبان خاص طور پر ڈالا جاتا تھا' کیونکہ انہیں بند کمروں میں سونے کی عادت نہیں تھی۔ ان کے لیے سٹور سے حقہ نکلوایا جاتا اور قصبہ سے ان کی پسند کے مخصوص تمباکو منگوائے جاتے۔ جتنے روز نانا میاں قیام کرتے' گھر میں مشاعرے ہوتے۔ قصبہ کے دو چار اچھی آواز والے لڑکوں کو بلا کر ان سے بیدم' فانی' آرزو' سیماب اور داغ کا کلام سنا جاتا۔ آس پاس کے دیہاتوں میں منعقد ہونے والے عرس اور قوالی کی محفلوں میں شرکت کی جاتی۔

اماں جی کی صرف ایک بہن تھیں جو دہلی میں رہتی تھیں۔ انہیں میں ''اماں'' کہہ کر پکارتا تھا اور اپنی والدہ کو ''امی'' کہتا تھا۔ میرے علاوہ ہر کوئی انہیں اماں جی کہتا تھا۔ خاندان کے سارے لوگ جان پہچان والے یہاں تک کہ سکول کے نوکر چاکر بھی۔

اس طرح وہ جگت اماں جی بن گئیں۔ بعد میں ان کی بہوئیں' داماد' بھانجے' بھانجیاں' پوتے' پوتیاں' نواسے' نواسیاں غرض ہر کوئی انہیں اسی نام سے پکارنے لگا۔ اماں جی کہنے والوں میں بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو عمر میں ان سے بڑے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد جب ہم لوگ ہجرت کر کے کراچی آگئے تو وہاں بھی سارے محلے والے' دکاندار' میرے اور بھائیوں کے دوست' غرض سب ہی کے لیے وہ اماں جی تھیں۔ صرف میں اکیلا تھا جو انہیں امی کہا کرتا تھا اور ان کو یہ بے حد پسند تھا۔ اگر کبھی میں غلطی سے انہیں اماں جی کہہ دیتا تو وہ خفا ہو جاتی تھیں اور کہتی تھیں لے اب تو بھی اماں جی کہنے لگا ہے مجھے' ہیں!

اماں جی کو پرانے قصے سنانے کا بڑا شوق تھا۔ انداز بیان بھی بڑا دلچسپ ہوتا تھا جو غالباً انہوں نے ہمارے نانا میاں سے سیکھا تھا۔ ان کی یادداشت بہت اچھی تھی۔ برسوں پرانے واقعات اس طرح سناتی تھیں جیسے کل کی بات ہو۔ ہر واقعہ کی ایک ایک تفصیل یاد ہوتی تھی' چاہے وہ کتنا ہی پرانا کیوں نہ ہو۔

ابا جی سے اپنی شادی کا قصہ بڑے مزے لے لے کر سنایا کرتی تھیں۔ ''اصل میں تمہارے ابا جی کا پیام تو بُنیا کے لیے آیا تھا' میری عمر تو اس وقت صرف گیارہ سال کی تھی۔ تو جب تمہارے ابا والوں کی طرف سے بُنیا کے لیے رشتہ آیا تو میاں جی نے کنبہ والوں کے مشورے کے بعد کہلا بھیجا کہ یہ رشتہ منظور ہے۔ یہ لوگ قریبی رشتہ دار تو نہیں تھے مگر برادری ایک ہی تھی۔ یہ لوگ نچنا ندی کے دوسری طرف والے محلے میں رہتے تھے اور

پار والے کہلاویں تھے۔ پار والوں کو ہم خاص افضل گڑھ کے رہنے والے اپنے سے ذرا کم سمجھیں تھے' مگر چونکہ ان کے خاندان کی شرافت اور نیکی کی بڑی دھوم تھی' اس لیے میاں جی نے رشتہ کے لیے ہامی بھر لی تھی۔ پھر یہ بھی تھا کہ لڑکا بہت تعلیم یافتہ تھا اور علی گڑھ میں پڑھتا تھا۔ تو جب بات پکی ہونے کے بعد گرمیوں کی چھٹیوں میں تمہارے ابا افضل گڑھ آئے تو میاں جی نے اپنے ہونے والے داماد اور اس کے گھر والوں کی دعوت کی۔ سب آئے تھے' مجھے یاد ہے باہر دالان میں سفید چاندنی بچھائی گئی تھی اور پیلے رنگ کا بڑے بڑے پھولوں والا دستر خوان درمیان میں بچھا تھا۔ میاں جی کو کھانے پینے کا خود بھی بڑا شوق تھا اور اس دن تو ہونے والے داماد کی دعوت تھی' اس لیے ایسے ایسے لذیذ کھانے پکوائے تھے کہ آدمی انگلیاں چاٹتا رہ جائے۔ ظاہر ہے بیا تو اندر کمرے میں چھپی بیٹھی تھی اور میں تھی کے سارے گھر میں ناچتی پھر رہی تھی۔ سالن کے ڈونگے' پلاؤ کی قابیں لے کر دالان میں آ جا رہی تھی اور چور نگاہوں سے اپنے ہونے والے دولہا بھائی کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے لٹھے کا عرض کے پائینچوں والا پاجامہ اور نیلے رنگ کی دھاری دار قمیص پر فاختی رنگ کا دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا۔ میں بار بار اپنے ہونے والے دولہا بھائی کے سامنے قابیں اور رکابیاں جا کر رکھتی اور پھر اندر جا کر بیا کو بتاتی کہ تیرا ہونے والا میاں تو بہت ہی کم کھاتا ہے۔ دعوت چلتی رہی۔ مرد ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے اور تیسرے پہر کے بعد یہ لوگ واپس چلے گئے۔ اور لو جی شام کو وہاں سے یہ خبر آ گئی کہ لڑکا تو کہتا ہے کہ میں چھوٹی سے شادی کروں گا۔ اب میاں جی نے اور خاندان کے دوسرے بزرگوں نے لاکھ سمجھایا کہ چھوٹی بہت کم عمر ہے' مگر تمہارے ابا کو تو جیسے ضد سوار ہو گئی تھی۔ انہوں نے کہا آپ جب تک کہیں ہم انتظار کر سکتے ہیں' مگر بیاہ چھوٹی کے ساتھ ہی کرنا ہے۔ جب وہ لوگ کسی طرح نہ مانے تو میاں جی کو بھی آخر کار راضی ہونا ہی پڑا۔ طے یہ پایا کہ نکاح فوراً کر دیا جائے گا اور رخصتی چار پانچ سال کے بعد ہو گی۔ تو بھیا ہمارے ساتھ تو وہ حساب ہوا چٹ منگنی اور پٹ بیاہ۔ بیا کا ایک اور جگہ سے بھی پیام آیا ہوا تھا۔ اس کی شادی طے پا گئی اور اس طرح ہم دونوں بہنیں ساتھ ساتھ ہی نمٹ گئیں"۔

"تو پھر اماں جی اس طرح تو آپ کی اور ابا جی کی لو میرج ہوئی نا۔ کوئی سوال کرتا تو اماں جی جواب دیتیں "ہاں ایک طرف سے تو یہ ہی ہوا' پر مجھے اتنی کم عمری میں اچھے برے کی بھلا کیا تمیز تھی۔ اگر لو میرج بھی تھی تو تو بس سمجھوان کی طرف سے ہی تھی۔"

اسی طرح اماں جی کبھی کبھی نانا میاں اور سلطانہ ڈاکو کی ملاقات کا قصہ بھی سنایا کرتیں۔ سلطانہ ڈاکو کا ان دنوں روہیل کھنڈ' بجنور اور ترائی کے سارے علاقے میں بڑا شہرہ تھا۔ گاؤں گاؤں' قصبہ قصبہ اس کے چرچے تھے۔ اماں جی بتاتی تھیں کہ ایک بار سلطانہ ڈاکو افضل گڑھ بھی آیا تھا۔

"لو بھیا اب ہوا یہ کہ جاڑوں کا موسم مہاوٹوں کا زمانہ۔ میاں جی کڑکڑاتی سردی میں مویشیوں کے گھیر میں چھپر تلے سو رہے تھے کہ کسی نے ان کے کاندھے کو ہلایا۔ یہ جو جاگے تو کیا دیکھیں ہیں کہ یک لمبا چوڑا آدمی' منہ پر ڈھاٹا باندھے' کمبل اوڑھے سامنے کھڑا ہے۔ میاں جی ہڑبڑا کر اٹھے۔ اس نے ان کے کاندھے تھپتھپاتے ہوئے بڑے نرم لہجے میں کہا' خان صاحب گھبرائیں مت ہم یہاں آپ کی بیٹھک میں تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتے ہیں۔ تڑکا ہونے سے پہلے ہی چلے جائیں گے۔" اب میاں جی پوری طرح بیدار ہو چکے تھے۔ چارپائی پر پاؤں لٹکا کر سیدھا ہو کر بیٹھ گئے اور اب جو انہوں نے دیکھا تو چاروں طرف پندرہ بیس آدمی اور تھے۔ سب کے سب کمبل اوڑھے' پگڑیاں باندھے اور اپنے چہروں کو پگڑیوں کے پلوں میں چھپائے۔ قریب کھڑے ہوئے آدمی نے پھر ان سے کہا "خان صاحب اگر ہو سکے تو میرے آدمیوں کو چائے پلوا دیں۔ سردی بہت زیادہ ہے۔" میاں جی سمجھ گئے کہ یہ لوگ ٹھیک نہیں ہیں' لہٰذا ان کی بات سے انکار مصیبت کو دعوت دینا تھا۔ انہوں نے اپنے قریب دوسری چارپائی پر سوئے ہوئے نور کو آواز دی۔ وہ جاگا تو اتنے سارے آدمیوں کو دالان میں دیکھ کر سہم گیا۔ میاں جی نے کہا "صدیق اٹھو' مہمان آئے ہیں' ان کے لیے چائے تیار کرواور دیکھو اگر کھانے کے لیے بھی کچھ ہو۔" صدیق کچھ گھبرایا ہوا اور کچھ پریشان اٹھا۔ حکم کی بجا آوری کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے گڑ کی چائے تیار کی اور رات کی بچی ہوئی بگڑ کی روٹیوں کے ساتھ مہمانوں کے سامنے پیش کر دی۔ اس عرصہ میں میاں جی نے مہمانوں کے سردار سے بات چیت کرنے کی بہت کوشش کی مگر اس نے کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ باقی تو ادھر ادھر ٹہلتے رہے یا زمین پر اکڑوں بیٹھ گئے اور ان کا سردار سامنے والی چارپائی پر پاؤں پھسار کر لیٹ گیا۔ جب تک بڑے بڑے پیالوں میں چائے سب نے پی وہ اسی طرح چپ چاپ لیٹا رہا۔ سب سے آخر میں اس نے چائے پی۔ صبح پو پھٹے یہ گروہ رخصت ہوا۔ چلتے ہوئے میاں جی نے اس سے کہا "اس بے وقت ہم آپ لوگوں کی

کوئی مناسب خاطر تو نہ کر سکے' مگر جتنا کچھ ممکن تھا وہ کیا'اب کم از کم جانے سے پہلے یہ تو بتاتے جاؤ کہ تم لوگ کون ہو؟ وہ آدمی میاں جی کی بات سن کر ہنسا' ان کے پاس آیا اور اپنے چہرے سے ڈھاٹا ہٹا کر بولا "میری صورت دیکھ لو' میرے نام کا پتا بعد میں چل جائے گا۔" اگلی صبح علاقہ کا تھانیدار میاں جی کو ملنے آیا اور ان سے پوچھا "سارے علاقے میں یہ خبر گرم ہے کہ زینو خان کے گھر میں رات سلطانہ ڈاکو اور اس کے ساتھی مہمان تھے۔ کیا یہ سچ ہے؟" میاں جی نے ساری بات تھانیدار کو بتا دی' مگر وہ جو صدیق تھا' ملازم' اس کو یہ معلوم ہوا کہ وہ سلطانہ ڈاکو تھا جس کو رات اس نے چائے پلائی تھی تو ایسی دہشت طاری ہوئی کہ بخار چڑھ گیا اور تین دن ہوش میں نہیں آیا۔"

ہم بہن بھائیوں میں سے چونکہ کبھی کسی نے افضل گڑھ نہیں دیکھا تھا' لہٰذا وہاں کے قصے اور واقعات ہمیں کتابوں میں لکھی ہوئی داستانوں کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ اماں جی اپنے کنبے والوں' محلہ والوں اور قصبے کے رہنے والوں کا ذکر اس طرح کرتی تھیں جیسے وہ سب ابھی تھوڑی دیر پہلے ان کے ساتھ تھے۔ ان میں سے بے شمار لوگ افسانوی کرداروں کی طرح ہمارے دلوں پر نقش ہو گئے تھے۔ بدھن خاں جو اپنی بے وقوفیوں کے سبب بڑے مشہور تھے یا فخر الدین خان جن کی فیاضی کے قصے سارے علاقے میں زبان زد خاص وعام تھے یا جھنڈے خاں جن کا جوان بیٹا نچنا ندی میں ڈوب کر مر گیا تھا۔ یا منن کاکا جو چودہ سال کی عمر میں گھر سے بھاگ گئے تھے اور تیس سال آسام اور بنگال کے جنگلوں میں رہ کر واپس لوٹے تھے۔ اب تو مجھے یاد نہیں مگر ان گنت نام تھے' جو اماں جی کے قصہ کہانیوں اور داستانوں میں سن سن کر ہمیں زبانی یاد ہو گئے تھے۔ کالے خاں' مسکین بوا' بوٹا کاکا' بی جان' بوبو' ککڑ خاں اور بہت سے ایسے القاب جو ہمارے بچے آج شاید صحیح طور پر ادا بھی نہ کر سکیں۔ یہ میرے بہت ہی بچپن کی باتیں ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اماں جی کی کہانیاں بھی بدلتی گئیں اور نئے نئے نام ان کی جگہ لیتے گئے۔

فرید نگر کی دنیا ہی کچھ اور تھی۔ سنٹر ٹریننگ سکول ایک ریاست تھا' جس کے قانونی سربراہ پرنسپل علی احمد خاں تھے' مگر اس پر حکمرانی اماں جی کی تھی۔ سارے ملازم انہی کو اپنا افسر اعلیٰ سمجھتے تھے اور اپنی پریشانیاں' اپنے مسائل یہاں تک کہ اپنی محکمانہ رنجشوں اور جھگڑوں کے لیے بھی اماں جی سے رجوع کرتے تھے۔ اماں جی کو بھی ان کے بارے میں سب

کچھ معلوم تھا۔ انہیں علم تھا رسوئی کے ساتھ منسلک کہاروں میں بڑا کھیڑو بڑا منتی آدمی ہے اور اسے اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کا بخوبی علم ہے۔ لہٰذا اس سے اس کی اپنی ڈیوٹی کے علاوہ کسی اور طرح کا کام نہیں لینا چاہیے۔ اس کے برعکس دوسرا کہار جس کا نام دلی تھا بڑا بے وقوف اور محنتی شخص ہے اس سے جو کہا جس وقت کہا کرنے کو تیار ملے گا۔ رسوئی کا مہاراج حکم چند اماں جی کا خاص چہیتا تھا۔ وہ ذات کا برہمن تھا' اس لیے سارے ہندو ملازم اس کی بے حد عزت کرتے تھے۔ اس کی آواز بڑی اچھی تھی اور لہک لہک کر لوک گیت اور بھجن گانے میں اس کا جواب نہیں تھا۔ وہ پڑھا لکھا نہ ہونے کے باوجود لگتا تھا کہ کسی کالج کا فارغ التحصیل ہے۔ ہمارے گھر والوں سے اس کی قربت اس قدر تھی کہ وہ خود کو اماں جی کا چھٹا بیٹا کہا کرتا تھا۔ سارے ملازمین میں حکم چند واحد آدمی تھا جس سے اماں جی پردہ نہیں کرتی تھیں۔ مسلمان نوکروں میں قابل ذکر محمد حسین تھے جو سکول کے سینئر چوکیدار تھے۔ کافی عمر یافتہ تھے' اس لیے سب انہیں بڑے میاں کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ ہمارے گھر کے لیے قصبہ سے گوشت خرید کر لانا' رمضان کی سحریوں اور افطاریوں کا انتظام' بقر عید پر قربانی اور شب برأت پر حلوہ اور فاتحہ نیاز وغیرہ انہی کی ذمہ داریوں میں شامل تھا۔ میری پیدائش کے دن بڑے میاں نے سکول کے مین گیٹ کے ساتھ ایک برگد کا پودا لگایا تھا اور دعا کی تھی کہ اللہ تعالیٰ نومولود کی عمر برگد کے اس درخت کے برابر کرے۔ جب ہم نے فرید نگر چھوڑا تو وہ درخت تیزی سے بڑا ہوتا جا رہا تھا۔ بڑے میاں اور حکم چند میں کتے بلی والا بیر تھا۔ بڑے میاں کو حکم چند کا ہمارے گھر آنا جانا بالکل پسند نہیں تھا۔ وہ کہا کرتے تھے "یہ بامن کا" بڑے ماسٹر کے بچوں کو پلید چیزیں کھلا کر ان کا ایمان بھشٹ کرتا ہے۔ حکم جو بے حد چاق و چوبند اور شرارتی آدمی تھا' بڑے میاں کو تنگ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔

سارے نوکروں کا سرتاج پرنسپل صاحب کا چپڑاسی تھا' جس کا نام کھیڑو تھا۔ چونکہ اس نام کے دو نوکر سکول میں کام کرتے تھے' اس لیے اس کو چھوٹا کھیڑو کہا جاتا تھا۔ سارے نوکروں میں واحد نوکر تھا جو اماں جی کی بجائے صرف صاحب سے احکامات لیتا تھا۔ چھوٹا کھیڑو بے وقوف' سیدھا اور ڈرپوک آدمی تھا مگر اس میں دو اوصاف ایسے تھے جو اس کو باقی سب سے ممتاز بناتے تھے ایک تو یہ کہ اس کی ایمانداری سارے شک و شبہ سے بالاتر تھی اور دوسرے وہ ابا جی کا انتہائی وفادار تھا۔ اماں جی بھی اس کے باوجود کہ وہ خود کو ان کے ماتحت

تسلیم نہیں کرتا تھا' اس کو پسند کرتی تھیں وہ کبھی کبھی اس کی احمقانہ باتوں سے تفریح بھی لیا کرتی تھیں۔ مثلاً ایک قصہ وہ بڑے مزے لے کر سنایا کرتی تھیں۔ "ارے یہ میٹ گیا اتنا سیدھا ہے کہ ایک دن میں اس کو بتا رہی تھی کہ افضل گڑھ پہنچنے کے لیے سات دریا پار کرنے ہو ویں ہیں۔ سب سے پہلا رام گنگا اور سب سے آخر بیچپا ندی اور برسات کے دنوں میں تو سارے دریا چڑھ جاویں ہیں۔ یہاں تک کہ ڈاک بھی ہاتھی لے کر جاویں ہیں۔ یہ سن کر چھوٹے کھیڑو نے معصومیت سے پوچھا تو اماں جی وہ ہاتھی بھی پڑھے لکھے ہوتے ہوں گے۔"

اپریل میں سکول میں تعلیم حاصل کرنے والے پیو پلز ٹیچرز یا منشی لوگ فائنل امتحان دیتے تھے اور اس کے بعد مئی جون کے دو مہینوں کے لیے گرمیوں کی چھٹیاں ہو جاتی تھیں۔ اگلے سال کے لیے منشی لوگوں کی فہرست جولائی کے پہلے ہفتہ میں آتی اور نئے سال کے لیے پڑھنے والوں کی آمد شروع ہو جاتی۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں بورڈنگ ہاؤس بالکل خالی ہو جاتا تھا اور سکول کے سارے احاطے پر مکمل طور پر ہمارا راج ہوتا تھا۔ اماں جی عام طور پر انہی دنوں میں اپنے عزیز رشتہ داروں کو مدعو کرتی تھیں اور بجنور' دہلی' گورکھپور وغیرہ سے ہمارے ننھیال اور ددھیال کے بہت سے عزیز و اقارب فرید نگر آتے اور ایسی سیر و تفریح کر کے جاتے جس کی یاد تا حیات اپنے دلوں سے فراموش نہیں کر پاتے۔

چھٹیوں کے دنوں میں بورڈنگ ہاؤس کے سارے کمرے' ہندو مسلم دونوں باورچی خانے' زرعی فارم کی پیداوار' ہاکی' فٹ بال اور والی بال سمیت سارے آؤٹ ڈور اور ان ڈور کھیل سب کچھ ہمارے قبضے میں ہوتے اور ہمارے یہاں آنے والے مہمان ان ساری مراعات اور سہولتوں سے لطف اندوز ہوتے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں چونکہ سکول غیر مردوں سے خالی ہو جاتا تھا' لہٰذا گھر کی عورتیں پردہ کیے بغیر آزادی سے احاطے میں گھوم سکتی تھیں۔ سکول کے نوکر ہمارے گھر کی خواتین کو دیکھ کر خود ہی پردہ کر لیا کرتے تھے۔

جیسے جیسے میری عمر بڑھتی گئی اور مجھ میں شعور پیدا ہوتا گیا اماں جی کی شخصیت کے پہلو بھی کھلتے گئے۔ میں محسوس کرنے لگا کہ میری ماں بے پناہ صلاحیتوں کی مالک ہے۔ ان کی ذہانت' دانش مندی' انتظامی صلاحیت اور فیصلہ کرنے کی قوت کو دیکھ کر کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک بے پڑھی لکھی خاتون ہیں۔ اپنے بچوں کی پرورش انہوں نے کچھ اس طرح سے کی کہ تاعمر وہ ان کے تابعدار رہے اور مجھے کوئی ایک واقعہ ایسا یاد نہیں کہ کبھی کسی نے ان

کی حکم عدولی کی ہو۔ لڑکپن سے جوانی تک ان کا ہر بچہ فیصلوں اور ہدایات کے لیے انہی کی جانب دیکھتا تھا۔ اباجی کو تو جیسے انہوں نے ایک ایسا دیوتا بنا رکھا تھا جس کے سامنے نظر اٹھا کر بات کرنے کی بھی کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ حالانکہ ہمارے اباجی ایک انتہائی نرم دل، ٹھنڈے مزاج اور میٹھے لہجے میں بات کرنے والے انسان تھے۔ میں نے کبھی انہیں کسی کو ڈانٹتے یا کسی پر خفا ہوتے نہیں دیکھا، مگر اماں جی نے ایک عجیب سی حکمت عملی بنا رکھی تھی۔ جب کسی بچے کی سرزنش مطلوب ہوتی تو وہ صرف اتنا کہا کرتیں "اچھا ٹھیک ہے، آج آنے دو اپنے باوا کو" اور بچے کی خوف سے گھگی بندھ جاتی۔ اب سوچتا ہوں تو ہنسی بھی آتی ہے کہ آخر ایک ایسے آدمی سے ہم سب کیوں ڈرتے تھے، جس نے کبھی سرزنش کا ایک لفظ بھی ہم میں سے کسی کو نہیں کہا۔ یہ اماں جی کا کمال تھا۔ انہوں نے بڑی ہوشیاری سے اباجی کا ایک ان دیکھا خوف ہم سب پر طاری کر رکھا تھا۔ ہم میں سے کبھی کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ اباجی کے سامنے اونچی آواز میں بات کر سکیں، یا ان کی نظروں سے نظریں ملا سکیں۔ وہ آتے تو گھر کا ہر فرد اس طرح مودب ہو جاتا کہ اگر کوئی بات یا کوئی عمل ان کو ناگوار گزرا تو خدا جانے کیا ہو جائے۔ بعد میں جب اباجی سے میری کافی دوستی ہو گئی تو کبھی کبھی مذاق میں ان سے کہا کرتا تھا کہ اماں جی نے آپ کی ساری اولاد پر آپ کی اس قدر دہشت طاری کی ہوئی تھی کہ ہمیں آپ کا نام سن کر ہی خوف آتا تھا۔ اباجی ہنس کر جواب دیا کرتے "یہ تمہاری اماں جی کا کمال ہے کہ انہوں نے تم سب کو ایک ایسے آدمی کے رعب میں رکھا، جس نے زندگی بھر کسی پر سختی نہیں کی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتیں تو شاید پانچ بیٹوں کو کنٹرول میں رکھنا ممکن نہ ہوتا۔" جیسے جیسے بچے بڑے ہوتے گئے اماں جی کے برتاؤ میں بھی تبدیلی آتی گئی۔ بدلتے ہوئے حالات اور بدلتے ہوئے ماحول کے ساتھ ان کا طرز زندگی بھی بدلتا گیا۔

1947ء میں پاکستان بنا اور اپریل 1948ء میں اماں جی بھی ہجرت کر کے کراچی آ گئیں۔ میرے تین بڑے بھائی علی اشرف، نسیم اور شمیم جو دہلی میں مختلف سرکاری محکموں میں ملازم تھے یوم آزادی سے چند دن پہلے ہی بذریعہ سپیشل ٹرین کراچی پہنچ چکے تھے۔ اماں جی کی بیٹی، داماد، دو چھوٹے بیٹے یعنی میں اور مجھ سے بڑے بھائی نواب ابھی ہندوستان میں تھے اور انتظار کر رہے تھے کہ اباجی سرکاری نوکری سے ریٹائر ہو جائیں تو پھر ہم سب کراچی کے لیے روانہ ہوں گے۔

اباجی کا اصرار تھا کہ ان کی ریٹائرمنٹ کا انتظار نہ کیا جائے اور سارا خاندان ہجرت کر جائے۔ وہ پنشن کے معاملات طے کرنے کے بعد پاکستان پہنچ جائیں گے۔ اسی تگ ودو اور بحث و مباحثہ میں کئی مہینے بیت گئے۔ پاکستان چلے جانے والے بیٹوں کا دباؤ بڑھتا چلا گیا اور اباجی کا اصرار بھی آخر مجبور ہو کر 1948ء کے اوائل میں اماں جی ایک لمبے چوڑے قافلے کے ساتھ فرید نگر سے دہلی اور دہلی سے بذریعہ ٹرین براستہ کھوکھراپار کراچی کے لیے روانہ ہو گئیں۔ اس موقع پر ان کے ہمراہیوں اور خود اماں جی کے جذبات کیا ہوں گے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ پاکستان بننے کی خوشی' ایک نئے ملک اور نئے شہر میں جا کر آباد ہونے کی بے قراری' مگر ساتھ ہی ساتھ وہ زمین چھوڑنے کا دکھ' جہاں ساری زندگی بتائی تھی۔ میں تو خیر بچہ تھا اور اس زمین سے میرا رشتہ اور میری یادیں کوئی ایسی بہت مضبوط اور توانا نہیں تھیں مگر اماں جی نے تو زندگی کے اڑتالیس برس وہاں گزارے تھے۔ افضل گڑھ' گورکھپور' سہارنپور' میرٹھ اور سب سے بڑھ کر فرید نگر جہاں وہ گزشتہ سولہ سترہ سال سے رہ رہی تھیں' کیسی کیسی یادیں اور کیسے کیسے واقعات ہوں گے جن کا انہیں خیال آیا ہو گا۔ اپنا بچپن' اپنے بہن بھائی' ماں باپ' پھر شادی اور اس کے بعد کی ایک نئی زندگی' چھ بچوں کی پیدائش' پرورش' تعلیم' تربیت اور بیٹوں کی شادیاں اپنے دامن میں یہ سب کچھ سمیٹے اپنے بچوں' بیٹوں' بیٹیوں اور دوسرے بہت سے رشتہ داروں کو جلو میں لیے وہ راجستھان کے لق ودق صحرا سے گزرتی سیٹی بجاتی' چھک چھک کرتی ریل گاڑی میں بیٹھی۔ اس ان دیکھے ملک کی سرحدوں میں پہنچ گئیں' جہاں انہوں نے آنے والے زندگی کے 36 برس گزارنا تھے۔ یہ ایک نئی دنیا تھی۔ ایک نیا تجربہ تھا۔ ایک صبر آزما اور مشکلات سے پر زمانہ مگر واہ رے اماں جی' کراچی آجانے کے بعد کبھی کسی نے ان کے منہ سے ایک لفظ جو شکایت کا سنا ہو۔ فرید نگر میں ٹیچرز ٹریننگ سکول کی بے تاج ملکہ جس کی حکم عدولی کا خیال بھی کسی کے دل میں آنا ممکن تھا' وہ جس کو دنیا کا ہر عیش و آرام اور سکھ چین میسر تھا' جس کی ایک آواز پر ملازم قطار اندر قطار حاضر ہو جاتے تھے' جس کے سامنے انواع واقسام کے پھل' سبزی ترکاری اور دیگر موسمی سوغاتوں کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔ جس کے گھر میں برتن مانجھنے' جھاڑو دینے' کپڑے دھونے' بازار سے سودا سلف لانے کے لیے نوکروں کا ایک جم غفیر ایک اشارہ کا منتظر رہتا تھا۔ میں نے انہیں اماں جی کو کراچی آنے کے بعد ایک بالکل نئے روپ میں دیکھا۔

یہ پاکستان کا بالکل ابتدائی دور تھا۔ پاکستان زیر تعمیر تھا اور پاکستان کا عارضی دارالحکومت کراچی بھی، نہ سڑکیں تھیں، نہ بسیں، نہ رکشے، بازار، دکانیں، مکان غرض ہر شے ابھی تکمیل کے ابتدائی مراحل میں تھی۔ نئے آباد ہونے والے علاقوں میں نہ تو پانی کی سہولت میسر تھی، نہ بجلی کی روشنی۔ مارٹن کوارٹرز میں جہاں میرے بھائیوں نے سرکاری کوارٹر اپنے نام الاٹ کرالیے تھے، ہر طرف دھول ہی دھول اڑتی تھی۔ زندگی کی کوئی سہولت میسر نہ تھی۔ پانی کے لیے ہمیں ایک میل دور تین ہٹی کے پاس لگے ہوئے نلکے پر جانا ہوتا تھا۔ گوشت، سبزیاں، پرچون کی دکانیں، یا تو ریتیلی زمین پر دریاں اور چٹائیاں بچھا کر لگالی جاتی تھیں، یا پھر لکڑی کے چھوٹے چھوٹے کیبنوں میں۔ ہر روز کراچی شہر کی آبادی میں ہزاروں کا اضافہ ہو جاتا تھا اور ہر آنے والا اپنے ساتھ لاتعداد مسائل اور ان گنت دلخراش داستانیں لے کر آتا تھا۔ یہ عجیب و غریب زمانہ تھا۔ عورت، مرد، بچے، بوڑھے، جانے کہاں کہاں سے اپنے گھربار چھوڑ کر اس نئے ملک میں آرہے تھے۔ ان کے گھر لٹ گئے تھے۔ ان میں بہت سوں کے عزیز رشتہ دار شہید ہو گئے تھے۔ ان کے پاس نہ مال و زر تھا نہ سر چھپانے کا کوئی ٹھکانہ تھا۔ ان کا حال بدحال تھا اور مستقبل معدوم۔ کل کیا ہونے ولا ہے اور آنے والا وقت ان کے لیے اپنے دامن میں کیا چھپائے ہوئے ہے، اس کا کسی کو کوئی علم نہ تھا۔ مگر پھر بھی بے گھر بے در بے آسرا مسافروں کے چہروں پر ایک عجیب سی طمانیت تھی۔ تمام تر پریشانیوں اور تشویشناک حالات کے باوجود ان کے دل عزم و ہمت سے پر تھے۔ انہیں اس نئے ملک اور خود اپنی تقدیر پر مکمل اعتماد تھا۔ وہ رونما ہونے والے واقعات سے پریشان ضرور تھے، مگر مستقبل سے ناامید نہیں تھے۔ کم و بیش ہر کسی کی یہی کیفیت تھی۔ خود ہمارے گھر میں ان دنوں ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والوں کا ایک میلہ سا لگا رہتا تھا۔ جانے ہندوستان کے کون کونسے شہروں سے ایسے ایسے عزیز رشتہ دار اور جاننے والے آتے تھے جن کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ وہ کچھ دن ہمارے ان کوارٹروں میں قیام کرتے اور پھر کوئی ٹھکانہ تلاش کر کے رخصت ہو جاتے۔ ہمارے دونوں کوارٹروں کے برآمدے صرف ایسے ہی مسافر مہمانوں کے لیے مخصوص ہو چکے تھے۔ خود گھر میں رہنے والے ہمارے اپنے خاندان کے افراد کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ میرے چاروں بھائی بھابیاں، ان کے بچے، بہن اور بہنوئی، غرض سب ان دو کوارٹروں کے مستقل مکینوں میں شامل تھے۔ اباجی ابھی ہندوستان ہی میں تھے اور

اپنے پنشن کے معاملات سلجھانے میں مصروف تھے۔ اماں جی اباجی کی غیر موجودگی میں ایک طرح سے اس خاندان کی سربراہی کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔ وقت کے تقاضوں کے مطابق وہ یکسر بدل چکی تھیں۔ ہر صبح وہ کالے رنگ کا برقع اوڑھ کر مجھے ساتھ لے کر بازار جاتیں۔ دکانوں دکانوں چکر لگاتیں، گوشت، سبزی اور ضروریات کی چیزیں خرید تیں۔ سودا سلف سے بھری پلاسٹک کی ٹوکریاں اٹھائے ہم دونوں ہانپتے کانپتے گھر آتے۔ دوپہر ہونے تک اماں جی گھر کے دوسرے چھوٹے موٹے کاموں سے فراغت حاصل کرنے کے بعد سینے پرونے میں مصروف ہو جاتیں۔ کھانے پکانے کی ڈیوٹیاں ان کی بہوؤں کے ذمہ تھیں، لیکن پھر بھی اماں جی کے مستقل پھیرے باورچی خانے میں لگتے رہتے۔ خالی وقت میں وہ سلائی کڑھائی میں لگی رہتیں۔ سہ پہر کے بعد آنیوالوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ دور پار کے رشتہ دار اور خاندان کے لوگ جو رفتہ رفتہ کراچی کے مختلف علاقوں میں پھیلتے جا رہے تھے۔ ہر قسم اور ہر نوع کے مسائل لے کر آتے اور اماں جی کے مشورے سے ان کے حل تلاش کرتے۔ میں اماں جی کی سارے دن کی مصروفیات دیکھا کرتا اور سوچا کرتا کہ وہ ایک دم کیسے بدل گئی ہیں۔ اپنے نواسے نواسیوں اور پوتے پوتیوں کو سکول میں پہنچانے، ہسپتال سے اپنی اور کبھی کبھی دوسروں کی دوائیں لانے، ڈبل روٹی مکھن سے لے کر آٹے اور چاول کی خریداری تک سارے کام وہ بلا کسی تھکان اور بلا کسی شکایت کرتی تھیں۔ ہندوستان کی اماں جی سے بالکل مختلف۔

کراچی آنے کے بعد اوروں کی طرح ہمارے خاندان کے لیے بھی یہ عرصہ خاصہ آزمائش کا تھا۔ رہائش کے مسائل، بچوں کی تعلیم کے مسائل، ملازمتوں کے مسائل، ہجرت کر کے آنے والوں کے مسائل، ایک ایسے نئے معاشرے میں، جس کے خدوخال ابھی واضح نہیں تھے، رل مل جانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ مگر اماں جی بظاہر ان ساری مشکلات کا بڑی دلجمعی کے ساتھ مقابلہ کرتی رہیں۔ مجھے یقین ہے انہیں اپنے بیتے دنوں کی یاد ضرور آتی ہو گی۔ گزرے ہوئے وقت کے نقوش ان کے تخیل میں یقیناً ابھرتے ہوں گے، لیکن میں نے کبھی ان کو اس وجہ سے اداس یا ملول ہوتے نہیں دیکھا۔ وہ اس نئی صورت حال سے مایوس نہیں تھیں۔ وہ جانتی تھیں یہ کڑا وقت ہے، دشوار اور کٹھن راستہ ہے، لیکن وہ اپنے مخصوص انداز میں کہتی تھیں ”ہم جو کہویں ہیں سب ٹھیک ہو جاوے گا۔“ انکا لہجہ اور ان کی آواز میں

اتنا یقین ہوتا تھا کہ جیسے واقعی اس مشکل کا حل اماں جی کے اپنے پاس ہے اور اب جب انہوں نے کہہ دیا ہے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا تو بس پھر سب ٹھیک ہو جائے گا اور اب جب میں پلٹ کر گزرے ہوئے وقت کی جانب دیکھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے اماں جی کا کہا واقعی سچ تھا۔ پریشانیوں اور مشکلوں کا یہ زمانہ دس بارہ برس چلتا رہا اور پھر رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہو گیا۔ ان کے سارے بیٹوں کو مناسب ملازمتیں مل گئیں۔ سب اپنی اپنی تنخواہوں میں گزر بسر کرنے کے قابل ہو گئے۔ شادیاں ہو گئیں اور ہر کوئی صاحب اولاد ہو گیا۔ اماں جی پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیوں والی بن گئیں۔ خدمت گزار اور تابعدار بہوئیں' محبت کرنے والی اولاد' ہر وقت خیال رکھنے والا شوہر...... ایک متوسط گھرانے کی عورت کو خوش اور مطمئن رہنے کے لیے اس سے زیادہ بھلا اور کیا چاہیے۔

میں اپنے سارے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا اور اماں جی کا بہت لاڈلا تھا۔ وہ ساری زندگی مجھے بچہ ہی سمجھتی رہیں۔ ان کے رویہ میں تاعمر کوئی فرق نہیں آیا۔ جب میں کاندھے پر بستہ لٹکائے سکول جاتا تھا' جب میں کالج اور یونیورسٹی کا طالب علم تھا' جب میں نے ریڈیو پاکستان میں پروڈیوسر کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا اور جب میں ترقی کے مدارج طے کرتا ٹیلی ویژن کے ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہوا۔ میرے کوائف' میرا رتبہ' میرا حلقہ احباب' میرا ماحول بدلتا رہا' لیکن اماں جی کا رویہ میرے لیے بالکل ایک جیسا ہی رہا۔ میرے لیے ان کی محبت کا سارے خاندان میں چرچہ تھا۔ کہنے والے یہ بھی کہتے تھے کہ جب آغا کی شادی ہو جائے گی تو اماں جی اس کی بیوی کو کبھی قبول نہیں کر سکیں گی اور آغا کی محبت میں اسے حصہ دینے کے لیے تیار نہیں ہوں گی۔ مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ اماں جی میری پسند اور اپنی مرضی سے اپنے ایک کزن کی بیٹی کو بیاہ لائیں۔ انہوں نے اپنی چھوٹی بہو کو اپنی ساری محبتوں اور چاہتوں میں شریک کر لیا اور ساری زندگی میرے اور صفیہ کے ساتھ رہتی رہیں۔

میرے ساتھ ان کی ایک عجیب سی ٹیلی پیتھی تھی۔ مجھے ان کے مرتے دم تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ بنا کہے ان کو میرے دل کی بات کس طرح معلوم ہو جاتی ہے۔ میرا دل کیا چیز کھانے کو چاہ رہا ہے۔ میں کون سا لباس پہننا چاہتا ہوں۔ میں کہاں جانا چاہتا ہوں۔ ان کو خود بخود ایسی باتوں کا علم ہو جاتا تھا اور اس سے پہلے کہ میں حرف مدعا زبان پر لاؤں

وہ آپ ہی وہ بات کہہ دیتی تھیں۔ ایک بار تو انتہائی عجیب قصہ ہوا۔ میں ریڈیو پاکستان کراچی کے سٹوڈیو میں ریہرسل کروا رہا تھا کہ اچانک مجھے بہت سخت سردی لگنے لگی۔ ان دنوں کراچی میں بڑا زبردست فلو پھیلا ہوا تھا' جس کا آغاز جاڑا چڑھنے سے ہوتا تھا۔ میری حالت دیکھ کر دفتر کے لوگ بڑے پریشان ہوئے۔ سخت گرمیوں کے اس موسم میں مجھے اوڑھانے کے لیے بھی کچھ نہیں تھا۔ میں سردی سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ سب حیران وپریشان ابھی اس مشکل کا کوئی حل ڈھونڈ ہی رہے تھے کہ ریسیپشن آفس سے فون آیا اور ڈیوٹی آفیسر نے بتایا آغا ناصر صاحب کے گھر سے ان کا ملازم سویٹر اور مفلر لے کر آیا ہے۔ کسی کو بھیج کر منگوالیں۔

اسی طرح ایک دفعہ میں کرکٹ کھیلتے ہوئے زخمی ہو گیا۔ چوٹ داہنے ہاتھ کی کہنی پر لگی تھی۔ میں گھر آیا تو اماں جی کہیں گئی ہوئی تھیں۔ میں نے جلدی جلدی زخم کی مرہم پٹی کی اور خاموشی سے بستر پر لیٹ کر کتاب پڑھنے لگا۔ میں نے سوچ لیا تھا اماں جی سے چوٹ کا کوئی ذکر نہیں کروں گا' وہ خواہ مخواہ پریشان ہوں گی۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئیں اور مجھے بستر پر لیٹا ہوا دیکھ کر بولیں "کیوں اتنی جلدی واپس کیسے آگئے؟ معلوم ہوتا ہے چوٹ لگوا کر آئے ہو۔" اسی طرح صفیہ بتاتی ہے جب میں ٹیلی ویژن کی ٹریننگ پر لندن گیا ہوا تھا تو اچانک کسی دن اماں جی کہتیں "میرا دل گواہی دے رہا ہے آج آغا کا فون ضرور آوے گا" اور پھر ایسا ہی ہوتا تھا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کے دل کی گواہی غلط رہی ہو۔ اور یہ تو بالکل روزمرہ کی بات تھی کہ صفیہ سے کہتیں آج فلاں چیز پکالو' آغا کا جی چاہ رہا ہو گا...... اور دوپہر کو دفتر سے آکر جب میں صفیہ سے اسی چیز کی فرمائش کرتے ہوئے کہتا کہ بہت دنوں سے گھر میں وہ ڈش نہیں پکی تو وہ مسکرا کر جواب دیتی "آج پک گئی ہے' چونکہ آپ کی ہر خواہش اور ہر سوچ امی کے ذریعے ٹرانسمیٹ ہو کر مجھ تک پہنچ جاتی ہے۔" آج تک میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایسا کیوں تھا۔ ان کی چھٹی حس اس قدر طاقت ور کیسے ہوئی۔

1964ء میں' جب پاکستان میں ٹیلی ویژن کا آغاز ہوا تو میں کراچی سے تبادلہ ہو کر لاہور آگیا اور اس کے چند ہفتوں بعد ابا جی وفات پاگئے۔ اس کے بعد اماں جی بھی کراچی کو خیرباد کہہ کر ہمارے پاس آگئیں۔ یہ ان کی دوسری ہجرت تھی اس کے بعد ساری زندگی ہمارے ساتھ رہیں۔ چند سال لاہور اور پھر اسلام آباد۔ اماں جی کا اور میرا ساری زندگی

ساتھ رہا۔ میں ان سے کبھی کبھی مذاق میں کہا کرتا تھا "امی تم اپنے باپ اور شوہر کے ساتھ اتنی دیر نہیں رہیں جتنا میرے ساتھ رہی ہو......" اور یہ واقعی سچ بھی تھا۔ میری پیدائش سے اپنی وفات تک وہ کبھی مجھ سے جدا نہیں ہوئیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ میرے خیالات محسوسات اور خواہشات کو اس حد تک سمجھنے لگی تھیں کہ منہ سے بات نکلنے سے پہلے ہی ان کو علم ہو جاتا تھا' میں کیا چاہتا ہوں۔

1955ء میں جب میں نے ریڈیو پاکستان سے بحیثیت ایک پروڈیوسر اپنی ملازمت کا آغاز کیا تو اماں جی کی دلچسپی بھی ریڈیو پروگراموں میں پیدا ہو گئی۔ ان کے سرہانے رکھا ہوا ریڈیو سیٹ ہمیشہ آن رہتا اور شام کے بعد جب میں گھر آتا تو وہ مختلف پروگراموں کے بارے میں مجھے بتاتیں۔ ریڈیو کے بعد جب میں ٹیلی ویژن سے وابستہ ہو گیا تو اماں جی نے بھی مستقل ٹیلی ویژن دیکھنا شروع کر دیا۔ جیسے جیسے میری پیشہ ورانہ ذمہ داریاں بڑھتی گئیں اور میری عہدے میں ترقی ہوتی گئی۔ مجھے اماں جی کی اس عادت کے بے شمار فوائد کا احساس ہوتا گیا۔ میں دن بھر دفتر میں گزارتا' شام کو اکثر دعوتوں اور دوسری تقریبات میں چلا جاتا' اس لیے سارے پروگرام دیکھنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ اماں جی خود بھی رفتہ رفتہ پروگراموں کی ایکسپرٹ ہو گئی تھیں اور ڈراموں' مذاکروں' مذہبی پروگراموں اور خبروں پر اپنی استعداد کے مطابق تبصرے کیا کرتی تھیں' چونکہ ان کی یادداشت حیران کن حد تک اچھی تھی' اس لیے انہیں آرٹسٹوں اور حصہ لینے والوں کے نام' پروگراموں کے عنوان سب یاد رہتے تھے صرف یہی نہیں اماں جی کو ٹیلی وژن کے اندرونی حالات کا بھی بڑی حد تک علم رہتا تھا' چونکہ ٹیلی ویژن میں کام کرنے والوں کا ہمارے ہاں مسلسل آنا جانا تھا اور اماں جی کے ان سارے لوگوں سے براہ راست تعلقات تھے' اس لیے ان کو لوگوں کے تبادلوں' ترقیوں اور حکومتی سطح پر کیے جانے والے انتظامی فیصلوں کا بھی علم رہتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ مجھے ایسے سوال کر کے حیران کر دیتی تھیں جو خالصتاً حکمانہ نوعیت کے ہوتے۔ مثلاً وہ باتیں کرتے کرتے یک دم پوچھ لیتیں "یہ فلاں شخص کو کوئٹہ کیوں تبادلہ کر رہے ہو؟ تجھے معلوم ہے اس بے چارے کا ایک بچہ ہے جو معذور ہے؟" اماں جی اتنی ہوشیار تھیں کہ اس طرح کے معاملات میں وہ اپنا Source of information ہرگز ظاہر نہیں کرتی تھیں۔ برس ہا برس ان کا یہی طریقہ رہا کہ صبح ناشتہ کے بعد جب میں دفتر جانے سے پہلے انہیں سلام کرنے ان کے کمرے

میں جاتا تو وہ مجھے ایک پان کھلاتیں اور حکیمانہ باتیں کرتیں، جس میں سر فہرست رات کے نشر ہونے والے پروگراموں کی رپورٹ ہوتی۔ ان کی انہی دلچسپیوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم نے ان کے کمرے میں ایک ٹیلی ویژن مستقل طور پر رکھا ہوا تھا۔

اماں جی عام بزرگوں کی طرح کوئی بہت دین دار خاتون نہیں تھیں۔ نماز وہ بہت باقاعدگی سے پڑھتی تھیں۔ صبح کو تسبیح کا ورد بھی کرتیں مگر جیسا کہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ بزرگ لوگ دنیاوی معاملات سے دوری اختیار کرتے جاتے ہیں' اماں جی کے ساتھ ایسا نہیں تھا۔ وہ سیر و تفریح کی بڑی شوقین تھیں۔ خاندان میں ہونے والی تقریبات میں باقاعدگی سے شرکت کرتی تھیں اور ہمارے بچوں کے ساتھ کار میں بیٹھ کر گھومنے اور بازار میں آئس کریم' تکہ' ملک شیک کھانے پینے میں برابر کی شریک رہتی تھیں۔ انہیں چھوٹی چھوٹی بہت سی بیماریاں تھیں مگر ان کی ہمت اس قدر جوان تھی کہ انہیں کبھی اپنی عمر کا احساس نہیں ہوا۔ زندگی کے آخری حصے میں بھی وہ خود کو جوان لوگوں سے مثال دے کر ہر وہ کام کرنے کو تیار رہتی تھیں جو ان کی عمر کی عورتیں تصور بھی نہیں کر سکتیں' مثلاً لاہور میں شاہی مسجد میں گھومتے ہوئے وہ ایک دم کہہ دیتیں "بھیا' ان کے ساتھ ہم بھی اوپر مینار پر چڑھ کر شہر کا نظارہ کریں گے۔" ان کی جواں ہمتی اور سیر و تفریح سے رغبت کو خاندان کی بعض عمر یافتہ خواتین تنقیدی نگاہوں سے دیکھتی تھیں۔ اکثر اماں جی ان بڑی بوڑھیوں کی گفتگو میں اعتراضات کا نشانہ بنتی تھیں' مگر اماں جی کو ان کی کوئی پروا نہیں تھی۔ ان کے خیال میں اللہ کو خوش رکھنے کے لیے اللہ کے بندوں کو خوش رکھو۔ ان کا ایمان تھا کہ حاجت مندوں کے کام آنا سب سے بڑی عبادت ہے۔ وہ ترک دنیا کی قائل نہیں تھیں اور اسی لیے آخر عمر تک وہ ریڈیو' ٹیلی ویژن' موسیقی' ڈرامہ' پکنک' تقریبات...... غرض دنیا کے سارے کاموں میں پوری توانائی کے ساتھ شریک رہیں' مگر ساتھ ہی ساتھ جہاں تک ممکن ہو سکا' خلق خدا کی خدمت کے لیے جو کچھ کر سکتی تھیں کرتی رہیں۔ انہوں نے کبھی اپنے اوپر تنقید کرنے والوں کی باتوں کا برا نہیں مانا' کیونکہ انہیں خود پر مکمل اعتماد تھا۔ انہیں یقین تھا کہ جو راستہ انہوں نے منتخب کیا ہے وہی صحیح راستہ ہے۔ اسلام آباد میں ہمارے ساتھ پندرہ برس سے زیادہ عرصہ رہیں مگر ہمیں ان کی زندگی میں معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس کس کی مدد کرتی رہتی ہیں۔ یہ تو لوگوں نے ان کے بعد بتایا کہ

انہوں نے کس کس کے لیے کیا کچھ کیا ہے۔

اماں جی کی زندگی کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے...... افضل گڑھ جہاں ان کا بچپن بیتا' شادی کے بعد گورکھپور' سہارنپور اور فرید نگر میں اباجی کے ساتھ کا زمانہ ہندوستان سے ہجرت کے بعد کراچی کے سولہ سترہ سال اور اسلام آباد میں زندگی کے آخری ایام...... ان کے بچپن والے حصہ پر تو میں کوئی تبصرہ کرنے کے قابل نہیں ہوں' مگر باقی سارے زمانوں میں میں ان کے ساتھ تھا۔

اماں جی کی پیدائش کی صحیح تاریخ اور مہینہ معلوم نہیں لیکن سن ولادت کے بارے میں وہ خود کہا کرتی تھیں کہ میں نئی صدی کے پہلے سال میں پیدا ہوئی تھی۔ یعنی وہ بیسویں صدی کے ساتھ ساتھ چلتی رہیں۔ اس طرح ان کی عمر کا حساب لگانا بڑا آسان تھا۔ جب وہ پاکستان آئیں تو 48 سال کی تھیں۔ زندگی کے ہر دور میں وہ اپنے معمولات اور اطوار وعادات کے نقطۂ نظر سے ایک ہی جیسی رہیں۔ بڑھتی عمر کے ساتھ صحت کی خرابی اور ضعیفی تو خیر ایک لازمی بات تھی' مگر اس کے سوا میں نے ان میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں دیکھی۔ صبح اٹھ کر نماز پڑھنا' تسبیح کا ورد اور پھر گھر کے کام کاج میں مشغولیت' ناشتہ اور دوپہر کا کھانا وہ بڑی باقاعدگی سے کھاتی تھیں' لیکن رات کا کھانا کھانے کی ان کو عادت نہیں تھی۔ صرف سوتے وقت دودھ پیتی تھیں' مگر اس سے پہلے "ذرا منہ کا منہ کرنے" کے لیے گھر میں پکائے گئے سالن سے ایک دو لقمے کھا لیا کرتی تھیں۔ پان کھانے کی شوقین تھیں اور نہ صرف خود بلکہ گھر کے سارے افراد کو یہاں تک کہ آنے جانے والوں کو بھی بصد اصرار پان کھلاتی تھیں۔ خاندان کے سارے بچوں کو ان کے والدین کی مخالفت کے باوجود اماں جی پان ضرور کھلاتیں اور اگر کوئی اعتراض کرے تو بہت خفا ہوتی تھیں۔ کھانے میں گوشت کی شوقین تھیں۔ جب تک کراچی میں رہیں کھانا پکانے میں خود بھی حصہ لیتی رہیں' مگر اسلام آباد میں کم کم ہی باورچی خانے میں جاتیں۔ ویسے ان کی بنائی ہوئی بعض ڈشز واقعی لاجواب ہوتی تھیں۔ دعوت والے کھانے پکانے کی نسبت روزمرہ کے عام کھانے پکانے میں زیادہ مہارت تھی۔ میٹھے کی بھی خاصی شوقین تھیں۔ خاص طور پر "رساول" جسے وہ "رس کی کھیر" کہا کرتی تھیں۔ مجھے یاد ہے قیام پاکستان کے بعد جب ہم کو کراچی آئے کافی عرصہ گزر گیا تو ایک دن اباجی نے رات کا کھانا کھاتے ہوئے کہا کہ جب سے کراچی آئے ہیں "رساول" کو ترس گئے ہیں۔ اماں جی نے

سنا ان دنوں کراچی شہر میں خوردونوش کی ایسی بہت سی اشیاء تھیں جو ناپید تھیں۔ گنے کا رس بھی ایک ایسی ہی چیز تھی، مگر بھلا یہ کس طرح ممکن تھا کہ زندگی میں بہت کم کسی چیز کی خواہش کرنے والے اباجی کی رساول کی فرمائش پوری نہ ہو۔ سو سب یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے کہ اگلے روز رات کے کھانے میں رس کی کھیر سے بھرے بڑے بڑے پیالے دستر خوان پر موجود تھے۔ سب کے لیے یہ معمہ تھا کہ اس شہر میں جہاں اس وقت تک گنے کا رس میسر ہی نہیں تھا، اماں جی نے رساول کیسے پکالی...... معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ اباجی کی فرمائش پوری کرنے کے لیے انہوں نے بازار سے گڑ خریدا۔ اس کو پانی میں ابال کر محلول میں تبدیل کیا اور جب یہ خود ساختہ "گنے کا رس" تیار ہو گیا تو اس سے رساول پکائی جو لذت میں اور شکل میں بالکل اصل گنے کے رس جیسی رساول تھی۔ اماں جی ایک بے حد محبت کرنے والی انتہائی فرماں بردار بیوی تھیں۔

ہر کسی کو اپنی ماں اچھی لگتی ہے، لیکن میں بالکل ایمانداری سے کہتا ہوں کہ اماں جی اگر میری ماں نہ بھی ہوتیں تو بھی مجھے ایسے ہی اچھی لگتیں۔ وہ سراپا محبت تھیں اور کوئی بھی ان سے محبت کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنی خوبصورت خواتین کم ہی دیکھی ہیں۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو اماں جی کی عمر چالیس سال سے اوپر تھی، لیکن ان کا حسن ایسا تھا کہ آنکھ بھر کر ان کو دیکھنا مشکل تھا۔ متوسط قامت، متوازن جسم، شہابی رنگت، سنہرے ہلکے گھنگھریالے بال، گہری نیلی آنکھیں، نازک ہاتھ پاؤں، بے حد ملائم اور باریک جلد، غرض اس زمانے میں حسن کی تعریف کے لیے جو معیار مقرر تھے اور جو اصطلاحیں استعمال کی جاتی تھیں اماں جی ان سب پر پوری اترتی تھیں۔ ہم نے سچ مچ ان کی شفاف اور باریک جلد سے حلق سے پان کی پیک گزرتے دیکھی ہے۔ سردیوں میں جب نہانے کے بعد وہ دھوپ میں اپنے بال سکھانے بیٹھتی تھیں تو لگتا تھا جیسے کوئی پری آسمان سے اتر آئی ہے۔ ان کا لباس ہمیشہ بہت سادہ ہوتا تھا۔ اول تو اباجی کی حلال کی کمائی ہی کتنی تھی۔ دوسرے اماں جی کو ٹھاٹھ باٹھ، لباس، زیور اور فیشن کا کوئی خاص شوق بھی نہیں تھا۔ عمر کے آخری حصے میں ان کے پانچ بیٹے اچھی خاصی خوشحال زندگی بسر کر رہے تھے اور اماں جی کو مالی پریشانیوں کا سامنا نہیں تھا۔ اس وقت بھی میں نے انہیں ایک حد سے زیادہ اپنی ذات پر خرچ کرتے نہیں دیکھا۔ انہیں جو کچھ ملتا تھا وہ خاموشی سے ادھر ادھر ضرورت مند، عزیز، رشتہ داروں، جاننے والوں اور نوکروں میں تقسیم کرتی.

رہتی تھیں۔ ان کی فیاضی کے قصے سارے خاندان میں مشہور تھے۔ میں جب بھی سرکاری دورے پر ملک سے باہر جاتا ہمیشہ ان کے لیے کچھ نہ کچھ لے کر آتا۔ ان میں سے بہت سی چیزیں کچھ عرصہ ان کے پاس رہتی اور پھر غائب ہو جاتیں یہاں تک کہ کسی دن وہ چیز خاندان کے کسی اور فرد کے پاس نظر آتی۔ ظاہر ہے یہ بات مجھے پسند تو نہ آتی مگر اماں جی سے کچھ کہنا بڑا دشوار تھا ایک دفعہ ایک بڑا قیمتی سوئٹر میں لندن سے ان کے لیے لایا۔ انہوں نے وہ اپنے پاس رکھ لیا۔ جب سردیاں آئیں تو میں اور میری بیوی ان سے اصرار کرتے رہے کہ وہ سوئٹر نکال کر پہنیں، مگر ان کے پاس سوئٹر ہوتا تو پہنتیں۔ کچھ عرصہ بعد ہم نے کراچی میں خاندان کی ایک لڑکی کو وہ سوئٹر پہنے ہوئے دیکھا۔ اماں جی سے شکایت کی کہ میں یہ سوئٹر اتنی محبت سے ان کے لیے لایا تھا اور انہوں نے کسی اور کو دے دیا۔ وہ برا مان گئیں اور کہنے لگیں "بس آیندہ تو میرے لیے کچھ نہ لائیو۔ جب چیز تونے مجھے دے دی تو میری ہو گئی۔ پھر میری مرضی میں جو چاہے اس کا کروں۔" ان کی بات معقول تھی اور اس کے بعد میں نے کبھی ان سے پوچھ گچھ نہیں کی۔ وہ سوئٹر انہوں نے خاندان کی ایک غریب عورت کو دیا تھا تاکہ وہ جہیز میں اپنی بیٹی کو دے سکے۔ اسی طرح ان کو جیب خرچ کے طور پر اپنے بیٹوں سے جو رقم ملتی تھی وہ خاموشی سے ادھر ادھر کر دیتی تھیں۔ اسلام آباد میں جہاں وہ چودہ پندرہ سال ہمارے ساتھ رہیں ان سے فیضیاب ہونے والوں میں ڈرائیور، مالی، خانساماں، دھوبی، جمعدار اور بچوں کے ٹیوٹر وغیرہ شامل تھے۔ اور کمال یہ ہے کہ کس کو کیا دیا اور کب دیا اس کی خبر نہ ہمیں ہوتی تھی اور نہ کسی اور کو۔ ان لوگوں کے علاوہ اماں جی کی ترجیحات کی فہرست میں مستحق عزیزوں اور رشتے داروں کے نام سب سے اوپر تھے۔ وہ پیسے، کپڑے، لتے اور چھوٹی موٹی دوسری چیزیں جمع کرتی رہتیں اور جب سال چھ مہینے میں کراچی کا پھیرا لگاتیں تو یہ سب مال اسباب ساتھ لے جاتیں۔ جہاں حاجت مندوں کی ایک بڑی تعداد اماں جی کی منتظر ہوتی۔ خود براہ راست لوگوں کو نوازنے کے علاوہ اپنی اولاد کو بھی ہمیشہ یہی ہدایت کرتیں۔ مثلاً کسی غریب عزیز کی بیٹی کی شادی ہو تو وہ ہم سارے بھائیوں کے لیے رقم مقرر کر دیتیں کہ کس کو کتنا دینا ہے، اس کے بعد مجال تھی جو کوئی ان کے حکم سے روگردانی کر سکے۔

دوسروں کی حاجت رسائی اور امداد صرف مالی معاونت تک محدود نہیں تھی۔ وہ لوگوں کے مختلف نوعیت کے مسائل حل کرانے کی کوششوں میں بھی مصروف رہتیں۔ میں نے

فرید نگر کی زندگی سے کہ جہاں اباجی اپنے ٹریننگ سکول میں سارے فیصلے کرنے کے مجاز تھے' اسلام آباد تک کہ جہاں میں ایک بڑی آرگنائزیشن کا سربراہ تھا' اماں جی کو بڑے خلوص سے یہ کام کرتے دیکھا۔ ضرورت مند لوگ' دفتری معاملات یہاں تک کہ اپنے گھریلو مسائل سے تعلق رکھنے والے معاملات بھی ان کے پاس لاتے اور وہ جہاں تک ممکن ہوتا ان کی سفارش کرتیں ان کی مشکلات کے حل کے لیے ہر طرح کی کوششیں کرتیں۔ وہ اس معاملہ میں بہت نرم دل تھیں' کسی کو تکلیف میں دیکھ کر بے حد فکر مند ہو جاتی تھیں۔ ایک بار ایسا ہوا اور یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں سندھ مسلم کالج کراچی میں زیر تعلیم تھا۔ میرے دوستوں میں ایک شخص تھا جس کا نام سید سعید حسن تھا' وہ اکثر شام کو مجھ سے ملنے آیا کرتا تھا۔ اماں جی اسے تھوڑا پہچانتی تھیں۔ سعید حسن اپنے بڑے بھائی اور بہنوں کے ساتھ مارٹن کوارٹرز میں ہمارے گھر سے تھوڑے فاصلے پر ایک کرایہ کے کمرے میں رہتا تھا۔ ایک دن کیا ہوا کہ برسات کے موسم میں جب اماں جی مارکیٹ سے سودا سلف خرید کر گھر واپس آرہی تھیں' انہوں نے ایک کوارٹر کے سامنے سعید حسن کے خاندان والوں کو کھلے آسمان کے نیچے بیٹھے دیکھا۔ ان لوگوں کے قریب ان کا سامان' صندوق' چارپائیاں اور کپڑوں کی گٹھلیاں بھی دھری تھیں۔ اماں جی چلتے چلتے رک گئیں اور ان سے دریافت کرنے لگیں کہ اس طوفانی موسم میں وہ لوگ اس طرح کیوں بیٹھے ہیں۔ انہیں بتایا گیا کہ مالک مکان نے ان سے کمرہ خالی کرالیا ہے اور فی الحال ان کے پاس کوئی اور ٹھکانا نہیں ہے۔ اسی عرصہ میں سعید حسن آگیا تو اماں جی پہچان گئیں اور بولیں تم وہی ہو نا جو آغا کے پاس آتے ہو؟ سعید نے جواب دیا جی میں اور آغا کالج میں ساتھ پڑھتے ہیں۔ سعید سے مکان سے بے دخلی کا حال سن کر اماں جی کی فیصلہ کرنے والی رگ پھڑک اٹھی اور انہوں نے سعید کو حکم دیا کہ تم سب لوگ یہ سامان اٹھاؤ اور میرے ساتھ چلو۔ سعید حسن کا سارا خاندان حیران و پریشان اماں جی کے ساتھ چل پڑا۔ گھر پہنچ کر انہوں نے میرے بڑے بھائی کے کوارٹر کا ایک کمرہ خالی کرایا اور سعید کے اہل خانہ کے لیے وہاں رہنے کا بندوبست کرادیا۔ دوپہر کے بعد میں گھر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سعید حسن شمیم بھائی کے برآمدے کی منڈیر پر بیٹھا سگریٹ پی رہا ہے۔ اس نے مجھے سارا واقعہ سنایا اور سناتے ہوئے سعید جیسا کھلنڈرا آدمی بھی آنسو ضبط نہ کرسکا۔ یہ وہی سعید حسن تھا جو کراچی یونیورسٹی کا مشہور سٹوڈنٹ لیڈر رہا اور پھر کئی برس محترمہ فاطمہ جناح کا پرائیویٹ سیکرٹری

رہا۔ سعید نے کرنل مجید ملک کی صاحبزادی بلم سے شادی کی اور لندن میں رہائش اختیار کی۔ اماں جی کے انتقال کے بعد جب وہ پہلی بار لندن سے کراچی آیا تو اس نے خاص طور پر اسلام آباد کا سفر کیا۔ صبح کی فلائٹ سے آیا۔ سارا دن میرے ساتھ رہا اور شام کو اماں جی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے بعد واپس کراچی چلا گیا۔

اماں جی بالکل بے پڑھی لکھی تھیں' انہیں صرف دستخط کرنے آتے تھے' مگر اس کے باوجود ان کو زبان اور کلام پر بڑا عبور حاصل تھا۔ وہ اپنی گفتگو میں اردو اور فارسی کے مشکل الفاظ بلا تکلف استعمال کرتیں تھیں اور محاورات اور ضرب الامثال سے تو اس قدر واقف تھیں کہ میٹرک تک اردو کورس کی قواعد کی کتابوں میں درج محاورے اور ضرب الامثال کے مطلب میں انہی سے پوچھا کرتا تھا۔ اماں جی کو کافی تعداد میں شعر بھی یاد تھے۔ عام طور پر محاوروں اور شعروں کا استعمال وہ اس وقت بڑی فراوانی سے کرتیں تھیں۔ جب کسی کو خط لکھواتیں تھیں ان کے خط سادگی اور عام بول چال کا نمونہ ہوتے تھے۔ پڑھنے والے کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اماں جی سامنے بیٹھی باتیں کر رہی ہیں۔ ان کا خط لکھوانے کا بھی خاص طریقہ تھا۔ لکھنے والے کو چارپائی پر اپنے پائیں تیانے بٹھالتیں اور خود بستر پر لیٹ کر آرام سے پان کھاتے ہوئے خط لکھاتی رہتیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد جو لکھا گیا ہوتا وہ سنتیں اور پھر آگے بولتیں' اگر لکھنے والے نے الفاظ ادھر ادھر کر دیے یا فقرہ بالکل اس طرح نہ لکھا جیسا انہوں نے بولا تھا تو ناپسندیدگی کا اظہار کرتیں اور پھر سے جملہ لکھواتیں۔ ان کے لکھائے ہوئے ایک خط کا کچھ حصہ کہیں سے مل گیا ہے جو انہوں نے اپنی بیٹی کو کسی جاننے والے کی دوسری شادی کے بارے میں لکھا تھا' انہوں نے اس کی اس حرکت پر اظہار ناراضگی کیا ہے۔ اس نمونے کو پڑھ کر ان کے طرز بیان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

"لو جی بابو اسماعیل نے دوسری شادی کر لی۔ بھلا کوئی اس میٹ گئے سے پوچھے ارے یہ بھی کوئی تیرے بیاہ رچانے کی عمر تھی وہ جو کہویں ہیں کہ بوڑھی گھوڑی لال لگام۔ اور کیسا دیدوں کا پانی مر گیا ہے اس کا۔ مجھے ملنے آیا تو کہنے لگا "اماں جی تم اپنی دلہن کو دیکھنے نہیں آئیں؟ میری جاوے جوتی۔ بس مجھے تو نفیسہ کا خیال آوے ہے۔ اس دکھیاری پر کیا بیت رہی ہو گی۔ سنا ہے جب سے یہ نئی والی آئی ہے وہ دکھیا تو اولوماری پنڈخ کی طرح اپنے کمرے میں پڑی رہوے ہے۔ سارے گھر پر بس اسی کا راج ہے۔ ہاں جی وہ جو مثل ہے جسے پیا چاہوے

وہی سہاگن۔ پر میں نے بھی اسماعیل کو ایسی کھری سنائیں کہ جیتے جی یاد رکھے گا۔ تم اس کے بڑے گن گاؤ تھی۔ بابو چچا یہ اور بابو چچا وہ۔ میں اسی لیے تمہیں لکھ رہی ہوں کہ تمہیں معلوم ہو تمہارے بابو چچا نے کیا گل کھلایا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ میرا تو اس سے کلام کرنے کو بھی دل نہیں چاہ وے۔ کیسی نیک اور فرماں بردار بیوی پر سوکن لایا ہے کم بخت۔ تم دیکھ لینا اس بے زبان کی ایسی آہ لگے گی کہ سب طرم خانی بھول جاوے گا۔"

اماں جی نے جس اسٹائل اور خوش سلیقگی سے زندگی گزاری' اسی انداز سے وہ اس دنیا سے رخصت بھی ہوئیں۔ وہ کہا کرتی تھیں میں تو اللہ سے یہی دعا کروں کہ چلتے ہاتھ پاؤں اٹھائے کسی کی محتاجی نہ ہو اور ہوا بھی ایسا ہی۔ چوراسی برس کی عمر پانے کے باوجود وہ آخری وقت تک کسی کی محتاج نہ ہوئیں۔ ان کے انتقال سے کچھ روز پہلے میں نے ڈاکٹر سے دریافت کیا کہ امی کو کیا بیماری ہے تو اس نے جواب دیا کہ انہیں کوئی بیماری نہیں ہے۔ صرف کمزوری بڑھتی جا رہی ہے اور اس کا تعلق کسی مرض سے نہیں عمر سے ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اماں جی کی بہتر صحت کا راز ان کی کم خوراکی میں مضمر ہے۔ جو آدمی ساری عمر ایک وقت کھانا کھائے اور چھوٹی بیماریوں کے لیے دوائیں استعمال کرتا رہے' اسے کوئی بڑا مرض لاحق ہونا مشکل ہے۔ حقیقت میں اماں جی کو دوائیں کھانے کا شوق اور کم کھانا کھانے کی عادت نے بڑی عمر میں بھی فٹ رکھا۔ وہ آخر تک بغیر کسی سہارے کے چلتی پھرتیں تھیں۔ نہ ان کی کمر جھکی نہ اٹھتے بیٹھتے ان کے منہ سے کبھی کراہ نکلی۔ وہ اپنی ہر چیز کا خیال رکھتی تھیں۔ جب دانتوں میں درد رہنے لگا تو طویل عرصہ انتظار کرنے کے بجائے خود ہی سارے دانت نکلوا کر مصنوعی بتیسی بنوالی۔ آنکھیں کمزور ہوئیں تو دور اور نزدیک کے علیحدہ علیحدہ چشمے خرید لیے۔ بالوں میں سفیدی آئی تو مہندی لگانے لگیں جلد کی حفاظت کے لیے کریم اور رات کو سونے کے لیے نیند کی گولی اور جنرل صحت کے لیے ٹونک اور وٹامن کے استعمال کو سارے دوا علاج پر ترجیح دیتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ چوراسی سال کی عمر کو پہنچ کر بھی نہ خود ان کو اور نہ ہم کو کبھی یہ احساس ہوا کہ اماں جی اتنی بوڑھی ہو چکی ہیں۔ ان کی سماعت ان کی بصارت' ان کی آواز' ان کی عام جسمانی حالت ہمیشہ نارمل آدمی کی طرح رہی۔

آخری بار کراچی گئیں تو رخصت ہوتے وقت خاندان والوں سے فرداً فرداً ملیں

اور سب سے یہی کہا ''بس اب ہم یہاں نہیں آویں گے، جس کو ملنا ہو ہم سے ملنے اسلام آباد آجاوے۔''

ان کی زندگی کے آخری لمحات بھی بڑے پر سکون تھے۔ مرنے سے چند دن پہلے مجھ سے کہا میں ڈاکٹر کے پاس جانا چاہتی ہوں۔ مجھے دفتر جا کر گاڑی بھجوادو۔ میں نے کہا' امی آپ کہاں ڈاکٹر کے پاس جاتی پھریں گی۔ ڈاکٹر کو یہیں بلوا لیتے ہیں۔ مگر وہ جب ایک بات ایک بار کہہ دیں تو پھر اس کو بدلنا بڑا مشکل ہوتا تھا۔ صفیہ نے کہا ٹھیک ہے آپ گاڑی بھجوادیں۔ میں امی کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ انہوں نے یہ بات بھی نہ مانی۔ گاڑی آئی تو ڈرائیور کے ساتھ اکیلی ڈاکٹر سے ملنے چلی گئیں۔ واپسی میں انہیں دیر ہوئی تو صفیہ کو تشویش ہوئی۔ اس نے ہمارے فیملی ڈاکٹر کو فون کیا اور دریافت کیا' ماں جی کو اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے؟ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ وہ تو بہت دیر ہوئی' مجھ سے مل کر جا بھی چکی ہیں۔ صفیہ نے پریشان ہو کر مجھے فون کیا۔ میں نے کہا کسی اور کو ملنے چلی گئی ہوں گی۔ تم فون کر کے نواب کے گھر والوں سے معلوم کرو۔ لیکن اماں جی وہاں بھی نہیں تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کہاں گئیں۔ ابھی ہم اسی شش و پنج میں تھے کہ وہ واپس لوٹ آئیں۔ ہم نے دریافت کیا کہ اتنی دیر کہاں ہو گئی' جبکہ ڈاکٹر صاحب کے ہاں سے تو آپ بہت پہلے فارغ ہو چکی تھیں۔ بولیں ''میں نے سوچا اب نکلی ہوں تو ذرا دانتوں والے ڈاکٹر کے بھی ہوتی چلوں۔ اوپر والے دانت ڈھیلے ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد میں آنکھوں والے ڈاکٹر کے پاس چلی گئی۔ میرا خیال ہے کہ میرا نمبر بدل گیا ہے اور نئے چشمے کی ضرورت ہے۔'' اب بھلا اس کا کیا جواب تھا۔ ہم ہنس کر خاموش ہو گئے۔ ہمارے فیملی ڈاکٹر کا خیال تھا کہ اماں جی کی یہی سوچ اور اعتماد ان کی سب سے بڑی ٹونک ہے۔ دنیا سے ان کے رشتے اتنے مضبوط تھے کہ انہیں یہ دنیا چھوڑنے کا کبھی خیال ہی نہیں آتا تھا اور یہی احساس انہیں بے مثال توانائی بخشتا تھا۔ مگر ڈاکٹروں سے ملاقات کا یہ ان کا آخری پھیرا تھا۔ اس کے بعد ان کی نقاہت بڑھتی گئی۔ وہ گھر سے نکلنے کے قابل نہ رہیں۔ ڈاکٹر صاحب ہر روز دوپہر کے بعد ان کو دیکھنے آتے۔ دیر تک ان کے پاس بیٹھتے۔ اماں جی کا اصرار تھا کہ انہیں گلوکوز کی بوتل لگا دی جائے تاکہ ان کی کمزوری کم ہو' مگر ڈاکٹر ایسا کرنے سے پہلے دوسری دواؤں کے ذریعہ ان کا بلڈ پریشر بڑھانا چاہتا تھا۔ روز بروز نقاہت بڑھتی گئی۔ آواز

ڈوبتی گئی۔ کھانا پینا ختم ہوتا گیا۔وہ آہستہ آہستہ ایک پھول کی طرح مرجھا رہی تھیں۔اپنے بستر پر بالکل خاموش لیٹی رہتیں۔ سرہانے رکھا ریڈیو چلتا رہتا۔شام ہوتے ہی اشارہ سے کسی کو ٹیلی ویژن آن کرنے کے لیے کہتیں۔بات کرتیں تو اتنی دھیمی آواز میں کہ ان کے منہ کے قریب کان لا کر سننا پڑتا۔ مرنے سے شاید دو روز پہلے میں حسب معمول صبح دفتر جانے سے پہلے ان کو ملنے گیا۔ صفیہ ان کے پاس بیٹھی پاؤں دبا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر زیر لب انہوں نے کچھ کہا۔ میں نے جھک کر سنا۔ وہ کہہ رہی تھیں ''اتر گیا کراچی میں اتر گیا'' میں نے شک بھری نظروں سے صفیہ کی طرف دیکھا کہ شاید اماں جی پر بے ہوشی کی کیفیت طاری ہو رہی ہے اور وہ بہکی بہکی باتیں کر رہی ہیں۔ میری تشویش کو دیکھ کر انہوں نے مزید کچھ کہنے کی کوشش کی مگر ضعف اتنا تھا کہ الفاظ ان کے منہ سے ادا نہیں ہو پا رہے تھے۔وہ آنکھیں موندے آہستہ آہستہ صرف ایک فقرہ دہراتی رہیں۔اتر گیا' کراچی میں اتر گیا۔ میں بڑا ملول اور پریشان دفتر کے لیے روانہ ہوا۔ میرا دل بوجھل تھا کہ اماں جی ذہنی طور پر نارمل نہیں ہیں لیکن دفتر جا کر مجھے اماں جی کے لفظوں کا مفہوم سمجھ میں آ گیا۔ مجھے بتایا گیا کہ کل صبح اغوا کیا جانے والا طیارہ ابھی چند گھنٹوں پہلے کراچی کے ایئرپورٹ پر اتار لیا گیا ہے اور یہ خبر ریڈیو کے صبح کے بلیٹن میں نشر ہو چکی تھی اور اماں جی حسب عادت مجھے ملک کی تازہ ترین خبروں سے آگاہ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ''اتر گیا' کراچی میں اتر گیا''۔وہ اپنی ڈیوٹی سرانجام دے رہی تھیں اور میں سمجھ بیٹھا وہ بہکی بہکی باتیں کر رہی ہیں۔

اس روز کے بعد سے اماں جی کی آواز بالکل بند ہو گئی۔ ہاتھ پاؤں برف کی طرح سرد رہنے لگے۔ وہ حرکت کرنے سے بھی معذور ہو گئیں۔ کبھی کبھی آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتیں مگر زیادہ دیر یہ بھی ممکن نہیں تھا۔ آپ ہی آپ آنکھیں پھر موند جاتیں۔ ہم سارے گھر والے باری باری ان کے پلنگ سے لگے بیٹھے رہتے۔ انہیں آوازیں دیتے' ہتھیلیاں سہلاتے' گال تھپتھپاتے' مگر اماں جی پر کسی چیز کا کوئی اثر ہی نہ ہوتا۔ بس کبھی کبھی آنکھیں کھول کر نا جانے کیا دیکھنے کی کوشش کرتیں۔ ہونٹ آہستہ آہستہ پھڑپھڑاتے جیسے کچھ کہنا چاہتی ہوں' مگر نقاہت کے باعث کچھ کہہ نہ پاتیں۔ اسی طرح دو دن گزر گئے۔

وہ جمعہ کا دن تھا۔ بقر عید بھی تھی۔ صبح سویرے صفیہ نے انہیں نیا لباس پہنایا۔ ہم سب عید کے کپڑے بدل کر ان کو سلام کرنے گئے۔ ان کا ہاتھ اٹھا کر اپنے اپنے سروں پر دھرتے رہے اور ان سے پیار کراتے رہے۔ محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ سب کچھ سمجھ رہی ہیں، لیکن بولنے سے مجبور ہیں۔ ان کی قوت گویائی جواب دے چکی تھی۔ عید کے دن ملنے والے آتے رہے۔ کچھ ہم سے مل کر رخصت ہوتے، کچھ جو اماں جی کو جانتے تھے ان سے ملنے اور ان کو دیکھنے ان کے کمرے میں جاتے۔ دوپہر کے بعد حسب معمول ڈاکٹر صاحب آئے۔ انہوں نے نبض دیکھ کر بلڈ پریشر چیک کیا اور اعلان کیا کہ اماں جی کی حالت پہلے سے بہتر ہے اور اب وہ اس قابل ہیں کہ کل صبح گلوکوز کی بوتل چڑھائی جا سکے۔ ہم سب کو ڈاکٹر صاحب کی باتوں سے ذرا اطمینان ہوا کہ اماں جی کی حالت سنبھل رہی ہے۔

میں سارا دن امی کے پاس ہی رہا تھا۔ شام ہونے کے بعد صفیہ نے اصرار کیا کہ میں ایک آدھ دوست کے ہاں عید ملنے چلا جاؤں۔ میں تیار ہو کر جانے سے پہلے اماں جی کے کمرے میں گیا۔ ان کے سرہانے نواب کا منجھلا بیٹا بیٹھا۔ آہستہ آہستہ ان کا سر دبا رہا تھا۔ سامنے کونے میں رکھا ٹیلی ویژن چل رہا تھا جس کی آواز بند تھی۔ اماں جی آنکھیں موندے خاموش لیٹی تھیں۔ میں دیر تک چپ کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔ ان کی رنگت زرد تھیں، ہونٹ نقاہت سے سفید پڑ گئے تھے، مہندی لگے سرخ بالوں کی ایک لٹ ماتھے پر ڈھلک آئی تھی اور ان کے چہرے پر ایک عجیب نورانی سا ہالہ تھا جو اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اب ان میں اتنی طاقت بھی نہیں رہی تھی کہ آنکھ کھول کر دیکھ سکیں۔ میں نے ان کے پاؤں چھوئے جو برف کی طرح سرد تھے۔ آہستہ آہستہ ان کو آوازیں دیں، مگر جیسے میری آواز ان تک پہنچ ہی نہیں رہی تھی۔ تھوڑی دیر خاموش کھڑے رہنے کے بعد میں نے پپو سے کہا، میں کچھ دیر کے لیے باہر جا رہا ہوں۔ تم یہیں رہنا، میں جانے کے لیے مڑا تو مجھے لگا جیسے کہیں بہت دور سے کوئی پکار رہا ہے "آغا رے او آغا" میں نے سوچا میرا وہم ہے، مگر اس سے پہلے کہ میں دروازے سے باہر نکلتا۔ پپو چلایا "آغا ماموں، اماں جی آپ کو بلا رہی ہیں۔ وہ بول رہی ہیں"۔ میں پلٹ کر ان کے بستر کی طرف لپکا۔ ان کی آنکھیں کھلی تھیں اور ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ ایک مرتی ہوئی ماں نے اپنی ساری

توانائیاں جمع کر کے اپنے چہیتے بیٹے کو آخری بار آواز دی تھی۔ اسے جانے سے روک لیا تھا تاکہ موت کی آخری ہچکی آئے تو وہ اس کے سامنے ہو۔ میں ان کے قریب بیٹھ گیا۔ انہیں تکتا رہا۔ کچھ دیر بعد ان کی سانس تیز ہو گئی۔ اور پھر میں نے روشنی کی ایک لہر دیکھی جو سانس کے ساتھ ہونٹوں کے درمیان سے نکلی اور نور کے اس ہالے میں مدغم ہو گئی جو آہستہ آہستہ فضا میں تحلیل ہو رہا تھا۔ اماں جی رخصت ہو گئیں۔

اگلے روز ہم نے انہیں اسلام آباد کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا۔ اس صدی کے پہلے سال میں، ضلع بجنور کے قصبے افضل گڑھ میں پیدا ہونے والی آج ایک ایسے شہر میں ابدی نیند سو رہی ہے، جس کا وجود بھی اس وقت نہیں تھا۔ زین العابدین خان کی بیٹی، ماسٹر علی احمد خان کی بیوی، میری امی اور ساری دنیا کی اماں جی

ان کا نام غفاری بیگم تھا۔
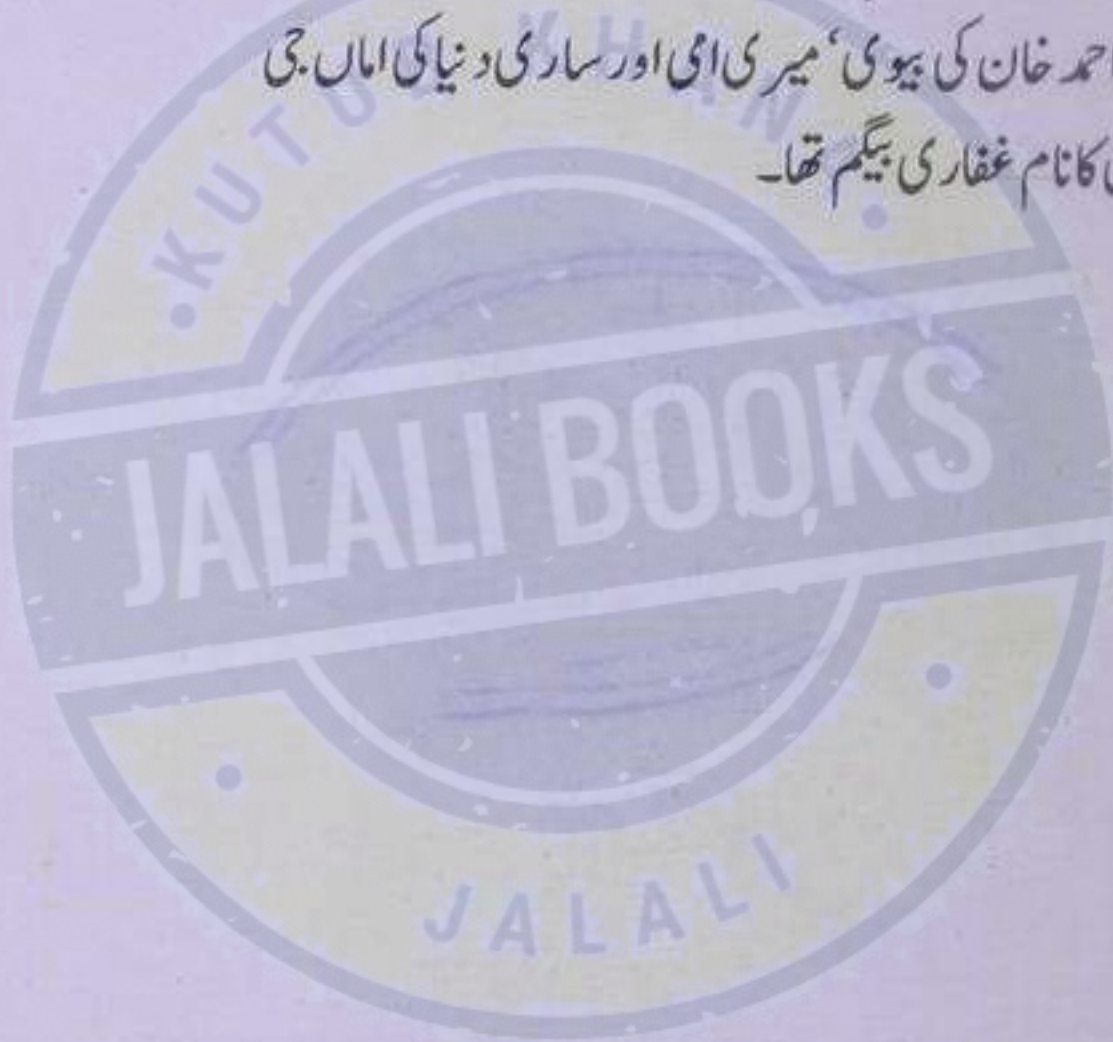
ٹی وی کے ایک معروف پروگرام کی اصطلاح میں آغا ناصر کی وجہ شہرت یا تو ریڈیو اور ٹی وی کے اداروں سے ان کی وابستگی رہی یا ان کے وہ ڈرامے جو ریڈیو اور ٹی وی پر نشر ہوتے رہے ہیں۔ اب انہوں نے شخصی خاکوں کا یہ مجموعہ مرتب کر کے اپنی وجہ شہرت میں اضافے کا ایک نیا عنوان مہیا کیا ہے۔ ان شخصی خاکوں کا موضوع زیادہ تر وہ اشخاص ہیں جو آغا ناصر کی منصبی زندگی کے دوران ان کو ملے جنہیں وہ اپنے محبوب گردانتے ہیں، چنانچہ ان خاکوں میں آغا ناصر نے ان کو بڑی محبت اور عقیدت سے یاد کیا ہے اور ان کی شخصیتوں کے بارے میں اپنے تاثرات کے نقوش کو بڑی خوبی سے ابھارا ہے۔ اس بیان میں ان سے منسوب لطائف و ظرائف بھی ہیں دلچسپ واقعات بھی اور فیض، ذوالفقار بخاری اور سلیم احمد کے خاکوں میں ان کے اشعار کا انتخاب بھی۔ ان سب خصوصیات اور آغا ناصر کے انداز تحریر کی بناء پر اس مجموعے میں اہل نظر ہی نہیں عام قاری کے لئے بھی دلچسپی کا وافر سامان موجود ہے۔ مجھے امید ہے کہ گم شدہ لوگوں کی یادوں پر مشتمل یہ مجموعہ شخصی خاکوں کی صنف ادب میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

ڈاکٹر آفتاب احمد

ب احمد

www.sang-e-meel.com

ISBN 969-35-1092-5
9 789693 510928